Late Fee	House Rent	Consy Tax	Maintenance charges and meter rent	Late Fee	Initial of Poster	Remarks

جنوری ۱۹۴۵ (سالنامہ)

۱/۱۰-۲۰

تازہ ترین ناول اور افسانے

پیش کردہ :- اُردو نشر گاہ دہلی

نوشابہ

اس ناول میں محترمہ رضیہ سلطانہ (بنت علی محمد صاحب سشن جج) نے ایک میاں فیملی کی دلکش داستان بیان کی ہے جس کا پس منظر سرزمین پنجاب ہے۔ وہی پنجاب جہاں زندگی ہنستی کھیلتی اور ناچتی گاتی گذر جاتی ہے۔
ایک تعلیمیافتہ گھرانا ہے جسکی عورتیں خوش مزاج، خوش پوشاک اور خوش گفتار ہیں اور مرد معزز، سمجھدار اور رنگیلے۔ اسی خاندان میں چچازاد بہنیں اور بھائی ہیں جو آپس میں ہنستے بولتے ہیں۔ انکی خوش آئند توقعات ہیں۔ انکا دماغ معصومیت کیساتھ پروان چڑھتا ہے مگر انکے والدین کچھ اور ہی چاہتے ہیں کہ ایک مفلس گھرانا ہے۔ بوڑھے مالی کی نئی نویلی اور شباب سے بھرپور بیوی جھلا کر کہتی ہے "دیکھ مراد جو تجھے چھوڑا۔" اور (۱) جیسے بیشمار واقعات کو سامنے رکھ کر مصنفہ نے ایک مکمل ناول ترتیب دیا ہے جو عشرت و غم کی دھوپ چھاؤں سے لبریز ہے "نوشابہ" اردو کا جدید ترین ترقی پسند ناولٹ ہے جسے ایکبار پڑھکر سیری نہیں ہوتی۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ کتابت، طباعت خوبصورت مضبوط جلد اور خوشنما گردپوش سے آراستہ قیمت عمر

اُردو کا غیر فانی ناول	عشق و ہوس کی داستان	دُنیا کا عجیب ترین ناول
شاہدِ رعنا	**قمر جہاں**	**پھانسی**
ایک طوائف کی رنگین و پُر فریب زندگی کسقدر عبرتناک ہوتی ہے یہ قاری سرفراز حسین مرحوم دہلوی کے قلم سے سنئے "شاہد رعنا" کو ہندوستانی ادب میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو یورپین ادب میں Yama the Pit کو۔ اسے پڑھکر آپکو بہت سی نئی باتیں معلوم ہونگی۔ مجلد معہ سرورق قیمت سے	ایک سجادہ نشین کی آوارگی اور ہوسناکی جوانی گذر نیکے بعد بھی قائم رہی۔ یہانتک کہ انھوں نے خود اپنی بیوی کو اپنے ہرجائی پن پر بھینٹ چڑھا دیا۔ مجلد مع گردپوش عمر	آندلیف کی معرکہ آرا تصنیف۔ عشق حسن و الدین کی محبت۔ اولاد کی چاہت۔ دوستی۔ دشمنی۔ بغاوت۔ مُجرم عورتیں مرد۔ یہ سب ساکا ناچ دیکھکر کس طرح لرز اٹھے۔ دہشت ہیبت کے ایسے خوفناک مطالعے آج تک کسی مصنف نے پیش نہیں کئے۔ مجلد قیمت عہ

سفینے

ایشیا اور یورپ کے ولولہ انگیز رومانوں اور ترقی پسند افسانوں کا ہمہ گیر انتخاب اور ترجمہ از صادق الخیری ایم اے۔ بڑا سائز مجلد مع گردپوش قیمت سے

بلقیس	شمع انجمن	شمع فروزاں	زہراب
صادق الخیری کے تازہ ترین افسانے مجلد مع سرورق عہ	صادق الخیری کے خیال افروز افسانے دوسرا ایڈیشن عہ	چینی ناولٹ مصنفہ پرل بک۔ مترجمہ صادق الخیری۔ عہ	یونان کا تلخ و شیریں ناولٹ مترجمہ محمود احمد خاں ایم اے عہ

دوشیزۂ صحرا
عرب کی ستارہ جبین لیکن سحر حسینہ کی داستان عشق دوسرا ایڈیشن عہ

ملنے کا پتہ:-
خاتون کتاب گھر، اُردو بازار (۶۰۴) دہلی

نیز اُردو کی ہر کتاب
خواہ وہ کہیں چھپی ہو، ہم سے منگا لیجئے۔

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری
فضل حق قریشی دہلوی

جرعات

چندہ
سالانہ چھ روپے
ششماہی تین روپے آٹھ آنہ
فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ

جلد ۳ | ساقی سالنامہ دہلی - بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۵ء | نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

۱۹۴۳ء اپنی تمام اقتصادی دشواریوں کے ساتھ رخصت ہوا۔ چور بازاروں نے وہ زور پکڑا کہ پبلک کے ساتھ حکومت بھی پریشان ہوگئی۔ جس چیز پر کنٹرول ہوا وہی بازار میں سے غائب ہوگئی۔ اس کے بعد راشننگ کی اسکیم عمل میں آئی اور ضرورت کی بعض چیزیں حصہ رسد سب کو ملنے لگیں۔ روٹی کی طرف سے ملک ایک حد تک مطمئن ہوگیا۔ تن ڈھانکنے کو کچھ کپڑا بھی ملنے لگا۔ بے اطمینانی اور بدامنی کا جو اندیشہ تھا وہ جاتا رہا۔ کاغذ کا کال بدستور رہا اور اسے رفع کرنے کی کوئی اسکیم اب تک وضع نہیں ہوئی۔ حکومت نے ایک حل اس کا یہ نکالا ہے کہ جتنا کاغذ کسی پبلشر نے ۱۹۴۲ء میں صرف کیا ہے اُس کا تیس فی صدی آئندہ صرف کرے، یعنی تہائی سے بھی کم۔ مگر اربابِ حل و عقد نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہندوستان کے ہزاروں پبلشر بھی انسان ہی ہیں اور اُن کی کل ضروریات بھی اور انسانوں کی سی ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں اگر وہ تین روٹیاں کھاتا تھا تو اب بھی وہ تین روٹیاں ہی کھائیگا، ایک روٹی کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی پبلشر کے تین بچے اسکول یا کالج میں پڑھتے ہیں تو آئندہ اُس کے دو بچے تعلیم سے بالکل محروم کر دئے جائیں۔ غرض حکومت نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے کہ پبلشر ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ۱/۳ انسان ہوتا ہے۔ نہ صرف پبلشر بلکہ اُس کے جملہ وابستگان کو بھی اسی زمرے میں شمار کئے گئے ہیں۔ کاغذ کی بچت کے اس انوکھے قانون کی لپیٹ میں ہندوستان کے کئی لاکھ انسان آگئے ہیں۔ اور یہ وہ انسان ہیں جنھوں نے علم کی روشنی ملک میں پھیلائی ہے اور ادب کی خدمت میں اپنی عمرِ عزیز صرف کی ہے۔ ہندوستانی قوموں کی بیداری انہی کی مرہونِ منت ہے۔ اب پبلشروں کی حالت یہ ہے کہ جو کچھ پچھلا اسٹاک تھا وہ سب بک گیا اور آئندہ شائع کرنے کے لئے انہیں کاغذ نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے کاروبار سسک رہے ہیں۔ اور اگر یہی حالات رہے تو انہیں بھی سسکنا پڑے گا۔ اسکول کے بچوں کو کتابیں نہیں ملتیں، کاپیاں نہیں ملتیں۔ سلیٹوں پر کام ہو رہا ہے اور سنا ہے کہ بھوج پتر پر بھی بعض علاقوں میں کام آرہا ہے۔ ان تمام دشواریوں کا حل حکومت کے پاس یہ ہے کہ ۱/۲ یا بعض خاص صورتوں میں ۱/۳ کاغذ صرف کرو۔ اور یہ مقدار کہاں سے حاصل کی جائے؟ اس کا جواب بھی حکومت کے پاس نہیں ہے۔ ۱۲ جون ۱۹۴۴ء سے آج ۱۲ جنوری ۱۹۴۵ء تک یعنی سات مہینے ہوگئے اور اب تک یہ ۱/۲ مقدار کی اسکیم حکومت کے زیر غور ہے کہ کس طرح اس پر عمل کیا جائے۔ مرکزی حکومت نے چھ مہینے اس پر غور کرنے کے بعد اس مسئلہ کو صوبائی حکومتوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس پر مزید غور کریں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ چنانچہ آجکل صوبائی حکومتیں اس پر غور کئے جا رہی ہیں۔ کتنے ہی پبلشروں نے اپنے کاروبار ختم ہو جانے پر ملازمتیں کرلیں یا اور کوئی دھندا پھیلا لیا۔ جو باقی بچے ہیں اُن میں سے سب منتظر ہیں کہ دیکھئے اس حیرتناک غور و فکر کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور ۱/۲ ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں اور کیا کرنا چاہئے۔ حکومت کی مجبوریوں کا احساس سب کو ہے لیکن کیا پبلشروں کی مشکل کشائی صرف ۷۰ فی صدی تخفیف کے قانون ہی سے ممکن ہے؟

سفید کاغذ کی اس نایابی کے زمانے میں ادبی رسائل کے لئے اخباری کاغذ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہوگیا۔ غنیمت ہے کہ حکومت نے اس نازک وقت پر دستگیری کی اور ہمارے رسالوں کو موت سے بچا لیا۔ جنوری سے حکومت نے اس کاغذ کی ماہانہ مقدار میں ذرا اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم آج آپکی خدمت میں ساقی کا سالنامہ پیش کر رہے ہیں۔ ساقی کے اس میلے کاغذ کو نہ دیکھئے، اسکے مضامینِ نظم و نثر کو دیکھئے۔ اسکے تنقیدی مضامین کو دیکھئے جو بہت غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اسکے ڈرامے اور افسانے پڑھئے جو طرزِ جدید کے حامل ہیں۔ اسکی نظمیں ملاحظہ فرمائیے جو نئی شاعری کی آئینہ دار ہیں۔ نئی غزل کے عمدہ نمونے بھی آپ کو اس پرچے میں ملیں گے۔

غرض ادبِ جدید کے جملہ اصناف پر ساقی کے سالنامے کو آپ حاوی پائیں گے۔ اس سال ساقی میں آپ نمایاں ترقی دیکھیں گے کیونکہ عسکری صاحب کے ساتھ ادارۂ ساقی میں فضل حق قریشی دہلوی بھی شریک ہوگئے ہیں۔

شاہد احمد

جھلکیاں

ہمارے رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟"

"چلو، یار ماں کی قسم بتاؤ۔"

"کہ وہ منفرد بھار رہے۔"

سچ ۔ یہ سوچتے سوچتے کہ آپ کیا لکھ رہے مضمون کے لیے کوئی ایسی ترتیب جس سوجھی جس کی مدد سے پڑھنے والوں کی ہمدردی مجھے فوراً حاصل ہو جائے ۔ اپنے حوش کو بھی مجھے لگام دینی پڑی کیونکہ ۔ فقرہ میرے منہ سے ایسے نقرے نکلوا ما جس سے لوگ اور بھڑک جاتے ۔ اس لئے سب سے معقول تکنیک میرے لئے بے اعتنائی و بے پروائی رہے گی

ذکر کر ما ہے مجھے اشرف صبوحی صاحب کی نئی کتاب "دہلی کی چند عجیب ہستیاں" کا ۔ ایک طرح اس وقت میرے ذہن میں صبوحی صاحب کی اور تصانیف بھی ہیں، دراصل صبوحی صاحب کا ذکر چھیڑنے سے پہلے مجھے تین مضمونوں میں اس کے لیے زمین تیار کرنی چاہیئے تھی پہلا مضمون تو ہوتا اُس زبان اور اسلوب بیان کے متعلق جس کا ادب تقاضہ کرتا ہے دوسرے مضمون میں یہ "اُردو نثر کی صبح نو" کا جائزہ ہوتا (یہ مضمون لکھنے کے بعد مجھے بقول شخصے سر پر لوا باندھ کر باہر نکلنا پڑ رہا) تیسرے مضمون میں اُردو شعرا اور ادیبوں کی ضروریات سمجھنے کی کوشش کی جاتی پھر کہیں جا کر اشرف صبوحی صاحب کا نمبر آنا چاہیئے تھا۔ لیکن میں کو توا بنیاد بننے والی دوا کی ایجاد سے پہلے میں یہ تین قسطیں لکھنے پر تیار نہیں ہوں۔

ابھی تک میں نے کوئی جوشیلا فقرہ استعمال نہیں کیا، لیکن آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں اشرف صبوحی صاحب کے بارے میں پُرجوش ضرور ہوں۔ آپ تعجب کر رہے ہونگے کہ آخر کیوں ؟ مجھے رنج ہے کہ میں اُن کے متعلق اس انداز سے باتیں کرنے پر کیوں مجبور ہوں جیسے میں نے انہیں دریافت کیا ہو۔ اور کچھ نہیں تو مجھ سے دس سال پہلے سے تو وہ لکھ ہی رہے ہونگے، اور مجھے یقین ہے کہ دس سال تک میں اُن کے برابر نہیں لکھ سکتا۔ (اس بات کو میرا انکسار سمجھ کر ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے) پھر بھی میں اس انداز سے باتیں کرنے پر مجبور ہوں جیسے میں نے انہیں دریافت کیا ہو۔ کیوں ؟ اگر آپ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی ایمانداری سے کوشش کریں گے تو یہ ادبی ماحول کا نظارہ دیکھ کر آپ کو کوئی خوشی نہیں ہو گی۔

اب وہ اُدبروالی تکنیک استعمال کرنے کا وقت آ گیا۔ اب میں صبوحی صاحب کے متعلق چند ضروری باتیں گنواتا ہوں۔ آپ کے بہت سے سوالوں کا جواب انہیں مل جائیگا۔ (۱) صبوحی صاحب "جنتا" کی زبان نہیں لکھتے، کیونکہ جنتا ایسے نہیں بولتی نہ اُردو نثر لکھتے وقت انہیں سرانڈیل اور نکارا گوا کے مترجمین کی آسانی کا خیال رہتا ہے (۲) اس کتاب میں ایک بھی پندرہ سال کا ایسا لڑکا نہیں جس کی رانوں میں کھُلی اُٹھتی ہو۔ اور نہ کوئی ایسی لڑکی جو "بیانگ دُہل" اپنی جوانی کا اعلان کرتی رہتی ہو۔ یوں تو اُس کی دلّی میں ایک سے ایک حال مست اور کھال مست پڑا ہے، لیکن تہمد سنبھالتا ہوا اُس کے پیچھے کوئی بھی نہیں گیا۔ (۳) اُن کے مٹھو، گھمّی، کلن، وغیرہ بڑے ٹھوس مادے سے ہے ہیں، لیکن جدلیاتی مادّیت اور "واحد معاشی مفاد" کا ابھار اُن میں نہیں پیدا کیا گیا اُن کے کئی کردار ایسے ہیں جو (اتفاقاً یا کردار آ ۔) بالکل مفلس ہیں، لیکن صبوحی صاحب نے مفلسی کو کردار کہیں بھی نہیں بنایا (۴) اگر آپ ستالو کے تماشوں کا شوق ہو تو یہ مجھ سے براہِ راست معلوم کر لیجئے گا؛ یہاں تو آپ کو زندہ انسانوں کی زندہ انسانیت ملے گی۔ جنسی، معاشی، مذہبی، سماجی، آفاقی اصولوں کی لیسٹ میں اُن کا ایک کردار بھی نہیں آیا۔ (۵) عجیب مجبوری ہے کہ یہ کتاب دلّی کے بارے میں ہے اُس دلّی کے بارے میں جہاں کبھی بنگالیوں سے عبارتوں کے بحر کی بحر میں e Internationale کا اُردو ترجمہ گانا شروع نہیں کیا تھا نہ یہ کتاب اُس دُنیا سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے جب سماج طبقاتی برتری کے اُصول پر قائم تھی، یہاں تک کہ بادشاہ کو ظلِّ سبحانی سمجھا جاتا تھا۔ اور گھمّی کبابی بھی اپنے آپ کو بادشاہ سے اِدھر نہیں سمجھتا تھا!

یہ پانچ باتیں ایسے ہیں جنھیں گھونسے مار مار کے بھی نئی نسل کے حلق سے نیچے نہیں اُتارا جا سکتا۔ صبوحی صاحب کے پوری داد نہ پا سکنے کی وجہ بعض حضرات (خصوصاً نئے ادب کے مخالفین) کے نزدیک یہ ہو سکتی ہے کہ چند نوجوانوں نے ایک دوسرے کو "حاجی" مشہور کرنے کے لئے آپس میں سازش کر لی ہے، اُنکی چالاکی سے رسالے بھی اُنکے قبضہ میں آ گئے

ہیں جو دن رات اُن کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ چنانچہ اس گروہ سے باہر کا اگر کوئی آدمی ہو تو اُس کی کوئی سنتا ہی نہیں۔ اگر معاملہ اتنا سیدھا سادا ہوتا تو لمبی چوڑی تمہیدیں باندھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نئی نسل کی واقعی کچھ مجبوریاں اور معذوریاں ہیں ایک حد تک ان مجبوریوں کا علاج خود مجبوروں کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن ان کے خارجی اسباب اتنے حقیر نہیں ہیں کہ انھیں بُھلا دیا جائے۔ اسی وجہ سے بعض وقت تو نئی نسل کی کوتاہیوں پر غصے کے بجائے پیار آنے لگتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ بوکھلاہٹ ہمارے ادبی ماحول کا لازمی حصہ بن گئی ہے۔ چند مسئلوں نے ہماری نوجوان نسل کو اپنے اندر ایسا جذب کیا ہے کہ اُن کی ذہنی دُنیا میں توازن باقی نہیں رہا۔ مانا کہ یہ مسئلے ہماری زندگی کے اہم ترین مسئلے ہیں لیکن ہم یہ بھول گئے ہیں کہ زندگی کے مقابلے میں یہ مسئلے پھر بھی محدود ہیں۔ ان سے باہر بھی ایک دُنیا کی دُنیا بسی ہے۔ جہاں تک ان مسئلوں سے باہر کی زندگی کا تعلق ہے ہم نے اپنے دماغ کو ماؤف کر لیا ہے، کون ایسا تعلیم یافتہ نوجوان ہے جس کے وردِ زبان کا ڈول کی کتاب ––– Disillusion & Frustration کا نام نہ ہو سکا۔ اصلیت اور "حقیقت" کی ماہیت کے متعلق اتنی لمبی چوڑی گفتگوؤں نے ہماری نظروں سے یہ سیدھی سادی حقیقت چھپا دی ہے کہ اصلیت محض ایک معاشی، سیاسی، جنسی یا نفسیاتی نظریے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ان گنت رنگ ہیں جن کا احاطہ ہماری من گھڑت تعبیریں اور تفسیریں کبھی نہیں کر سکتیں۔ جوش کو تو میں نے شروع ہی میں طلاق دیدی ہے، ورنہ شاید میں یہ کہتا کہ اصلیت کوئی چیز نہیں ہوتی ہاں اصلیتیں البتہ ہوتی ہیں۔ جو اصلیت میرے تجربے میں آتی ہے مجھے حق ہے کہ اُسکا احترام اور اُس سے محبت کروں۔ لیکن دوسروں کے تجربے میں جو اصلیتیں آتی ہیں اُنکے وجود سے انکار کرنا میرے نزدیک تو ذہنی بیماری ہے ––– Dementia Praecox کی ایک قسم۔ دو آدمی ہماری نئی نسل کو روگ کی طرح لگے ہیں ایک تو مارکس دوسرے فرائڈ۔ ان دو آدمیوں کی اہمیت سے جو انکار کرے وہ کافر۔ اپنے اپنے دائرے میں وہ بہت سی کام کی باتیں بتاتے ہیں۔ سب سے زیادہ کام کی بات یہ کہ مختلف اصلیتیں ایک دوسرے سے کیا علاقہ رکھتی ہیں۔ اور کس طرح ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہتی ہیں۔ ان مختلف اصلیتوں سے جو عظیم اصلیت بنتی ہے یا کم سے کم جیسے بنتا ہوا دیکھنے پر انسانی ذہن مجبور ہے اُس کا دھندلا سا اور

یک رُخا عکس ان دونوں کے نظریے ہیں۔ لیکن عکس کو اصل سے زیادہ ٹھوس سمجھنا، بلکہ اِسے وحدہٗ لاشریک لہٗ جاننا ––– اس کے لئے ذہنی بے بسی، دماغی تھکن، سہل اندیشی، ان میں سے کوئی نام چھانٹ لیجئے۔ ایک اور کارآمد تشبیہ میرے ذہن میں آتی ہے۔ مختلف اصلیتوں کو شہر فرض کیجئے جنھیں ہم مادی سطح پر ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ سمجھتے تھے۔ مارکس اور فرائڈ نے ہمیں دکھایا کہ اُن کے درمیان پُل بھی ہیں۔ اب یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ ہمیں بس ایک پُل ہی پُل نظر آتا ہے، شیطان کی آنت کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والا۔ ہم نے جو اس ازلی اور ابدی، لم یلد و لم یولد پُل کا تصور باندھ رکھا ہے: بہت ممکن ہے یہ ہمیں ایک نئی اصلیت تک پہنچنے میں مدد دے۔ نئی دُنیا کے ترکستان جانا ہو تو شاید اس پُل پر سے گزرے بغیر چارہ نہ ہو لیکن ادب کا کعبہ اُنھیں تتر بتر شہروں میں ملیگا۔ آپ اپنے لئے ایک چیز پسند کر سکتے ہیں نظریہ یا ادب۔ ہمیں چونکہ نظریوں سے زیادہ محبت ہے، اس لئے جب اشرف صبوحی کے مضامین کی قسم کا ادب ہمارے سامنے آتا ہے تو ہمارے اعصاب اُسی طرح گنگ رہتے ہیں۔ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ وہی افسانہ اچھا ہے جس میں اصلیت ہو اور اصلیت صرف وہ ہو جو ہم محسوس کرتے ہیں، مثلاً جنسی قلق، معاشی بے اطمینانی، تھوڑی بہت سیاسی اُلجھن، مایوسی، شکستگی، بیزاری اور ایسے ہی الم غلم۔

اشرف صبوحی کے اِن مضامین یا اور افسانوں میں جو روح اور اصلیت پائی جاتی ہے وہ ان سب سے الگ ہے یہ روح یو پی اور دہلی کے علاقے میں مسلمانوں کی صدیوں کی زندگی کے نشو ونما کا نتیجہ ہے۔ یہ روح بالکل انوکھی ہے، اس کا رنگ سب سے الگ ہے۔ یہ روح صرف اِسی خطے میں، صرف ان ہی جغرافیائی، تاریخی، معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کے ماتحت پیدا ہو سکتی تھی۔ اور ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد جب تک وہ عوام کے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے اُس کا مٹنا آسان نہیں ہے۔ یہ روح نہ مُردہ ہے نہ پُرانی پڑی ہے جیسا ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے رہے ہیں بلکہ یہ اتنی ہی نئی ہے جتنا آج کا دن۔ یہ اصلیت اتنی ہی ٹھوس ہے جتنی جنسی بھوک۔ اگر متوسط طبقے کی نئی نسل کے دو چار یا سارے کے سارے آدمیوں کی قوتِ احساس بعض حیثیتوں سے کُند ہو گئی ہے تو اس سے یہ اصلیت مر نہیں گئی۔ بلکہ جن آدمیوں سے ہم کندھے رگڑتے ہوئے چلتے ہیں، بازار کے نائی، حلوائی، سقّے، دھوبی، ہماری مائیں بہنیں، سب کے شعور میں یہ اصلیت جیتی جاگتی موجود ہے اور

اُس وقت تک رہے گی جب تک ہماری طبیعتوں کی مُردنی ان سب لوگوں پر بھی نہ چھا جائے۔ اس لئے ہم اشرف صبوحی کی تحریروں کو بے وقت کی راگنی کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ اس علاقے کے ایک عام مسلمان کے شعور میں اصلیت کی کیا شکل ہے، اُس کے مزاج میں کیا کیا نسیں ہوتی ہیں، اُس کی حسیاتی زندگی کا رنگ روپ کیا ہے ——— تو ان سب کا عکس آپ کو صبوحی صاحب کے مضمونوں میں ملے گا۔

سب سے پہلا احساس جو ان کے مضمون اور افسانے پڑھ کر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک فرد کی محدود انفرادیت کا اظہار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایک جماعت کی طرف سے بول رہے ہیں ان کا رشتہ جمہور سے نہیں ٹوٹا ہے، ان کی اور عوام کی حسیاتی زندگی میں بڑی یگانگت ہے۔ اور ان کی تحریر اس یگانگت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ انہیں اپنی جماعت کے جمہور پر یقین ہے اور وہ جمہور کے ساتھ مل کر اپنی جماعت کی زندگی سے لطف لے سکتے ہیں۔ یہ اس زمانے میں بڑی بات ہے۔ چونکہ اُن کی اپنی جماعت سے لڑائی نہیں ہے، غالباً اسی لئے اُن میں کردار کا احساس اکثر نئے لکھنے والوں سے زیادہ ہے۔ بہت سے نئے لکھنے والے اس خیال میں گُم ہیں کہ افسانے میں طبقاتی کشمکش یا فرائڈ کے کسی مُرکب کا ذکر آ جائے تو بس پھر کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کے نزدیک تو کردار نگاری افسانہ نگاری کا کام نہیں، چڑی مار کا ہے۔ بہرحال اس وقت ذکر اشرف صبوحی کا ہے اُن کے نزدیک انسان نظریاتی مفروضے نہیں ہیں، بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوئے، زندہ، سانس لیتے ہوئے آدمی حالانکہ اُن کے کردار بہت سے نئے افسانوں کے کرداروں سے زیادہ جماعتی زندگی اور جماعتی خصوصیات کے حصہ دار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی اُن میں انفرادیت اور شخصیت کا احساس شدید تر ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اگر افسانہ نگاروں کی ایک نسل کی نسل عجیب و غریب اور انوکھے کردار برتنے کے پھیر میں پڑ جائے تو تھوڑے دن بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سب کے کردار ایک سے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر واقعہ کو کردار کا قائم مقام سمجھ لیا جائے تو پھر تو کہنے ہی کیا ہیں۔ شاید دیوانوں میں تنوع کا امکان بہت کم ہے شاید دیوانے کے کردار میں عموماً چونکانے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی، کیونکہ دیوانے سے آپ ہر چیز کی توقع کر سکتے ہیں۔ چونکیں گے تو آپ صرف اُسی وقت جب ایک عام اور معمولی آدمی کو غیر متوقع باتیں کرتے دیکھیں گے۔ اسی وجہ سے صبوحی صاحب کے کرداروں میں تازگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب دلی کے بارے میں ہے۔ دلی کے متعلق لکھنے والے ایک بات میں بہت بدنام ہیں کہ وہ روتے بہت زیادہ ہیں۔ یہ بات اچھی ہے یا بُری اِس سے فی الحال مجھے مطلب نہیں۔ میں صرف اشرف صبوحی کا فرق دوسروں سے دکھانا چاہتا ہوں۔ دلی کے متعلق لکھنے والے زیادہ توجہ لال قلعے پر صرف کرتے ہیں۔ وہ مغلیہ سلطنت کو روتے ہیں، بادشاہی جلوسوں اور شان و شوکت کو روتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں رونا نہیں چاہیئے لیکن بہرحال یہ جو کچھ ہوا وہ ایک تاریخی عمل تھا۔ جلوس دلچسپ چیز ہے، لیکن اس کا مزہ کتنی دیر کا؟ اشرف صبوحی صاحب نے ایک زیادہ مستقل اور اہم عنصر کی طرف توجہ کی ہے جو بادشاہیاں اور سلطنتیں گر جانے کے بعد بھی جلدی اور آسانی سے نہیں مرتا۔ یعنی کسی مخصوص سیاسی اور معاشی نظام نے عوام کی طبیعتوں پر کیا اثر ڈالا ہے، اُن کے مزاج میں کیا خصوصیتیں پیدا کی ہیں، زندگی کی فضا کو کس رنگ میں رنگا ہے۔ یہ چیز تخت و تاج کے ساتھ مٹنے والی نہیں ہوتی، بلکہ بڑی بڑی مشکلوں سے اس کے نشان دُور ہوتے ہیں۔ یہی چیز اِس کتاب میں سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ یہ اُس دلی کے بارے میں ہے جو لال قلعہ کے ساتھ اُجڑ نہیں گئی، بلکہ اب بھی زندہ ہے ——— اپنی بہترین شکل میں نہ سہی۔ صرف دلی کے دس پانچ میل کے رقبے ہی میں زندہ نہیں ہے، بلکہ دلی سے چار سو میل کے فاصلے پر بھی سانس لے رہی ہے۔ اِس کتاب کا رُخ محلوں کی طرف نہیں ہے بلکہ گلیوں اور بازاروں کی طرف۔ صبوحی صاحب کی دلچسپیاں سراسر جمہوری ہیں۔ بلکہ دلی کی تہذیب کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ وہ جمہور کے دلوں سے بہت قریب تھی اور اس بات کی بہترین شہادت یہ کتاب ہے۔ صبوحی صاحب کی تحریروں کی قوت کا راز اسی رچی ہوئی جمہوریت میں ہے۔ لال قلعہ کے اُجڑنے سے زیادہ رنج انھیں اس بات کا ہے کہ دلی میں گھمی جیسے کبابی نہیں رہے جو پیسے والے کو کباب پہلے دیتے تھے اور دھیلے والے کو بعد میں۔

یہ تو رہا کتاب کے موضوع کے متعلق۔ جہاں تک نثر لکھنے کا تعلق ہے اِس وقت زندوں میں مجھے کوئی ایسا نام نہیں یاد آ رہا جو اُن سے بہتر اُردو نثر لکھ سکتا ہو۔ میرا مطلب اُس نثر سے ہے

جو تحمل کی زبان ہوتی ہے۔ بفرض محال اگر اُن میں کوئی اور بات نہ بھی ہوتی تو یہی چیز انھیں ایک ممتاز جگہ دینے کے لئے کافی تھی۔ کیونکہ یہ تو وہ زمانہ ہے جب لوگ چار صحیح جملے لکھنا سیکھنے سے پہلے ادیب ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ بڑی دلچسپ چیز ہوگی، کسی دن آزما کر دیکھئے عصمت چغتائی کو تو الگ کر دیجئے، اور ایک غلام عباس کے افسانے "آنندی" کو، اس کے بعد سارے نئے افسانوی ادب میں سے ایک ایک صفحہ ایسا چھانٹئے جسے اس ذخیرے سے باہر نکال کر اچھی نثر کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ میں نے ابھی یہ عمل کر کے نہیں دیکھا، لیکن میری دعا یہی ہے کہ خدا کرے میرے شبہات جھوٹے ثابت ہوں۔ ہمارے یہاں یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے کہ اگر آپ کے پاس کوئی جذبہ ہے تو بس کافی ہے اسے کم سے کم حساب سکل میں پیش کر دیجئے، وہ ادب ہو جائے گا۔ اور سب سے عام جذبہ ہے جنسی۔ اسلئے پڑھنے والے بھی آسانی سے بہل جاتے ہیں۔ چنانچہ شاہکاروں کی اُردو میں وہ بہتات ہے کہ روز نئے دروازے کھلتے ہیں، روز نئے سنگ میل قائم ہوتے ہیں۔ جنسی چیزوں سے تو پڑھنے والوں کو پہلے ہی دلچسپی ہوتی ہے افسانہ نگار کو دلچسپی پیدا کرنے کیلئے کاوش کرنی ہی نہیں پڑتی بس تانے باجے اور راگ بوجھا۔ لیکن جب ایسی چیزوں کا بیان کرنا پڑ جائے جن سے بظاہر پڑھنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں، اُس وقت کھلتی ہے حقیقت آسماں چھونے والوں کی۔ یہی امتحان ہے لکھنے والے کا۔ یہاں میں اشرف صبوحی صاحب کی چند سطریں نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کتاب میں سب سے زیادہ جو مضمون پسند ہے وہ ہے "مٹھو بھٹیارا"۔ اس کردار میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جو اسے دیکھنے میں نہ آتی ہو۔ چنانچہ موضوع میں بذاتِ خود دلچسپ بننے کی زیادہ صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن ایسے موضوع کو بھی انتہائی دلچسپ بنا دینا صرف ایسے ہی آدمی کا کام ہو جو اسلوبِ بیان اور زبان کا مالک ہو۔ جو سطریں میں نقل کر رہا ہوں اُن میں بھٹیارے کو دکان کھولتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مٹھو دکان کھولنے کا کوئی نرالا اور انوکھا طریقہ استعمال نہیں کرتا۔ جتنے بھٹیارے دنیا میں باقی ہیں وہ اسی طرح دکان کھولتے رہیں گے۔ لیکن غور سے دیکھئے اس چھوٹی سی بات کے بیان میں صبوحی صاحب نے کیا شگفتگی پیدا کی ہے۔ اس حصّہ کو سب سے زیادہ نثر کی حیثیت سے جانچئے۔ "سُنئے جاڑے گرمی، برسات محلے بھر میں سب سے پہلے میاں مٹھو کی دکان کھلتی۔ منہ اندھیرے بغل میں مصالحہ کی پوٹلی وغیرہ، سر پہ پتیلا، پیٹھ کے اُوپر کچھ چھیپیاں، کچھ حالانکہ ڈنگی میں بندھے ہوئے گنگناتے چلے آتے ہیں۔ آج دکان کھولی، جھاڑو، بہارو کی، تنور کھولا، ہنڈلوں گڈیوں یا ادھجڑی کا ہنڈا نکالا، جھاڑا پونچھا، اس کٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں گئے، یعنی گھر سے جو پتیلا لاتے تھے، ہنڈے کا مال اسمیں ڈالا، مصالحہ چھڑکا اور دلے دھندکے سے لگ گئے سورج نکلتے نکلتے سالن، نہاری، شوربا جو ہو درست کرلیا۔ تندور میں ایندھن جھونکا، تندور گرم ہوتے ہوتے غریب غربا کام پر جانے والے روٹی پکوانے یا لگاون کیلئے شوربا لینے آنے شروع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں آٹے کا طباق ہے تو کوئی مٹی کا پیالہ لئے چلا آتا ہے اور میاں مٹھو ہیں کہ صاحب روٹیاں بھی لگاتے جاتے ہیں اور پیلے پر کھٹا کھٹ چمچا بھی چل رہا ہے۔" یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کیلئے کتاب کے اچھے حصّوں میں سے ایک چھانٹ کر نقل کر دیا ہے۔ جو خوبیاں آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ساری کتاب میں نظر آئیں گی۔ محض Purple patches لکھ لینا کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے بلکہ یہ تو اسکول کے لڑکوں کا فن ہے۔ اچھا نثر نگار وہ ہے جو مسلسل اچھی نثر لکھ سکے جسکی سطح ہموار ہو۔ یہ نہیں کہ چار قدم تو بڑے اکڑ کے چلے اور پھر ٹھوکریں کھانے لگے۔ اللہ یہ گنگا جمنی چال ہمارے یہاں بہت مقبول ہوتی جا رہی ہے اب اچھی نثر کا معیار یہ ہے کہ دو چار ان مل بے جوڑ تشبیہیں استعمال کر سکتا۔

اشرف صبوحی صاحب ان ہتھکنڈوں کے قائل نہیں ہیں۔ انہیں اچھی نثر لکھنے میں خود مزہ آتا ہے اور آپ بھی اُنکی تحریر کو مزے لے لیکر پڑھ سکتے ہیں اور صاحب آپ جو چاہے کہیں، میں تو ادب سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ اُسے لطف کے ساتھ پڑھ سکوں۔ کسی نے کہا ہے کہ بڑے ادب میں ادبیت نہیں ہوتی۔ اگر ادبیت کے معنی تصنع لئے جائیں تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر اس سے مراد ہے کہ بڑا ادب ایسا ہونا ہے جیسے کھُربے سے گھاس کھُد رہی ہو تو میں یہ کہوں گا کہ کہنے والے نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے مجھے تو بڑے ادب کی کوئی ایسی مثال یاد نہیں آ رہی جسے رو رو کر پڑھنا پڑا ہو۔ اشرف صبوحی صاحب کی کتاب کو بڑا ادب تو خیر میں پھانسی کے تختے پر چڑھ کر ہی کہوں تو کہوں لیکن میں ہر وقت کہنے کو تیار ہوں کہ اس کتاب کی ہر ہر لائن کو آپ لطف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، اور اس لطف کا احساس کتاب بند کر دینے کے بعد بھی دماغ میں گھومتا رہتا ہے اور اس چیز کو میں کوئی معمولی خوبی نہیں سمجھتا۔ اگر اُردو میں اچھا ادب کافی مقدار میں پیدا ہو رہا ہوتا تو اُس وقت اشرف صبوحی صاحب کی کیا اہمیت ہوتی؟ یہ بھی خاصا اچھا سوال ہے لیکن فی الحال اس پر غور کرنے سے کوئی فوری اور عملی فائدہ نہیں۔ اُردو ادب میں آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپکے سامنے بھی ہے اور میرے سامنے بھی۔ ہزار بات کی ایک بات یہ ہے کہ اشرف صبوحی صاحب کا وجود غنیمت ہے۔

یہ آخری فقرہ بقول شخصے [illegible] کے [illegible] میں ہے۔

محمد حسن عسکری

"منزلِ امنِ جہاں"

سوال

ساغرِ شمس و قمر دے کے جسے بھیج دیا ۔ سوزِ جگر دے کے جسے بھیج دیا
ایک بیتاب نظر دے کے جسے بھیج دیا ۔ چیرۂ دستِ بہار کے پٹے کے جسے بھیج دیا

اُس کی رفتار کی رفعت سے ہراساں تو نہ ہو
اپنی تخلیق سے یارب! تو پشیماں تو نہ ہو

قسمتِ آئینہ حیرانی ہی حیرانی ہے ۔ پیرِ کے پیشِ نظر کشت کی ویرانی ہے
کام شعلے کا یہی سوختہ سامانی ہے ۔ قفس کا [illegible] بھی [illegible] خاک بدامانی ہے

کیا کرے اور اگر خاک اُڑایا نہ کرے؟
"محملِ گرد" بھلا کیوں یہ بنایا نہ کرے؟

آزماتا ہے کوئی کس لئے سنگینوں کو؟ ۔ کیا بنایا نہ تھا چھدنے کے لئے سینوں کو؟
لوحِ فطرت سے مٹا پہلے ان آئینوں کو ۔ کیک سر رحم بھر آجائے تماشا بینوں کو

توڑ دے نازکو یہ [illegible] اس سے
جس طرح آتا ہے انسان ستم [illegible] اس سے

جواب

رو رہے [illegible] پہلے کی روایت کیا خوب! ۔ وہی فرسودہ دیارِ حکایت کیا خوب!
پھر وہی تذکرۂ خبث و دنایت کیا خوب! ۔ یعنی معصوم فرشتوں کی سدایت کیا خوب!

ہمکو معلوم یہ تھا انجام یہی ہونا تھا
لیکن اس ریگِ بیاباں میں یہاں سونا تھا

رام کیا حضرت آدمؑ ہی کے فرزند نہ تھے ۔ ابنِ مریمؑ بھی کسی اور کے دلبند نہ تھے
اور [illegible] فطرت کا شکر خندہ نہ تھے ۔ دہنِ تلخ زمانہ میں یہ کیا قند نہ تھے

یہ وہ خاکی تھے فرشتوں سے بھی جو پاک رہے
یہ وہ بندے تھے جو مسجودِ گہہِ افلاک رہے

مہر یہ اب بھی ضیا بار ہیں پہلے کی طرح ۔ شہپر [illegible] پہلے کی طرح
دہر کی مشعلِ پندار ہیں پہلے کی طرح ۔ العرض [illegible] پہلے کی طرح

بندۂ حرص و ہوا ہی کو یہ منظور نہیں
"منزلِ امنِ جہاں" ورنہ ابھی دور نہیں

امینِ حزیںؔ

باتیں

چارلس باڈلیئر کی ایک نظم ہے ــــــ آئینہ۔

ایک نہایت کریہہ المنظر آدمی کمرے میں داخل ہوا اور آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا "آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر آپ کو بے لطفی اور بدمزگی کے سوا اور کوئی احساس ہو نہیں سکتا، پھر کیوں آپ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں؟"

کریہہ المنظر آدمی نے جواب دیا "حضرت! یہ بیسویں صدی ہے، مساوات کا دور، آزادی اور جمہوریت کا زمانہ، ملک، قوم، پیشہ کوئی بھی چیز اس مساوات کے آڑے نہیں آ سکتی۔ اس میں ہر شخص کے حقوق برابر ہیں، اس لئے مجھے بھی اپنے حق سے کوئی طاقت محروم نہیں کر سکتی، چنانچہ میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا ہوں، اب اس میں چاہے لطف ہو یا بے لطفی، اس کا تعلق میری ذات سے ہے، میرا اپنا ضمیر اس کا ذمہ دار ہے۔"

اگر بد ھی سادی سمجھ سے کام لیا جائے تو میں راستی پر تھا، لیکن قانونی نقطۂ نظر سے وہ کریہہ المنظر آدمی بھی غلط بات نہیں کہہ رہا تھا۔

یہ تو تھی نظم، حالانکہ نثر میں ہے، سنو۔ جدید ادب پر اعتراض کرنے والے چاہے وہ قدامت پرست ادیب یا شاعر ہوں چاہے نابجھ نقاد اور چاہے اختساب کے جاہل مجاہد، سب آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہے ہیں، اور ان کی اس حرکت سے جو بے لطفی ان کے اپنے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اس کا ردِ عمل وہ گذشتہ اعتراضات کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے ضمیر کی بلندی کے دعووں میں وہ کسی سے کم نہیں مگر جب آئینے میں انہیں حقیقت سے سامنا ہوتا ہے تو وہ جھلا اٹھتے ہیں اور جمہور کے اخلاق کی نام نہاد پاسبانی کی آڑ لے کر قانون کی پشت پناہی میں اپنی جھلاہٹ کا انتقام لیتے ہیں، لیکن ان کا کمزور حافظہ اس وقت یہ بھول جاتا ہے کہ مساوات کے اس دور میں جس طرح انہیں اپنے خیالات کے اظہار کا حق ہے اسی طرح جن لوگوں پر وہ معترض ہیں ان کے بھی حقوق ہیں، وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کر سکتے ہیں، کہ جدا ہو، ادب زندگی سے کار ضائع نہیں کی ہے، انہوں نے بیباکی کے ساتھ حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے ہر بات کی اونچ نیچ پر غور کیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں کہہ رہے ہیں، اگر ان کی باتیں معترضین کو آئینہ نظر آتی ہیں تو آئینہ دیکھنے سے پہلے انہیں اپنے ضمیر کا علاج کرنا چاہئے اور فوراً کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے ضمیر کا مرض بہت پرانا ہے اور بہت مہلک بھی، (ان کی اپنی ذات کے لئے)

. . . .

غصہ بھی ایک طرح کا نشہ ہے، جیسے محبت کا نشہ، جیسے جفا کا نشہ، جیسے شراب کا نشہ، لیکن غصہ اور شراب کے پینے والوں کے اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں تو غصے کا خانہ غالباً خالی ہی رہے گا۔ گو یا شراب پینے والوں کی اس دنیا میں کثرت ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ شراب بوتلوں میں آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے اور غصہ کسی بند بوتل میں نہیں ملتا بلکہ بوتل کھلنے پر غصے کا اظہار شروع ہوتا ہے اور بعض دفعہ غصہ ختم ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کا سر تھا اور اپنی بوتل یا بوتل تو دوسرے کی تھی لیکن سر اپنا تھا، نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک یعنی دردِ سری۔

غصے اور شراب میں ایک فرق ہے۔ شراب کو حاصل کرنے سے پہلے اپنی جیب پر اقتصادی بار ڈالنا پڑتا ہے، غصے کے برے نتائج کا تدارک یا کفارہ غصے کے بعد جیب پر اقتصادی بار کا باعث ہوتا ہے۔

غصہ آسانی سے بند بوتلوں میں نہیں حاصل ہو سکتا اس لئے لوگ اسے پی نہیں سکتے۔ چنانچہ غصہ اگلا جاتا ہے، شراب پی جاتی ہے، شراب انڈیل کر اس سے ضائع نہیں کی جا سکتی کہ اس کے انڈیلنے پر غصہ آ سکتا ہے اور شراب کی غیر موجودگی میں غصہ نہیں پیا جا سکتا۔ دو چار پینے والوں میں خصوصاً جنہوں نے چندہ کر کے پینے کی ٹھانی ہو اگر کسی کو کم ملے اور کسی کو زیادہ تو شراب کے ساتھ غصے کو بھی پینا پڑتا ہے، یہ مانا کہ اس صورت میں نشہ دہرا ہو جاتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کیونکہ غصے کے پینے

اور لوگ ہوتے ہیں اور شراب کے پینے والے اور لوگ۔

ایک بار میری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہوئی جو اپنے دوستوں میں بہت تُند مزاج مشہور تھا، جیسے میں ڈنمارک کا شہر کے اندیشے میں گھلنے والا بالکل ہی نعت ۔۔۔ اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ لوگ شراب کی بجائے غصہ کیوں پیتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا اور دوسرے ۔۔۔ لیکن فائدے اور نقصان کا تو یہ غصے میں خیال رہتا ہے نہ شراب کے پینے میں، اس لئے میں آج یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ آئندہ غصہ پیا کروں گا۔ وہ غصہ جو مجھے اس بات پر آتا ہے کہ میں شراب کیوں پیتا ہوں لیکن شاید آپ کہیں کہ یہ تو شرابی کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں تو آئیے کچھ اور باتیں کریں۔

. . . . .

فرانس کا شاعر چارلس باڈلیئر جو شراب تو پیتا تھا لیکن تھا ہوشمند انسان، ایک جگہ کہتا ہے "ہر وقت پئے رہو، مگن رہو، اور کسی بات کی سوچ ہی کیا، صرف یہی ہی کا دھندا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تم پر وقت کے اس ہیبت ناک بارِ گراں کا احساس ہو جو اس دھرتی پر ہر کسی کو کچلے جا رہا ہے تو لگاتار پیتے رہو، لگاتار مگن رہو۔

"لیکن کیسے پئے رہو، کیسے مگن رہو؟ شراب میں، شاعری میں، نیکی یا اچھائی میں، کسی میں مگن رہو، جس میں جی چاہے مگن رہو لیکن مگن رہو، پئے رہو۔

"لیکن اگر کبھی کبھار کسی محل کے زینے پر یا کسی تال کے ہرے کنارے پر یا اپنے ہی کمرے کی بوجھل خلوت میں جاگ پڑو، ہوش آ جائے اور بے خودی پوری یا ادھوری ہاتھ سے پھسل کر نکل جائے تو ہوا کے کسی جھونکے سے پوچھو، یا کسی لہر سے پوچھو، یا کسی ستارے سے پوچھو، یا کسی پرندے سے پوچھو، یا گھڑی سے پوچھو، ہر اس چیز سے پوچھو جو اڑتی ہے، یا آہ بھرتی ہے یا جھولتی ہے، یا بولتی ہے پوچھو یہ کہ کیا وقت ہے، کیسا وقت ہے، اور ہوا کا جھونکا، لہر، ستارا، پرندہ، گھڑی ۔۔۔ سب یہی جواب دیں گے "یہ پئے رہنے کا وقت ہے، یہ مگن رہنے کا وقت ہے"۔ اگر تم چاہتے ہو کہ وقت کے مظلوم غلام نہ بنو، تو لگاتار پئے رہو، لگاتار مگن رہو، شراب میں شاعری میں، نیکی یا اچھائی میں، جس میں بھی چاہو مگن رہو۔

. . . . .

کتب خانوں میں پڑھتے پڑھتے بات باتوں میں عورت کو دیکھتے دیکھتے خیال آتا ہے کہ عورت اور کتاب میں بہت سی باتیں ایک سی ہیں بلکہ یوں کہئے کہ عورت ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہے۔ دیکھئے آگے بڑھئے، ہمیں ہر طرف الماریوں میں رکھی ہوئی عورتیں ہی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس الماری میں کیا ہے ریاضی، ہندسہ، الجبرا، اقتصادیات اور اسی قسم کے دوسرے علوم کی کتابیں، یہ سب بوڑھی عورتیں ہیں یا بدصورت عورتیں ہیں یا تیس سال سے کم کی بیوائیں ہیں، ان میں کسی مرد کو کم ہی دلچسپی ہوتی ہے بلکہ بالکل نہیں۔ دیکھئے، اس الماری میں ناول ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو حسین ہوں یا نہ ہوں لیکن ان میں تھوڑی بہت کشش ضرور ہے، جس کی بنا پر عوام ان کی طرف اکثر راغب رہتے ہیں۔ شاعری کی کتابیں ہیں یعنی محبوب عورتیں کیونکہ ایک شاعر کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسے کسی عورت سے عشق نہ ہو ایک عاشق بھی ہو لیکن اگر ایک عاشق چاہے عمر بھر ایک بھی شعر نہ کہے تو بھی شاعر ضرور ہو سکتا ہے ۔۔۔ یہاں مانا ہے۔ یہ اسکولوں کالجوں کے کورس ہیں، ان کو حالی نے یوں مخاطب کیا ہے ۔۔۔

"اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے" ان کا مطالعہ انسان کی زندگی میں ایک لازمی حیثیت کے طور پر شامل ہے، کیونکہ انہیں پڑھنے سے انسان کو دوسری کتابوں کے مطالعہ میں آسانی رہتی ہے، اور اس الماری پر بھی غور کیجئے، اس الماری کے منتظم نے وہ تمام کتابیں اکٹھی کر رکھی ہیں جو ابھی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ "آؤٹ آف پرنٹ" ہیں، ان میں سلمیٰ بھی ہے اور قلوپطرہ بھی، شہزادے کی ہیلن بھی ہے اور جہاں بادشاہ کی دردانہ بھی، یہ تاریخی کتابیں ہیں، اور یہ ایک طرف مذہبی کتابیں ہیں، ان میں تمام دیوتاؤں کی دیویاں ہیں، لکشمی، سرسوتی، پاربتی یہاں تک کہ کرشن مہاراج کی رادھا بھی یہاں براجمان ہیں۔

جس طرح وید، انجیل اور قرآن ایک عالم پر اثر انداز ہوئے ہیں اسی طرح بعض عورتوں نے بھی تاریخ پر اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے، ایسی کتابوں کو انگریزی میں بیسٹ سیلر کہتے ہیں، مثلاً ہندوستان میں نورجہاں، انگلستان میں ملکہ الزبتھ، فرانس میں جون آف آرک وغیرہ وغیرہ۔

بعض کتابوں کی کتابت طباعت جلد بندی بہت اچھی ہوتی ہے لیکن متن میں رطب و یابس بھرا ہوتا ہے۔ وہ عورتیں ہیں جن کی دلکشی صرف بصارت تک محدود ہے۔ دور سے دیکھ لیجئے پاس پہنچے تو ملاقات یعنی مطالعہ آپ کو ناامید کر دے گا۔ لیکن برقعہ پوش عورتیں کیا ہیں؟ مجلّد کتابیں ہیں جو جزدانوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ انہیں پہلے زمانے میں لوگ باوضو ہو کر رحل پر رکھ کر پڑھا کرتے تھے، لیکن اب دنیا ترقی کر چکی ہے، پڑھنے والے راستہ چلتے بھی پڑھ لیتے ہیں۔

ہاں، وہ عورتیں جو ہماری زندگی میں آتی ہیں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں اور وہ کتابیں جنہیں لکھتے تو ہم خود ہیں لیکن اُن کے پڑھنے والے اور ہوتے ہیں انہیں ہم بیٹیاں کہتے ہیں۔

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک بار شروع کر کے ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا، بعض عورتیں بھی ایسی ہوتی ہیں۔

آج کل میں شام کو کناٹ پلیس سے گذرتے ہوئے اکثر دل میں کہتا ہوں کہ اللہ بیوی دے [illegible] —

یہاں تک لکھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ چکلہ کتابوں کی ایک دکان ہے جہاں ہر شخص نقد دام دے کر ہر موجودہ کتاب خرید سکتا ہے لیکن گھریلو زندگی ایک کتب خانہ ہے جہاں بعض شرائط کی بنا پر ہی کتاب مل سکتی ہے۔

میراجی؛

نشاطِ غم

ضبطِ غم کی کشمکش سے وہ مقام آ ہی گیا
لاکھ روکا پھر بھی لب پر انکا نام آ ہی گیا

راہِ ہستی میں سکونِ مرگ بھی منزل نہیں
میں یہ سمجھا غالباً کوئی مقام آ ہی گیا

کم نہ ہو پائیں وہاں جامِ طرب کی گردشیں
میرا سرگشتہ مقدّر انکے کام آ ہی گیا

ہائے کیا جوشِ طلب ہے گرتے گرتے ضعف سے
جانبِ منزل کوئی دو ایک گام آ ہی گیا

ضبطِ غم کا تکملہ چاہا سکوتِ مرگ نے
لب پہ لیکن ایک نالہ ناتمام آ ہی گیا

وحدتِ جوشِ طلب سے ماسوا کی راہ میں
بُتکدہ آ ہی گیا بیت الحرام آ ہی گیا

ہر نگاہِ شوق اب کہنے لگی ناکامِ دید
جلوہ آرائی کا اُن کو اہتمام آ ہی گیا

جوشِ ہجراں روک دیتا گردشیں افلاک کی
کوئی کافر درمیانِ صبح و شام آ ہی گیا

جلوہ گاہِ ناز میں تابشؔ نظر کی خیر مانگ
اس طلسمِ رنگ و بُو میں دل تو کام آ ہی گیا

تابش دہلوی؛

پیٹ کا سوال

کل رات اِک رئیس کی باہوں میں جھوم کر ⁂ لوٹی جو گھر کسان کی بیٹی بصد ملال
غیظ و غضب سے باپ کا خوں کھولنے لگا ⁂ در پیش آج بھی تھا مگر پیٹ کا سوال

کشتۂ معاش

کل رات اک کنویں سے معاً بلبلے اُٹھے ⁂ پانی کی تہ میں تیر رہی تھی کسی کی لاش
اک بڑھیا کہہ رہی تھی یہ سر پیٹ پیٹ کر ⁂ اے میرے لال، نورِ نظر، کشتۂ معاش

خوابگاہِ مزدور

کل رات اک سڑک پہ کوئی نرم نرم شے ⁂ بیتاب میرے پاؤں کی ٹھوکر سے ہو گئی
میں جا رہا تھا اپنے خیالات میں مگن ⁂ ہلکی سی ایک چیخ فضاؤں میں کھو گئی

حسینانِ سَرَن

رسیلی رسیلی نگاہوں سے ٹپکے مئے کیف پرور نشیلی نشیلی
سجیلی سجیلی بھووں کی کمانوں میں جلّاد پلکیں نکیلی نکیلی
ہراساں ہراساں جوانی کی دھڑکن اُمنگوں کے طوفان خراماں خراماں
چراغاں چراغاں شبستانِ عارض، ختن زار گیسو پریشاں پریشاں
حنائی حنائی ہتھیلی ہتھیلی، ترنّم کی دُنیا کلائی کلائی
خدائی خدائی سے دست و گریباں قیامت قیامت دُہائی دُہائی

قتیل شفائی

یہ دلّی ہے

جہاں کو درسِ عبرت ہے یہ دِلّی کی زباں دانی
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

دِلّی کو اُردو سے یا اُردو کو دِلّی سے جو قریبی تعلق ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ قدرتی طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ دِلّی کے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا بہترین انتظام ہوگا اور ان علمی گہواروں میں اُردو اسی طرح پروان چڑھتی ہوگی جس طرح ایک بچہ ماں کے آغوشِ عاطفت میں پرورش پاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ دِلّی کے اسکولوں میں عام طور پر اُردو کی تعلیم کے ساتھ جس بے اعتنائی کا سلوک کیا جا رہا ہے وہ صرف شرمناک ہی نہیں مجرمانہ بھی ہے۔ یہ دعویٰ محض قیاس و گماں پر مبنی نہیں بلکہ اس کے ثبوت میں ہمارے پاس ایک ایسی زبردست شہادت موجود ہے جس کی تردید کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

سترہ برس ہوئے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مجھے پہلی اور آخری مرتبہ دِلّی میٹریکولیشن کے ایک اُردو پرچے کا ممتحن مقرر کیا گیا۔ میں نے امتحان کا پرچہ بنایا اور ٹھیک پچھلے سال کے نمونے کے مطابق بنایا۔ اشعار کا مطلب پوچھا۔ نثر کی عبارتوں کی تشریح چاہی۔ بعض مصطلحات کی تعریفیں لکھوائیں۔ محاورات کے معنی دریافت کئے وغیرہ۔ امتحان کی کاپیاں جس وقت میں نے جانچیں تو میں حیران رہ گیا۔ تقریباً بیس سال سے ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں کے ہر چھوٹے بڑے امتحان کے پرچے جانچنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ مگر ایسا مجموعۂ خرافات کبھی نظر سے نہیں گذرا۔ دِلّی نے سب کو مات کر دیا۔ تقریباً پانسو اُمیدوار اس امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ لڑکیاں سب فیل تھیں اور لڑکے کُل سترہ پاس باقی فیل۔ گویا کوئی سوا تین، ساڑھے تین فیصدی اُمیدوار کامیاب ہوئے۔

امتحان کا نتیجہ جس وقت میں نے پیش کیا تو محکمہ کے ارباب حل و عقد میں ہلچل مچ گئی۔ خیر اُن واقعات کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایک رات کے اندر اندر نتیجے نے جوابدل ما۔ لڑکیاں کُل کی کُل پاس اور لڑکے ساٹھ فیصدی کامیاب۔ اُمیدواروں نے سوالوں کے جو جوابات لکھے تھے اُن کے بعض حصّے میں نے نقل کر لئے تھے۔ آج قارئینِ ساقی کی ضیافتِ طبع کے لئے نہیں بلکہ عبرت کے لئے اُنہیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

ایک سوال تھا کہ مندرجہ ذیل محاورات کے معنی بیان کرو اور اُنہیں جملوں میں استعمال کرو۔ "طوطی بولنا"! اب اس طوطی کے رنگا رنگ چہچہے سُنیئے اور سر دُھنیئے۔ طلبا کی ذہانت قابلِ داد اور اُن کے اساتذہ کی تعلیم لائقِ مبارکباد ہے۔

طوطی بولنا

ایک برخوردار لکھتے ہیں کہ "بوجہ سسرال میاں جی کی طوطی بول گئی"۔

دوسرے مورخ کا قول ہے کہ:- "مینوا نے جب یہ سُنا کہ مرہٹے ہار گئے تو اُس کی طوطی بول گئی"۔

تیسرے رنگیلے فرماتے ہیں کہ:- "موہن کی شادی میں خوب طوطیاں بولیں"۔

چوتھے ماہرِ زبان کا ارشاد ہے کہ:- "جس جگہ کسی زمانے میں آدمی رہتے تھے وہاں اب طوطی بولتے ہیں یہ محاورہ ہے"۔

پانچواں قوی ہیکل دہقانی کہتا ہے کہ:- "ہم کوئی دس میل گئے ہوں گے کہ میرے ایک شہری دوست کی طوطی بول گئی"۔

ایک فقرہ تھا "دفع دخل مقدر" اس کی چند تشریحیں ملاحظہ فرمایئے:-

(۱) اس دُنیا میں دفع دخل مقدر نہیں سوائے ایک خدا کے۔

(۲) لوگ اس کی جائداد پر قابض ہوگئے کیونکہ اُسے دفع دخل مقدر بالکل نہ تھا۔

(۳) یہ تو ہمارے دفع دخل مقدر میں لکھا تھا ـــ اس کا کیا علاج؟

رباعی، قصیدہ، مثنوی اور غزل کی تعریف پوچھی تھی۔ اس سوال کا جواب سُنیئے اور حیرت میں غرق ہو جایئے۔ اصنافِ سخن میں ہمارے یہاں غزل سب سے زیادہ مروج اور مقبول رہی ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ جس طالب علم نے دس برس اُردو پڑھی ہے اگر وہ غزل کی صحیح اور مکمل تعریف نہ کر سکیں تب بھی وہ اپنے لفظوں میں غزل کا مفہوم ادا کر سکیں گے لیکن طلباء کے جوابات پڑھنے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک جاہل، اور بے سواد تماشے والا یا اُسکا کوئی دوسرا ہم قطار اپنے خیالات کا اپنی زبان میں اظہار کر رہا ہے

ایک صاحب فرماتے ہیں "غزل وہ ہے جس میں تک بندی کی جاتے"

بات تو پتے کی کہی، اگرچہ نادانستہ کہی، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر شعرا کی بیشتر غزلیں تک بندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، دورِ حاضر کے غزل گو شعرا بھی اسی دائرے میں داخل ہیں۔

دوسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ "غزل وہ نظم ہے جس میں الفاظ مطلب کی رُو سے استعمال کیے گئے ہوں" سبحان اللہ! غزل کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف کیا ہوسکتی ہے یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ غزل کے سوا دوسرے اصنافِ سخن میں الفاظ اور معانی کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تیسری تعریف سُنئے: "غزل وہ نظم ہیں جن کو زیادہ تر طوائف لوگ گاتے ہیں، یہ دوہری بھی ہوتی ہے اور ایک لائن کی بھی مگر لمبائی اور چھوٹائی کی کوئی حد نہیں"

ہاں، وہ غزل ہی کیا جسے طوائف نہ گائے۔ مولانا حالی کے بقول:۔

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں ۔۔ تو بھانڈ اپنی غزلیں مجالس میں گائیں
طوائف کو از بر ہیں دیوان انکے ۔۔ گویوں پہ بے حد ہیں احسان اُنکے

یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ دوہری اور اکہری کی قید سمجھ میں نہیں آتی اور لمبائی اور چھوٹائی کا غیر محدود ہونا بھی قابلِ غور ہے اور طوائف کی جمع "طوائف لوگ" بھی غالباً ایک خاص قاعدے کے ماتحت بنائی گئی ہے۔

سُنا ہے کبھی انگریز نے اپنے منشی سے پوچھا کہ ول منشی، جس طرح انگریزی میں واحد سے جمع بنانے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ہم کے آخر میں S (ایس) لگادیتے ہیں مثلاً (Dog) ڈاگ (کتا) واحد اور (Dogs) ڈاگز اس کی جمع (Bird) برڈ (چڑیا) واحد اور (Birds) برڈس جمع۔ کیا اُردو میں ایسا کوئی عام قاعدہ نہیں ہے؟ منشی نے کہا "کیوں نہیں حضور۔ اُردو میں بھی ایسا عام قاعدہ موجود ہے۔ آپ کے یہاں S (ایس) لگاتے ہیں۔ ہمارے یہاں "لوگ" لگاتے ہیں۔ جیسے انگریز سے انگریز لوگ۔ کتا لوگ۔ چڑیا لوگ"۔ اسی کے قیاس پر "طوائف لوگ" کو سمجھنا چاہیئے۔

ایک اور صاحب نے بھی اسی سے ملتی جلتی تعریف کی ہے فرماتے ہیں "غزل ایسی نظم جو کہ گرمت سے ساز و سامان کے پڑھی جائے"

تو گویا اب جس نظم کو بھی آپ گا کر پڑھیں وہی غزل ہے۔ بہت خوب اور گانے کے لئے طوائف کی بھی قید نہیں آپ خود بھی گا سکتے ہیں البتہ گانے کے ساتھ "ساز و سامان" کا ہونا ضروری ہے۔

غزل کی ایک تعریف اور بھی سُنیئے۔ معنوی اعتبار سے یہ تعریف ایک حد تک صحیح ہے لیکن اندازِ بیان کا جواب نہیں ارشاد ہوتا ہے:

"غزل جو عورت کی طرف میں کئے جاتے ہیں"

اساتذۂ فن نے غزل کی تعریف میں کوئی اصولی اختلاف نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے دلی کے اسکولوں کے معلم اس مسئلہ میں شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ایک نے تو اپنے شاگردوں کو یہ بتایا کہ "غزل دوہری بھی ہوتی ہے اور ایک لائن کی بھی۔ مگر لمبائی اور چھوٹائی کی کوئی حد نہیں۔ لیکن دوسرے بزرگ نے یہ تعلیم دی کہ "غزل کے اندر دو لائن ہوتی ہیں جوڑے کی۔ اور اُن لائنوں کی تول تقریباً برابر ہوتی ہے" عروضیوں کو اس تعریف سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

غزل کی صرف ایک تعریف ہم اور نقل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب اچھی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آیا شاید قارئین ساقی سمجھ سکیں۔

"غزل۔ جو پانچ چھ شعروں کی عشق مزاجی اور عشق حکیکی معنوں میں ہوتی ہے" "مزاجی" اور "حکیکی" بظاہر مجازی اور حقیقی کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔

غزل کی چند تعریفیں آپ نے سُن لیں۔ اب قصیدہ، مثنوی اور رباعی کے متعلق بھی اپنی معلومات میں کچھ اضافہ کر لیجئے۔

قصیدہ

(۱) "قصیدہ۔ چھوٹے چھوٹے پانچ یا چھ فقرے والے اشعار کو کہتے ہیں"۔

(۲) "قصیدہ۔ جو مصرا (مصرع) یا عبارت خدا کے واسطے پڑھے"۔

(۳) "قصیدہ جس میں کسی شخص کی بُرائی بھلائی پائی جاتی ہے"
(۴) "قصیدہ۔ وہ ہجو یا سیاپا ہے جو آدمی کے مرنے کے بعد پڑھا جائے"
(۵) "قصیدہ۔ اُسے کہتے ہیں جو نظم اس طور پر پڑھی جائے کہ سُننے میں سامعین اور سُننے والے کے دل پر گہرا اثر ہو۔ قصیدہ اکثر غم زدہ، غم سے بھرے ہوئے ہیں"
(۶) "قصیدہ۔ اس کے اندر چار چار قطاریں ہوتی ہیں اور تسبیح (تسبیح) وغیرہ پائی جاتی ہے"

رُباعی

(۱) "رباعی۔ غزل کی ایک قسم ہے بہت عمدہ ہوتی ہے"
(۲) "وہ شخص جو زیادہ رنج ہوتا ہے اور اُس وقت وہ شخص جو شعر کہا کرتا ہے اسے رباعی کہتے ہیں جیسے کسی کا لڑکا مرجائے اور اُس کے رنج میں جو کہے تو رباعی ہوتی"
(۳) "رباعی۔ اس میں اکثر چار شعر ہوتے ہیں۔ مثلاً :-
راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کوئی کھٹکا نہیں
آج تک اس راہ میں کوئی اٹکا نہیں"
(۴) "رباعی۔ عام طور پر چند لائنوں کی ہوتی ہے اور بہت جلدی جلدی پڑھی جاتی ہے"
(۵) "رباعی۔ وہ نظم جو تھوڑی سی سطروں میں ہو لگاتار نہ ہو"
(۶) "رباعی۔ دو شعروں کی بنی ہوئی خدا کی عبادت میں ہوتی ہے"

مثنوی

(۱) "مثنوی اس کو کہتے ہیں جس میں دو شعر ہوتے ہیں، یا خدا کی شان میں یا رسول کی شان میں یا امام حسین کی شان میں یا کسی اولیا اللہ کی شان میں"
(۲) "مثنوی وہ ہوتی ہے جو سُناتے وقت بالکل تازہ گھڑ لی جاتی ہے"
(۳) "مثنوی۔ شعر جو کسی کے جان کی بابت کہے جائیں"
(۴) "مثنوی۔ عموماً ایک لائن کے شعر ہوتے ہیں مگر دوہرے نہیں ہوتے"
(۵) "مثنوی۔ یہ شعر بنائے جاتے ہیں بلا کسی دلیل کے"

اب چند اشعار کی تشریح سُنئے :-

شعر :- زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں
اور یوسف سے برادر کو جدا کرتے ہیں

تشریح (۱) "ناصح کو ہر ایک سقراط پال دیتے ہیں"
(۲) "نصیحت کرنے والے زہر سقراط پلا دیتے ہیں"
(۳) "نصیحت کرنے والوں کو سقراط سے زہر پلوا دیتے ہیں۔ سقراط ایک حکیم تھا جو کسی بادشاہ کو نصیحت کرتا تھا، بادشاہ سقراط کے ذریعہ اُس کو زہر پلوا دیا کرتا تھا"
(۴) "ناصح کے ذریعہ سقراط کو زہر پلوا دیا گیا تھا۔ ایک مشہور واقعہ ہے"
(۵) "زہر کا پیالہ بھرا ہوا اُن کو پلا دیتے ہیں اور یوسف سے بھائی کو علیحدہ کر دیتے ہیں جس طرح دونوں بھائیوں کو جدا جدا کر دیتے ہیں، زہر کا پیالہ پلا کر"

شعر :- لکھا ہے صفحۂ اوراقِ گل پر شہادت نامۂ بلبل سراسر

تشریح (۱) "پتیوں کی صفوں پر بلبل نے شہادت نامہ لکھا ہے۔ شہادت نامہ ایک کتاب ہوتی ہے جس میں امام حسین جو مسلمانوں کے بہت بڑے پیغمبر ہوئے ہیں اور آخر میں اُن کو سولی دی گئی تھی اُن کے مارے جانے کا حال درج ہے"
(۲) "بلبل نامہ گیتوں کے مجموعہ کا نام ہے جس میں بلبل کی شہادت کا ذکر ہے"

یوں تو ہر شعر کی تشریح دانش و فرہنگ ہے لیکن خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے اشعار کی جو تشریح کی گئی ہے وہ ایک اعجوبۂ روزگار کے طور پر ہمیشہ قدیم میں محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

شعر :- مژگاں تر ہوں یا رگِ تاکِ بُریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

مطلب (۱) "میرے معشوق کی پلکیں مثل انگور کی رگوں کے ہوں اور پھر جیسی بھی ہوں مطلب یہ ہے کہ مجھ کو بڑا بنا دیں"
مطلب (۲) "شاعر کہتا ہے کہ پلک اس طرح ہوں کہ جیسے انگور کی بہت گیلے ہوئے ہیں کہ تکلیف دہ ہوں"

اِن دونوں دانش مندوں نے صیغۂ واحد متکلم "ہوں" کو صیغہ جمع غائب بمعنی "ہونے چاہئیں" سمجھا۔ ایک نے "مژگان تر" کا ترجمہ "معشوق کی پلک" کیا، دوسرے نے "رگِ تاکِ بریدہ" "گیلا" قرار دیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ آرے کا کام کاٹنا ہے اور "بُریدہ" بھی بُریدن (کاٹنا) سے ماخوذ ہے
مطلب (۳) "کسی کی آنکھ کے سر کا نشانہ ہوں اور میرا دل اُس کی تاک میں ٹوٹ گیا ہے"

ماشاءاللہ، بہت دُور کی کوڑی لائے اور خوب تاک لگائی۔

مژگان کے معنی آنکھ فرض کیجئے۔ "تر" کو تبر کا مخفف سمجھئے لیکن "بُرِش نہ" کہاں سے آیا اس کا کچھ پتا نہیں چلتا! تو یہ لفظ سانہ تاک کر لگایا جاتا ہے۔ جب تاک موجود ہے تو نشانہ خود بخود پیدا ہو گیا۔

مطلب (۴) "میں گیلی پلکوں والا ہوں یا رگ تاک کا برادہ ہوں یعنی چُور چُور ہوں"

اے سبحان اللہ! انہوں نے اپنے آرے والے رفیق کو بھی مات کردیا۔ انہوں نے صرف پلکوں کا جالی آرا چلایا تھا۔ انہوں نے رگِ تاک کا "برادہ" مہیا کر کے آرا چلنے کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

مطلب (۵) "تیری پلک لمبی ہے اور کھول چھوٹی۔ غرض کہ جو کچھ ہو آفت پہنچانے والی ہو" "مژگان تر" کے معنی "لمبی پلک" اور "رگِ تاک بُریدہ" کے معنی "چھوٹی بھوں"، "آفت رسیدہ" کے معنی "آفت پہنچانے والی"۔ باقی مطلب صاف ہی آ گئے ہیں۔

مطلب (۶) "شاعر کہتا ہے کہ میری پلکیں بھیگی ہوئی ہیں یا کٹی ہوئی ہیں"

مژگاں تر۔ بُریدہ تینوں لفظوں کے معنی صحیح بیان کئے باقی الفاظ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔

مطلب (۷) "یہ ذوق شاعر کہتا ہے کہ میں گناہوں سے بھرا ہوا ہوں مگر ایک دوسرے کو شعروں میں کاٹنے والا ہوں"

"ذوق شاعر" نے ٹھیک ہی تو کہا کہ "مژگانِ تر ہوں" یعنی گناہوں سے بھرا ہوں لیکن "رگِ تاک بُریدہ" کے معنی "ایک دوسرے کو شعروں میں کاٹنے والا"، کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔

مطلب (۸) "میں تیری مژگاں ہوں یا رگ ہوں یا ناک ہوں یعنی کٹے آدمی کی طرح آفت رسیدہ"

اگرچہ تاک اور ناک میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے لیکن ہر شخص کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا کہ "تاک" کاتب کی غلطی ہے اور لفظ دراصل "ناک" ہے۔ اور جب تاک کی اصلاح کر کے ناک بنا دیا گیا تو پھر ناک بُریدہ کے معنی خود آپ سے آپ ہو گئے۔ شعر کا یہ مطلب اگر کسی طرح خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ تک پہنچایا جا سکتا تو یقین ہے کہ اُن کی رُوح پر بھی وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ فی الواقع یہ ذہانت قابلِ داد ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس کی نہ داد ہے نہ فریاد ہے۔

شعر۔ اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے ۔ میں غم زدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

مطلب (۱) "شاعر کہتا ہے کہ میرے درد اتنا ہوا، اتنا ہوا کہ وہ بے انتہا بڑھ گیا مگر میں ضبط کرتا رہا اور مجھے ضبط کی چونکہ عادت پڑ گئی ہے اس لئے اب درد معلوم نہیں ہوتا ہے۔ میں مصیبت زدہ تو آنسوؤں کو چُوس لیتا ہوں"

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے سوز کے متعلق ایک مرتبہ میر تقی میر علیہ الرحمتہ نے فرمایا کہ "شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سُنے"۔ غالباً درد کے متعلق بھی اُن کی یہی رائے ہوگی کیونکہ سوز [illegible] درد معنی کے اعتبار سے ایک ہی قبیل کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ ہمارے ذہین طالب علم نے بھی لفظ درد کو تخلص کے بجائے حقیقی درد خیال کیا۔ اور میر صاحب قبلہ جس نکتے تک پہنچے تھے۔ ہمارا یہ دلّی کا طالب علم بھی وہیں جا پہنچا۔ اسی کا نام اصطلاح میں "توارد" ہے۔ سچ ہے فیض کا دروازہ قدرت کی طرف سے کبھی بند نہیں ہوتا۔ چکیدن کے معنی چُوس لینا بھی لُطف سے خالی نہیں۔

مطلب (۲) "میں تو غم زدہ ہوں اور تو اشکِ چکیدہ ہے"

ماشاءاللہ کیا منصفانہ تقسیم ہے۔

مطلب (۳) "ضبط میرے کام سے جا چکا ہے اور میں غزل کہنے میں بہت مشہور ہوں"

اشعار کے یہ مطالب کسی تبصرے کے محتاج نہیں نہ دوسرے جوابات کے متعلق کسی اظہارِ رائے کی ضرورت ہے۔ پانچسو طلباء میں سے تقریباً پونے پانسو کے جوابات کا عام انداز یہی تھا۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، دہلی، کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ کیا وہ اس افسوسناک صورتِ حال کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

عندلیب شادانی

نئے شاعروں پر ایک سرسری نظر

مجھے نئے شاعروں پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔ لیکن یہ سرسری نظر ڈالنے سے پہلے شاید یہ بتانا ضروری ہے کہ "نئے شاعروں" سے میری کیا مراد ہے۔ اور اس کے بعد یہ بھی کہ "سرسری نظر" کا مفہوم اس مضمون کی ضرورت کیلئے کتنا محدود کر دیا گیا لامحدود ہوگا۔ اس تشریح کی ضرورت ایک حد تک یوں بھی ہے کہ لفظوں کا مفہوم ہمیشہ سے کچھ اضافی سا رہا ہے اور اس زمانہ میں تو لفظ اپنا مدتوں میں بنا یا ہوا مفہوم کھو کر ایک نیا مفہوم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے نازک جسموں کو الٹ دی تحریک نے جس میں لوگوں ملبوسوں سے ڈھک دیا ہے وہ اب ایک ایک کر کے اتر رہے ہیں۔ اور لفظوں کے ڈھانچوں پر اب نئے "حریر" اور نئے "پرنیاں" کی تہیں چڑھنی شروع ہو گئی ہیں۔ کہ ان کی شکلیں پہچانی نہیں جا سکتیں۔ اور اسی لیے جب کوئی کہتا ہے "نئے شاعر" تو خیال بھی دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ نظر کے سامنے بھی الگ سے الجھاوے آ جاتے ہیں۔ "نئے شاعر" کیا حالی اور آزاد نئے شاعر ہیں یا حالی اور آزاد سے کے اکبر، چکبست اور اقبال یا پھر جوش، اختر شیرانی اور روش۔ یہ چند سرسری سے کہ شاعروں کی "رونق بزم" حفیظ جالندھری، احسان دانش، ساغر، روش، اس میں شبہ نہیں کہ حالی سے لیکر اقبال، جوش، حفیظ اور روش تک سب (غزل گو شاعروں کو چھوڑ کر) "نئے شاعر" ہیں۔ لیکن یہ بتانا کہ کس چیز کو مدت تک نیا کہیں۔ اب نئے شاعروں کے ایک گروہ نے ہمارے خیال اور ذہن پر قبضہ جمانا شروع کر دیا ہے۔ فیض، راشد، مجاز، تاثیر، قائد، ...، اختر، ...، جاں نثار اختر، سلام، نظر، جعفری، زیدی اور ان سب سے بڑھ کر میراجی۔ اب یہ نئے شاعر ہیں جن کے متعلق پڑھے لکھوں میں اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں طرح طرح کی بحثیں ہوتی ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں نے ابھی "نئے شاعروں" پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اور "سرسری نظر" ڈالنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان شاعروں کی شاعری کے متعلق جو مختلف طرح کی غلط فہمیاں عام ہو گئی ہیں انھیں صحیح نظر سے دیکھا جا سکے۔ اور ان کے تجرباتی پس منظر پر ان کی قدروں کا صحیح اندازہ ہو سکے "تجرباتی پس منظر" میں نے اس لیے کہا کہ اس نئی شاعری کا خاصا بڑا حصہ نئے تجربوں کی گود میں پل رہا ہے۔ نئے تجربے جب تک ایک روایتی قوت کی شکل اختیار کر لیں دیکھنے والوں میں غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ در خود تجربہ کرنے والوں میں شک اور شبہ باقی رکھتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں ادب اور فن کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں پڑھنے والوں کی طرف سے جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس کا علاج شاید یہی ہے کہ ادب کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھ کر غلط فہمیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی رکاوٹ کے بوجھ کو ہلکا کریں۔ ممکن ہے نئے شاعروں پر یہ "سرسری نظر" اس بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکے

میں نے ابھی کہا تھا کہ نئی شاعری کا خاصا بڑا حصہ نئے تجربوں کی گود میں پرورش پا رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری کے پڑھنے والے اس میں مختلف طرح کی الجھنیں محسوس کرتے ہیں۔ خیال کے سلسلہ میں بھی اور بیان کے سلسلے میں بھی۔ انھیں شاعروں کی کہی ہوئی بیشتر باتیں مہمل اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں ابہام ہوتا ہے۔ شاعروں نے واقعات کی اور محسوسات کی جو تصویریں بنائی ہیں ان میں دھندلا پن ہے۔ اور نظر کو ان کے نقوش کی تہوں اور گہرائیوں تک پہنچنے میں اتنی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ اور تصویر کے نقش واضح ہو کر سامنے نہیں آتے۔ بات کہنے کے طریقے میں اور تصویریں بنانے کے فن میں بھی اجنبیت ہے۔ نئے شعرا نے لفظوں کا نیا مفہوم، تشبیہوں اور استعاروں کا اس سے بھی زیادہ اجنبی اور ان دیکھا انداز۔ بیان میں کبھی نہ ختم ہونے والی آزادی۔ بحروں، قافیوں اور ردیفوں کی رسمی پابندیوں سے بغاوت، عام خیال اب تک ان چیزوں کا عادی نہیں معلوم ہوتا۔ اسے گھبراہٹ اور الجھن سے بھی زیادہ جھلاہٹ ہوتی ہے۔ اور پڑھنے والا جسے انسانی فطرت نے اپنے خیال اور سمجھ کو سب سے برتر سمجھنا سکھایا ہے ان چیزوں کو بے معنی اور مہمل کہتا ہے۔ وہ جذباتی بن جاتا ہے۔ اور جذبات کی رو خیال اور سمجھ کو اور بھی غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔

"نئی شاعری" میں بے شک ابہام ہے لیکن اس کے خاصے حصے میں اس ابہام کا سلسلہ کسی نہ کسی "نئے تجربے" کی کوشش سے ملتا ہے۔ کہیں کامیاب اور کہیں ناکام۔ خیال کے ابہام کی دو قسمیں وجہیں ہیں۔ ہمارے نئے شاعروں کے نفسیات کے بعض نئے پہلوؤں سے

ماشاءاللہ، بہت دُور کی کوڑی لائے اور خوب تان لگائی۔

مژگان کے معنی آنکھ فرض کیجئے "تر" کو تیر کا مخفف سمجھئے لیکن "پر نت نہ" کہاں سے آیا اس کا کچھ پتا نہیں چلتا! تو یہ کہ نسا نہ ناک کر لگایا جاتا ہے۔ جب ناک موجود ہے تو نشانہ خود بخود پیدا ہو گیا۔

مطلب (۴) "گیلی پلکوں والا ہوں، یا رگ تاک کا برادہ ہوں یعنی چُور چُور ہوں"

اے سبحان اللہ! انہوں نے اسے آرے والے رفیق کو بھی مات کر دیا۔ اُنہوں نے صرف پلکوں کا حالی آرا چلایا تھا۔ انہوں نے رگِ تاک کا "برادہ" مہیا کر کے آرا چلنے کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

مطلب (۵) "تیری پلک لمبی ہے اور بھوں چھوٹی۔ غرض کہ جو کچھ ہو آفت پہنچانے والی ہو"۔ "مژگان تر" کے معنی "لمبی پلک" اور "رگِ تاک بُریدہ" کے معنی "چھوٹی بھوں"، "آفت رسیدہ" کے معنی آفت پہنچانے والی۔ باقی مطلب صاف ہو گئے جیئے۔

مطلب (۶) "شاعر کہتا ہے کہ میری پلکیں بھیگی ہوئی ہیں یا کٹی ہوئی ہیں"

مژگاں تر۔ بُریدہ تینوں لفظوں کے معنی صحیح بیان کئے باقی الفاظ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔

مطلب (۷) "بد ذوق شاعر کہتا ہے کہ میں گناہوں سے بھرا ہوا ہوں مگر ایک دوسرے کو شعروں میں کاٹنے والا ہوں"

"بد ذوق شاعر" نے ٹھیک ہی تو کہا کہ "مژگاں تر ہوں" یعنی گناہوں سے بھرا ہوں۔ لیکن "رگِ تاکِ بُریدہ" کے معنی "ایک دوسرے کو شعروں میں کاٹنے والا" کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔

مطلب (۸) "میں تری مژگاں ہوں یا رگ ہوں یا ناک ہوں یعنی کٹے آدمی کی طرح آفت رسیدہ"

اگرچہ تاک اور ناک میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے لیکن ہر شخص کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا کہ "ت ک" کاتب کی غلطی ہے اور لفظ دراصل "ناک" ہے۔ اور جب تاک کی اصلاح کر کے ناک بنایا گیا تو پھر ناک بُریدہ کے معنی "کٹا" آپ سے آپ ہو گئے۔ شعر کا یہ مطلب اگر کسی طرح خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ تک پہنچایا جا سکتا تو یقین ہے کہ اُن کی رُوح پر بھی وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ فی الواقع یہ ذہانت قابلِ داد ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس کی نہ داد ہے نہ فریاد ہے۔

شعر۔ اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

مطلب (۱) "شاعر کہتا ہے کہ میرے درد اتنا ہوا، اتنا ہوا کہ وہ بے انتہا بڑھ گیا مگر میں ضبط کرتا رہا اور مجھے ضبط کی چونکہ عادت پڑ گئی ہے اس لئے اب درد معلوم نہیں ہوتا ہے۔ میں مصیبت زدہ تو آنسوؤں کو چُوس لیتا ہوں"

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے سوز کے متعلق ایک مرتبہ میر تقی میر علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ "شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سُنے"۔ غالباً درد کے متعلق بھی اُن کی یہی رائے ہو گی کیونکہ سوز و درد معنی کے اعتبار سے ایک ہی قبیل کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ ہمارے ذہین طالب علم نے بھی لفظ درد کو تخلص کے بجائے حقیقی درد خیال کیا۔ اور میر صاحب قبلہ جس نکتے تک پہنچے تھے۔ ہمارا یہ دِلّی کا طالب علم بھی وہیں جا پہنچا۔ اسی کا نام اصطلاح میں "توارد" ہے۔ سچ ہے فیض کا دروازہ قدرت کی طرف سے کبھی بند نہیں ہوتا۔ چکیدن کے معنی چُوس لینا بھی لُطف سے خالی نہیں۔

مطلب (۲) "میں تو غم زدہ ہوں اور تو اشکِ چکیدہ ہے"

ماشاءاللہ کیا منصفانہ تقسیم ہے۔

مطلب (۳) "ضبط میرے کام سے جا چکا ہے اور میں غزل کہنے میں بہت مشہور ہوں"

اشعار کے یہ مطالب کسی تبصرے کے محتاج نہیں نہ دوسرے جوابات کے متعلق کسی اظہار رائے کی ضرورت ہے۔ پانسو طلباء میں سے تقریباً پونے پانسو کے جوابات کا عام انداز یہی تھا۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، دہلی، کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ کیا وہ اس افسوس ناک صورتِ حال کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

عندلیب شادانی

نئے شاعروں پر ایک سرسری نظر

مجھے نئے شاعروں پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔ لیکن یہ "سرسری نظر" ڈالنے سے پہلے شاید یہ بتانا ضروری ہے کہ "نئے شاعروں" سے میری کیا مراد ہے۔ اور اس کے بعد یہ بھی کہ "سرسری نظر" کا مفہوم اس مضمون کی ضرورت کیلئے کتنا محدود یا کتنا لامحدود ہوگا۔ اس تشریح کی صرف ایک وجہ ہے۔ لفظوں کا مفہوم ہمیشہ سے کچھ اضافی سا رہا ہے اور اس زمانہ میں تو لفظ اپنے مدلولوں میں تنگ کیا ہوا مفہوم کھو کر ایک سا مفہوم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے نازک جسموں کو انسانی تجربے نے جن جن بوقلموں ملبوسوں سے ڈھک دیا ہے وہ اب ایک ایک کر کے اتر رہے ہیں۔ اور لفظوں کے ڈھانچوں پر اب نئے "حریر" اور نئے "پرنیاں" کی تہیں چڑھنی شروع ہوئی ہیں۔ کہ ان کی شکلیں پہچاننی بھی مشکل ہیں۔ اور اسی لئے جب کوئی کہتا ہے "نئے شاعر" تو خیال بھی دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ اور نظر کے سامنے بھی ان گنت الجھاوے آ جاتے ہیں۔ "نئے شاعر" کیا حالی اور آزاد نئے شاعر ہیں۔ یا حالی اور آزاد سے آگے اکبر، چکبست اور اقبال یا پھر جوش، اختر شیرانی اور اب سے چند برس پہلے کے مشاعروں کی "رونق بزم" حفیظ جالندھری، احسان دانش، ساغر، روش۔ اس میں شبہ نہیں کہ حالی سے لیکر اقبال، جوش، حفیظ اور روش تک سب (غزل گو شاعروں کو چھوڑ کر) "نئے شاعر" ہیں۔ لیکن یہ زمانہ کسی چیز کو بہت دن تک نیا نہیں رہنے دیتا۔ اب نئے شاعروں کے ایک گروہ نے ہمارے خیال اور ذہن پر قبضہ جمانا شروع کر دیا ہے — فیض، راشد، مجاز، تاثیر، خالد، حاذق، اختر الایمان، جاں نثار اختر، سلام، نظر، جعفری، زیدی اور ان سے بڑھکر میراجی — اب یہ نئے شاعر ہیں جن کے متعلق پڑھے لکھوں میں اور کم پڑھے ہوئے لوگوں میں طرح طرح کی بحثیں ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مجھے انہی "نئے شاعروں" پر ایک "سرسری نظر" ڈالنی ہے۔ اور "سرسری نظر" ڈالنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان شاعروں کی شاعری کے متعلق جو مختلف طرح کی غلط فہمیاں عام ہو گئی ہیں انھیں صحیح نظر سے دیکھا جا سکے۔ اور ان کے تجرباتی پس منظر میں ان کی قدروں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ "تجرباتی پس منظر" میں نے اس لئے کہا کہ اس نئی شاعری کا خاصا بڑا حصہ نئے تجربوں کی گود میں پل بڑھ رہا ہے۔ "نئے تجربے" جب تک ایک روایتی قوت کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ پڑھنے والوں میں غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ اور خود تجربہ کرنے والوں میں شک و شبہ باقی رکھتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں ادب اور فن کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ پڑھنے والوں کی طرف سے جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس کا علاج شاید یہی ہے کہ ادب کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھ کر غلط فہمیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی رکاوٹ کے بوجھ کو ہلکا کریں۔ ممکن ہے نئے شاعروں پر یہ "سرسری نظر" اس بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ نئی شاعری کا خاصا بڑا حصہ نئے تجربوں کی گود میں پل بڑھ رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری کے پڑھنے والے اس میں مختلف طرح کی الجھنیں محسوس کرتے ہیں — خیال کے سلسلہ میں بھی اور بیان کے سلسلے میں بھی۔ انھیں شاعروں کی کہی ہوئی باتیں مہمل اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں ابہام ہوتا ہے۔ شاعروں نے واقعات کی اور محسوسات کی جو تصویریں بنائی ہیں ان میں دھندلا پن ہے۔ اور نظر کو ان کے نقوش کی تہوں اور گہرائیوں تک پہنچنے میں اتنی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ اور تصویر کے نقش کبھی واضح ہو کر سامنے نہیں آتے۔ بات کہنے کے طریقے میں اور تصویریں بنانے کے فن میں بھی اجنبیت ہے۔ نئے لفظ، پرانے لفظوں کا نیا مفہوم، تشبیہوں اور استعاروں کا اس سے بھی زیادہ اچھوتا اور ان دیکھا انداز۔ بیان میں کبھی نہ ختم ہونے والی آزادی۔ بحروں، قافیوں اور ردیفوں کی رسمی پابندیوں سے بغاوت۔ عام خیال اب تک ان چیزوں کا عادی نہیں معلوم ہوتا۔ اسے گھبراہٹ اور الجھن سے بھی زیادہ بوکھلاہٹ ہوتی ہے۔ اور پڑھنے والا جسے انسانی فطرت نے اپنے خیال اور سمجھ کو سب سے برتر سمجھنا سکھایا ہے ان چیزوں کو بے معنی اور مہمل کہتا ہے۔ وہ جذباتی بن جاتا ہے۔ اور جذبات کی رو خیال اور سمجھ کو اور بھی غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔

"نئی شاعری" میں بے شک ابہام ہے۔ لیکن اس کے خاصے حصے میں اس ابہام کا سلسلہ کسی نہ کسی "نئے تجربے" کی کوشش سے ملتا ہے۔ کہیں کامیاب اور کہیں ناکام۔ خیال کے ابہام کی دو تین وجہیں ہیں۔ ہمارے نئے شاعروں نے نفسیات کے بعض نئے [illegible] سے

اور ان تجربوں کو برتنے والے بعض نئے انگریزی شاعروں سے یہ بات سیکھی ہے۔ کہ انسان کا شعور زنجیر کی طرح مسلسل اور مربوط شکل میں عمل نہیں کرتا۔ شعور کی رَو ایک مقرر کئے ہوئے راستے پر نہیں چلتی۔ اور انسان کا شعور اس کے خیال کو اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے کہ اس میں کسی طرح کا ربط پیدا کرنا قریب ناممکن ہے۔ اور اسی لئے جب ادیب یا شاعر انسانی ذہن کی کسی کیفیت کی مصوری کرنا چاہتا ہے تو اُسے بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کی کوئی منزل نہ پہلے سے متعین ہوتی ہے اور نہ بعد میں آسانی سے متعین کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے پڑھنے والا جب کسی کے شعور کی اس بے ربط مصوری کا ادراک کرنا چاہتا ہے تو اس کے فہم و درک کو جھٹکے لگتے ہیں۔ وہ ربط کی جستجو کرتا ہے اور اُسے ربط نہیں ملتا۔ اور یہ اُلجھی ہوئی ڈور اور بھی اُلجھ جاتی ہے۔ شاعری "مبہم" بن جاتی ہے۔ اور وہ اُسے مہمل اور بے معنی کہنے لگتا ہے۔

یہی حال مختلف ذہنی تصویروں کا ہے۔ شاعر کا ذہن ایک تصویر بناتا ہے۔ یہ تصویر اس کے ذہن میں چند اسی طرح کے اور تجربوں کا تصوّر لے آتی ہے اور اس تصوّر کی مدد سے شاعر ایک دوسری تصویر بنا لیتا ہے۔ اس طرح خیال سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک تصوّر خود بخود رینگتا ہوا دوسرے تصوّر کے پیچھے آ جاتا ہے۔ ایک نقش سے دوسرا نقش اُبھرتا ہے۔ اور اس طرح شعور کی اس مسلسل لیکن غیر مربوط رَو کی مدد سے پیدا ہونے والے تصوّرات اور نقوش سے بنی ہوئی مختلف تصویروں سے مل جُل کر ایک نظم تیار ہوتی ہے۔ پڑھنے والے الگ الگ ان مختلف تصویروں کا تصوّر کر لیتے ہیں اور ان کا نقش دل و دماغ پر قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان تصویروں کو ملا کر وہ کوئی بڑی تصویر نہیں بنا سکتا۔ نظم کے الگ الگ ٹکڑوں میں اُسے شاعرانہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ نظم کے مجموعی تصوّر میں ان منفرد تصویروں سے کیا مدد ملتی ہے۔ اور نظم کا مرکزی خیال اور تصوّر کیا ہے۔ نظم کے مختلف ٹکڑوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اسے پوری نظم میں کوئی شاعرانہ حظ نہیں ملتا۔ اُسے اس کے ٹکڑے تو بامعنی معلوم ہوتے ہیں لیکن پوری نظم کا 'ابہام' اُسے بے معنی بنا دیتا ہے اور اسی لئے وہ ساری نئی شاعری کو مہمل کہنے لگتا ہے۔ آپ کو اس نئے نفسیاتی تجربے کی مثالیں نئے شاعروں میں ن۔ م۔ راشد کے یہاں زیادہ ملیں گی۔ پھر اختر الایمان کے یہاں، یوسف ظفر کے یہاں، تبسّم کے یہاں، کہیں کہیں مجاز کے یہاں اور تقریباً ہر جگہ میرا جی کے یہاں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعوری نفسیات کے اس اثر نے ان سب شاعروں کے کلام میں لطافت پیدا کر دی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی نظموں کی خاصی تعداد ایسی ہوگی کہ اگر آپ انھیں ایک دفعہ سے زیادہ پڑھیں گے کہ رفتہ رفتہ ان کا مرکزی خیال آپ کے سامنے آ جائیگا۔ اور اس صورت میں آپ کا جی چاہے گا کہ آپ نظم کو بار بار پڑھیں اور اس میں ہر دفعہ ایک لطف محسوس کریں لیکن اس تعداد سے کہیں زیادہ تعداد ایسی نظموں کی بھی ہوگی کہ جنھیں آپ جتنا زیادہ پڑھیں گے اُن کی اُلجھن بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

شاعری کے ابہام کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ نئے شاعر لفظوں کی دُنیا میں بھی نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ انھیں ایسے طریقوں کی تلاش ہے جن سے پُرانے لفظوں میں تازگی اور شادابی پیدا ہو سکے۔ اور زبان اپنی رسمی قیدوں کی زنجیروں کو توڑ کر نئی راہیں اختیار کر سکے۔ وہ نئے سانچوں میں ڈھل کر نئے امکانات کی روشنی دکھا سکے۔ لفظوں کی نئی شکلیں نئی تصویریں بنا سکیں۔ اور ایک لفظ ذہن میں جیتے ہوئے اَن گنت تصوّرات کا خاکہ ہمارے سامنے لا سکے۔ لفظوں میں یہ نیا پن، تازگی اور شادابی پیدا کرنے کی کوشش، ان کیلئے نئے امکانات کی تلاش، ان میں چھپی ہوئی تصویروں کی جستجو، پُرانی قیدوں سے بغاوت، نئی آزادیوں کی خواہش — ان سب چیزوں نے مل جُل کر خیال کو بعض جگہ اور بھی مبہم بنا دیا ہے۔ لیکن اچھے شاعر اس سلسلے میں واقعی کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ آپ اُن کے لفظوں کے نئے پن سے گھبرائیں نہیں۔ ان میں آپ کو شاعرانہ خوبیاں ملیں گی، معنی کی وسعت ملے گی اور ذہنی تصویریں ملیں گی۔ جو رنگین بھی ہونگی اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلے میں آپ فیض اور مجاز کی شاعری کو دیکھئے اور ان کے علاوہ جذبی اور اختر الایمان کی شاعری کو۔ آپ غور کرینگے تو ان شاعروں کے ان تجربوں میں آپ کو اچھائیاں زیادہ ملیں گی۔ اور بُرائیاں کم۔ ان کی ان جدتوں میں پُرانی چیزوں سے بغاوت کا جذبہ نہیں بلکہ ایک نئے تجربے کی معصوم کوشش ہے۔ اس معصوم کوشش میں ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اور اسی لئے شاید اُن کی کہی ہوئی بات آپ کو اُلجھن میں ڈال دیتی ہے۔

پھر زبان سے آگے بڑھ کر باخیال، نئے اشارے تلاش کرتا ہے۔ اشارے بات کو واضح بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی اُلجھا بھی دیتے ہیں۔ ان سے شاعرانہ لطف بھی پیدا ہوتا ہے معنی میں وسعت اور رنگینی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور انھیں سے ابہام بھی پیدا ہوتا

ہے۔ لیکن اچھے شاعروں کے اشارے آپ کے خیال کو نئی راہیں دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ اسے اُلجھن میں نہیں ڈالتے۔ اشاروں کی دُنیا میں چھوٹا سا لفظ بھی بڑا بن جاتا ہے۔ کوزے میں سمندر سما جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ن۔م۔ راشد نے پُرانے دھندلکے کو چیر کر نئی روشنی دکھائی ہے۔ اور اس نئی روشنی سے شاعری میں چمک دمک بھی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن 'نئے شاعروں' میں آپ کو کچھ ایسے ملیں گے جو ان اشاروں سے سلیقے سے کام نہیں لے سکے ہیں۔ اور اسی لئے نئی شاعری بدنام ہو رہی ہے۔ لیکن آپ میں تو اچھے بُرے کی پرکھ ہے۔ آپ چاہیں تو خذف ریزوں کو چُن کر الگ پھینک دیجئے۔ موتی خود بخود چمکیں گے۔ اور غلط فہمی اور بدگمانی خود بخود کم ہو جائیگی۔

آپ کو پُرانی بحریں پسند ہیں۔ ردیف قافئے پسند ہیں۔ اس لئے کہ ان میں ترنّم اور موسیقی ہے۔ نثر اور نظم کا فرق ہے۔ خیال انہیں کے سانچے میں ڈھل کر دل میں اُترتا ہے۔ اس میں گھنگرؤں کی جھنکار پیدا ہوئی ہے۔ نئے شاعروں پر الزام یہ ہے کہ انھوں نے آپ کی پسند کی ان چیزوں سے بغاوت کی ہے۔ اس سلسلے میں بھی غلط فہمی زیادہ ہے۔ نئے شاعروں میں (میری مُراد ان شاعروں سے ہے جنھیں ہم شاعر کہہ سکتے ہیں) صرف گنتی کے ایسے ہیں جنھوں نے پُرانی بحروں کو چھوڑا ہے یا قافیہ کے ترنّم سے انکار کیا ہے۔ فیض، مجاز، راشد، جذبی، جاں نثار اختر، سلام، مخدوم، جعفری، زیدی، یوسف ظفر سب کسی نہ کسی طرح پُرانی ہی بحروں کو برت رہے ہیں۔ کہیں کہیں ان میں نئے تجربے ضرور ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ابھی تجربے کی ہے۔ اگر یہ نیا تجربہ پُرانی چیزوں میں نئے امکانات پیدا کر سکے تو اس میں بُرائی نہیں اچھائی ہے۔ زمانہ بُرائی کو ختم کرنے میں دیر تو کر سکتا ہے لیکن اندھیر نہیں کر سکتا۔ جو کچھ بُرا ہے وہ بُرا رہے گا اور ختم ہو جائیگا۔

جن نئے شاعروں کے متعلق مجھے کچھ کہنا ہے اُن کی شاعری میں مختصر طور پر یہ سب باتیں ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اور ان سب باتوں کا مصرف اچھی طرح بھی ہوا ہے اور بھونڈے طریقے سے بھی۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جنھوں نے مشرق اور مغرب کے اندار کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اور اس مشرق و مغرب کے میل میں اپنی شاعرانہ اُپج اور انفرادیت سے کوئی نیا رنگ بھر کر کوئی نہ کوئی نئی چیز ہمارے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جن کی آواز میں کسی پُرانے اثر کا پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے کوئی بالکل نیا راستہ بنایا ہے۔ اور کچھ بالکل ایسے ہیں جنھوں نے نیا تجربہ کرنے کی کوشش میں مغرب کی کسی چیز کو اپنانا چاہا ہے۔ اور اُسے اچھی طرح ہضم کئے بغیر اُگل دیا ہے اور اس بدہضمی نے شاعری کی صورت کو بے مزہ اور ناگوار بنا دیا ہے۔ پڑھنے والے بھی اسے ہضم نہیں کر سکتے۔ ایسے شاعر نئے تجربوں کو بدنام کرتے ہیں اور ان کی طرف سے غلط فہمی اور بدگمانی پھیلتی ہے۔ نئی شاعری کی طرف سے بدگمانی اور غلط فہمی کی ذمہ داری ایسے شاعروں پر ہے۔

نئی شاعری میں یہ سب کچھ ہے اور اس کے علاوہ خود شاعروں کے سماج اور ان کے ماحول کا دیا ہوا ابھی بہت کچھ ہے۔ ملک کی سیاسی زندگی کا خلفشار، سماجی اور معاشرتی زندگی کے ناسور اور ان کا پیدا کیا ہوا سیاسی حِس، پھر ادب اور شاعری میں واقعیت اور حقیقت پیدا کرنے کی ادبی تحریک اور اس کے اچھے اور بُرے نتائج، مارکس اور فرائڈ کا اثر، موجودہ زندگی کی غیر مطمئن فضا سے بیزاری اور اپنے اپنے لئے ایک دُنیا کی تلاش، ان سب چیزوں کا اثر ہمارے نئے شاعروں کی شاعری پر ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی۔ ایک روشن مستقبل کا پیامی بھی اور ایک آنے والے بھیانک زمانے سے ڈرانے والا بھی۔ مجموعی طور پر یہ ہے ان نئے شاعروں کی شاعری۔ اور انفرادی طور پر اور بہت کچھ جو ایک کو دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اور ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے الگ سُنائی دیتی ہے۔

آسانی کے خیال سے ان شاعروں کو تین مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ شاعر جنھوں نے فنی حیثیت سے پُرانی ڈگر کو چھوڑ کر ایک نئی راہ اختیار کی۔ اور روایتی اسلوب بیان اور اس کے قالب کو بدل کر شاعری کو نئے قالب میں ڈھالنا چاہا۔ ڈاکٹر تاثیر، تصدق حسین خالد، میراجی، ن۔م۔ راشد اور یوسف ظفر اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان شاعروں کا ہے جنھوں نے گردوپیش کی زندگی اور اس کے مسائل کو محسوس کر کے اس کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی۔ فیض، جذبی، اختر الایمان، سلام اور جاں نثار اختر اس گروہ کے نمائندے ہیں۔ تیسرا گروہ اُن شاعروں کا ہے جن کی نظر زندگی کی تلخ حقیقتوں پر بھی ہے۔ لیکن وہ ان تلخ حقیقتوں کا ذمہ دار اپنے ملک کی سیاسی زندگی اور اس سیاسی زندگی کی پیدا کی ہوئی غلامی کو سمجھتے ہیں۔ ان شاعروں میں مجاز، مخدوم، علی سردار جعفری، اور علی جواد زیدی کے نام پیش پیش ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے متعلق یہ کہہ دینا کہ ان کا تعلق ان تین گروہوں میں سے صرف کسی ایک گروہ سے ہے صحیح نہیں۔ مثلاً ن۔م۔ راشد نے جہاں ایک طرف روایتی اسلوب میں کچھ اہم تبدیلیاں کیں وہاں دوسری طرف اُن کی

شاعری ایک نئے خیال اور نئی زندگی کی رجحان بھی ہے۔ مجاز کا سیاسی حس ان کی شاعری کے خاصے بڑے حصے پر چھایا ہوا ہے۔ پھر بھی انھیں سیاسی شاعر کہنا ان کی شاعرانہ فطرت پر ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ یا علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی کی شاعری کو صرف سیاسی کہہ کر ٹال دینا اُن کے تاریخی حس اور باریک مشاہدے سے منکر ہونا ہے۔ اس نئے زمانے نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ ہر شاعر انفرادی طور پر دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہے جو ہمارے سیاسی اور سماجی محسوسات سے مل کر بنی ہے۔ نہ کوئی شاعر خالص سیاسی ہے اور نہ خالص اصلاحی۔ اور نہ نرا رومان کا دلدادہ۔

ڈاکٹر تاثیر اور تصدق حسین خالد اُردو کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے اب سے تقریباً بیس برس پہلے اُردو میں ایک نئے اسلوب کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اور ان دونوں شاعروں کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آزاد شاعری نے رفتہ رفتہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ تاثیر اور خالد نے ایک ایسے زمانے میں ایک روشِ نو کی طرح ڈالی جب اُردو پڑھنے والے شاعری کے روایتی طریقے پر کسی بنیادی تبدیلی کے خیال کو ایک بغاوت سمجھتے تھے۔ اور اس لئے اس راستے پر چلنے والوں کو 'باغی' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے تاثیر اور خالد نئے دَور کی شاعری کے پہلے 'باغی' اور 'انقلابی' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور ان دو 'باغیوں' میں بھی تاثیر کا نام اور کام ایک نئے ادبی تجربہ کی حیثیت سے اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ فنی حیثیت سے اُردو کی نئی نظموں نے جتنی راہیں طے کی ہیں ان کا سُراغ کسی نہ کسی طرح تاثیر کے فنی تجربوں تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جن میں مروّجہ بحروں کی پوری پوری پابندی ہے۔ اور پھر ایسی نظمیں جن میں بحریں وہی ہیں۔ لیکن ردیف و قافیہ کی سختی سے پابندی نہیں کی گئی۔ اور ایسی نظمیں بھی جو اپنی ہیئت میں مثنوی اور غزل کا امتزاج معلوم ہوتی ہیں۔ پھر اور آگے چل کر ایسی آزاد نظمیں جن میں بحر کے ارکان کو گھٹا بڑھا کر مختلف ٹکڑوں میں مختلف وزن پیدا کئے گئے ہیں۔ جس طرح بحروں ردیف اور قافیوں کے سلسلے میں مختلف طرح کے تجربوں کے لحاظ سے تاثیر ہر منزل پر خضرِ منزل کی طرح ہر جگہ آگے آگے چلتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح لفظوں، ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں کے ایک نئے طریقہ استعمال میں بھی تاثیر نے نئے لکھنے والوں کو نئی راہیں دکھائی ہیں۔ اور ان نئی راہوں میں نیا تجربہ کرنے والے ہر شاعر نے اپنی اپنی پسند اور اپنی فطرت کے مطابق ان نئی راہوں کو نئے نئے گل بوٹوں سے سجایا ہے۔

چونکہ تاثیر کی شاعری اُردو میں برابر ایک نئے فنی طرز کی بنیں ڈال رہی ہے۔ اس لئے پڑھنے والوں کو ممکن ہے اُن کے یہاں فکر و تخیل کے اعتبار سے کسی مرکزی تصوّر کی کمی محسوس ہوتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی فن کے مجتہد کیلئے کسی مرکزی تصور کا پابند ہونا ممکن نہیں وہ تو ادب و شعر کو نئے نئے سانچے دیتا ہے۔ کہ یہ سانچے خیالات کو ایک نیا نہج اور نیا انداز اختیار کرنے میں مدد دے سکیں۔ تاثیر کے اسی نئے نہج، نئے انداز اور نئے سانچوں کی شاعری ہے۔ ان کے بنائے اور دکھلائے ہوئے سانچے شاعروں کے سامنے خیال کو ایک نئے انداز میں پیش کر سکنے کے امکانات پیش کر کے اپنا منصب پورا کر دیتے ہیں۔ تاثیر کی سی شاعری کا منصب فن میں نئے سے نئے امکانات کا پیدا کرنا ہے۔ اور ان نئے امکانات کے پیدا کرنے کی اہمیت میں وہ اس حد تک محو رہے ہیں کہ ان کی شاعری میں اپنے اور غیر کے تخیل کا امتیاز بھی بے حد دُھندلا بن جاتا ہے۔ رومان، سیاست، اخلاق، ان میں سے ہر چیز سے انھوں نے اپنی بزمِ سخن کو سجایا ہے۔ لیکن اس سجاوٹ میں میرے نزدیک اہمیت خیال کو نہیں بلکہ اس کے قالب کو ہے۔ اُردو شاعری میں تاثیر کا نام اسی لئے زندہ رہے گا کہ انھوں نے اسے بہت سے نئے سانچے اور نئے قالب دیئے ہیں۔ فن کے معاملہ میں باغی بن کر دوسروں کو باغی بننا سکھایا ہے۔ اور نئے فن کو اپناتے وقت ہر جگہ اچھے اور بُرے کے امتیاز کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اسی لئے فنی نقطۂ نظر سے اُن کے شاعرانہ تجربوں میں جمالیاتی عنصر کی کمی نہیں۔

تصدق حسین خالد کی شاعری بھی فنی حیثیت سے ایک نئے تجربے کی بنیاد ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء سے اُردو میں آزاد نظم کا نیا طرز رائج کرنے کی ابتدا کی۔ اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک انگلستان میں رہ کر وہاں کی جدید شاعری کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد سے آزاد نظم کو اُردو میں عام کرنے کی تحریک کو اور زیادہ شد و مد سے پھیلانے میں حصہ لیا۔ ان فنی تجربوں میں بھی انھوں نے آزاد نظم کے ان اصول سے بغاوت کی ہے جو کسی نہ کسی طرح اُردو شاعری کے مزاج کے موافق تھے۔ اور اس لئے ان کی آزاد نظموں میں اکثر جگہ پڑھنے والوں کو ترنم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور نظم جس آہنگ و موسیقی کے بغیر نظم نہیں بنتی وہ اس طرح باقی نہیں رہتی۔

آزاد نظم آزاد ہونے کے باوجود فنی حیثیت سے ایک جبر کی پابند ہے کہ وہ جس بحر میں کہی جائے اس کے مختلف مصرعوں میں اس بحر کے ہر رکن کو گھٹا بڑھا کر آہنگ پیدا کیا جائے۔ مثلاً کسی نظم کے ایک مصرعہ کا وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے، تو اس کے باقی مصرعوں میں یہی رکن (مفاعیلن) ایک مرتبہ دو مرتبہ تین مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ یا اس کی محذوف شکل استعمال کی جائیگی۔ اور اگر پڑھنے والا اس کے مختلف مصرعوں میں صحیح ربط پیدا کر کے نظم کو پڑھے تو اس میں اسے وہی ترنم اور آہنگ محسوس ہوگا جو اس خاص بحر کیلئے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر خالد نے عموماً اس مروّجہ طریقے سے انحراف کیا ہے۔ مثلاً ان کی نظم "کتبہ" دیکھئے :-

شیر دل خاں
میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے
مسلسل ذلتیں
جنگ
روٹی
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
ایک لمبی جانکنی
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتاب مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی
یوں کنوارا ـــــ
کیا کہوں!

اس نظم کی تقطیع اس طرح ہوگی :-

شیر دل خاں	فاعلاتن
میں نے دیکھے تیس سال	فاعلاتن فاعلن
لے بہ پے فاقے	فاعلاتن فا
مسلسل ذلتیں	علاتن فاعلن
جنگ!	فاع
روٹی!!	لاتن
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
ایک لمبی جانکنی	فاعلاتن فاعلن
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
آفتاب مصر کے سائے تلے	" " "
میں کنوارا ہی رہا	فاعلاتن فاعلن
کاش میرا باپ بھی	" "
یوں کنوارا	فاعلاتن

کیا کہوں فاعلن

فاعلاتن بحرِ رمل کا سالم رکن ہے اور فاعلن اس کا رکنِ محذوف۔ اس نظم (کتبہ) کا ایک مصرع یا ٹکڑا "سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض" بحرِ رمل محذوف الآخر میں ہے۔ باقی مصرعے یا ٹکڑے ایک یا دو یا تین رکنوں کے آہنگ پر ہیں۔ پھر بھی کئی جگہ شاعر نے یہ آہنگ قائم نہیں رکھا۔ مثلاً نیچے کے ٹکڑوں میں۔ ـــ

پے۔ بپے فاقے	فاعلاتن فا
مسلسل ذلتیں	علاتن فاعلن
جنگ !	فاع
رونی !!	لاتن

ڈاکٹر خالد کی شاعری میں کوئی مرکزی خیال نہیں۔ اور نہ اس کے محسوساتِ پر طلی زندگی کی کشاکشوں کا کوئی نمایاں اثر موجود ہے اس لئے فکر کی حیثیت سے بھی اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نئی شاعری کے دَور میں ایک ایسے فنی تجربے کا نمونہ ہے جو فکری حیثیت سے بھی لوگوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اور شاعرانہ ترنم کے نقطۂ نظر سے بھی۔

"باغی" شاعر کی حیثیت سے نئے شاعروں میں میراجی سے زیادہ بدنام ہیں۔ اور اس سے کم شاید ن۔م۔ راشد۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہیئت اور فکر دونوں کے لحاظ سے انھوں نے قدیم راہوں سے انحراف کیا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے صرف ایک چیز ہے جس کی طرف راشد کی شاعری پڑھ کر ذہن منتقل ہوتا ہے۔ شاعری کے پرانے قالب کو چھوڑ کر ایک نئے قالب کی جستجو ـــ یہ قالب انھوں نے آزاد نظم میں حاصل کیا اور اسی کو اپنا لیا۔ لیکن اس نئے قالب اور نئی ہیئت کو اپنانے میں بھی راشد نے کہیں اردو شاعری کے روایتی ترنم اور اس کی موسیقی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ راشد کی اس شاعری کے علاوہ بھی جو ان کی شاعری کے ابتدائی دَور کی پیداوار ہے اور جس میں اردو کی قدیم روایتی ہیئت کی پابندی ہے۔ ہمیں کسی نظم میں اس ترنم کی کمی نہیں محسوس ہوتی جس کیلئے ہم اپنی پرانی شاعری کی طرف دیکھتے ہیں۔ راشد کی ساری آزاد نظمیں اردو کی دو صد سے زیادہ مروج بحروں میں سے دو کے آہنگ پر ہیں۔

اُن کی مشہور نظمیں شرابی، انتقام، اجنبی عورت، خودکشی، اظہار اور ایک رات میں بحرِ رمل کے ارکان سے کام لیا گیا ہے ـــ اور "بیکراں رات کے سناٹے میں"، دریچے کے قریب، شاعرِ درماندہ، عہدِ وفا، گناہ، زوال اور سیاہی میں دوسری بحر کے ارکان۔ مثلاً شرابی کی تقطیع اس طرح ہوگی :ـــ

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہوگئیں	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
شکر کر اے جانِ کہ میں	فاعلاتن فاعلن
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ ؟	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
غم سے مر جاتی نہ تو	فاعلاتن فاعلن
آج پی آتا جو میں	فاعلاتن فاعلن
جامِ رنگیں کے بجائے	فاعلاتن فاعلن
بیکسوں اور ناتوانوں کا لہو	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
شکر کر اے جاں کہ میں	فاعلاتن فاعلن

ہوں دراز فرنگ کا ادنیٰ غلام　　فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
اور بہتر عشق کے قابل نہیں!　　فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

راشد نے اپنی کسی نظم میں ارکان کے ٹکڑے کر کے انھیں دو مصرعوں میں نہیں پھیلایا ہے۔ اور اسی لئے ان کی آزاد نظموں میں بھی وہی آہنگ اور ترنم حاصل ہوتا ہے جو پابند شاعری میں۔ راشد نے آزاد نظم میں یہ التزام کر کے اردو کے نئے لکھنے والوں کیلئے ایک خوش آئند مثال قائم کی ہے۔ اور اگر آزاد شاعری کے دلدادہ شاعر آزاد نظم کی اس تھوڑی سی پابندی کو گوارا کرلیں تو یہ چیز اس بدنام شاعری کیلئے ایک نیک فال ہوگی۔ راشد کے فن کی یہ آزادی جو آزادی کے مقابلہ میں پابندی سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی شاعری کی صرف ایک خصوصیت ہے جس کے لحاظ سے انھوں نے اردو کو اور بھی کچھ چیزیں دی ہیں۔ ان پرانی بحروں کے ارکان کے استعمال میں راشد نے اکثر جگہ فن کی اس نزاکت کا خیال رکھا ہے کہ نظم کا ایک ٹکڑا دوسرے سے الگ نہ ہو سکے۔ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے اور ایک مصرع دوسرے مصرع سے اس طرح ہم آغوش ہو کہ خیال میں زنجیر کا سا تسلسل پیدا ہو جائے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس کا ذہن بغیر کسی جھٹکے کھائے، خیال کے تسلسل سے ہم آہنگ ہو کر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نظم کے مختلف ٹکڑوں میں یہ ہم آہنگی راشد کی آزاد نظم کی دوسری خصوصیت ہے جو انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں راشد کے یہاں ایک توانا جدّت اور شگفتگی ہے۔ اُن کی شاعرانہ فطرت ہر جگہ پرانے لفظوں میں نئے مفہوم کی تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اسی مسلسل جستجو کا نتیجہ ہے کہ پرانے فرسودہ لفظوں میں نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ ان کے کنائے اور تشبیہیں قدیم اور جدید کا ایک شیریں امتزاج ہیں۔ پرانی محدود تشبیہوں سے ایک زیادہ وسیع مفہوم اور تصور کا کام اور ان سے خیال کے تسلسل میں مدد لینا۔ پھر نئی تشبیہوں سے تصویریں بنانا۔ راشد کے طرز میں یہ چیزیں پسندیدہ مشرقی انداز کے گہرے اثر کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن کنایوں اور اشاروں کے استعمال میں انھوں نے ہر جگہ جدت اور خیال کی گہرائی سے کام لیا ہے۔ اور یہی اشارے ہیں جنھوں نے ان کی شاعری میں ابہام پیدا کر دیا ہے۔ اور اسی ابہام سے عموماً پڑھنے والے گھبراتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر پڑھنے والوں کو راشد کے مرکزی خیال سے واقفیت ہو تو اکثر جگہ اس ابہام میں لطف آتا ہے اور ان اشاروں کے اندر شاعر کی بنائی ہوئی جو بوقلموں تصویریں چھپی ہوئی ہیں وہ نظم کو مبہم بنانے کے بجائے زیادہ واضح اور موثر بنا دیتی ہیں۔ اور یہی تصویریں ہیں جنھیں دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ راشد کی شاعری پرانے طرز سے بغاوت نہیں بلکہ نئے اور پرانے طرز میں ایک خوشگوار سمجھوتہ ہے۔

راشد کی نظموں میں خیال کا جو ارتقا ہوا ہے وہ کسی وقتی جذبے کا اثر نہیں۔ شاعر کی آخری نظموں میں سیاسی احساس کی جو شدت اشاروں کنایوں کے اندر تڑپتی دکھائی دیتی ہے اس کا پتہ لگانا بہت آسان ہے۔ اگر پڑھنے والا نظموں کے خیال کی ارتقائی منزلوں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرے۔ راشد کی ابتدائی نظمیں خالص جذباتی اور رومانی ہیں۔ اور ایک خاص منزل پر آکر پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ شاعر ان جذبات اور رومان کی دنیا سے نکل کر اس دنیا کو گھور رہا ہے جس نے اُسے اپنی طرف مائل ہونے پر مجبور کیا ہے۔

زندگی کاوش بیداری ہے۔ جہاں آدمی آرزوئیں کرتا ہے اور آرزوئیں اس سے گریزاں رہتی ہیں۔ اُسے زندگی سے اپنے دائمی ربط کا شدید احساس ہے۔ لیکن جوں جوں زندگی کی تلخیاں اس کے گرد و پیش چھاتی جاتی ہیں وہ اس سے گھبرانے لگتا ہے۔ وہ زندگی کے اس عہد ماضی کو یاد کرتا ہے جو بہت بلند تھا لیکن اسے اس کے واپس آنے کی کوئی امید نہیں۔

فرنگ سکوں اور ناتوانوں کا لہو چوستے دکھائی دیتے ہیں۔ مغرب نے مشرق کی ابدیت کو لوٹ کھسوٹ کے برہنہ اور ویران کر دیا ہے اور اب اس لٹے ہوئے روحانی مشرق میں ننگے بھوکے جسم، گرسنہ آرزوئیں، مشتعل مزدور، ان چیزوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ انسان ذلت میں ہے لیکن اس کا کوئی مداوا نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس زندگی پر جھپٹ کر اس کا گلا گھونٹ دے۔ لیکن عین وقت پر اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں جھپٹ سکنے کی سکت بھی باقی نہیں۔ وہ اپنی خودی سے مدد لینا چاہتا ہے لیکن وہ مردہ ہو چکی ہے اور اسی لئے اب اُسے کسی ایسی دنیا کی تلاش ہوتی ہے۔ جہاں اُسے زندگی کے اس کہنہ آہنگ مسلسل سے نجات مل سکے۔ وہ بے بس ہو کر زندگی سے بھاگنا چاہتا ہے۔
راشد کی آخری کئی نظمیں اسی خیال کی ترجمان ہیں۔ جن میں مختلف طرح کے کنایوں سے، آزاد تسلسل کے نفسیاتی عمل سے، اور ایک کے بعد

ایک پیدا ہونے والی بے ربط لیکن مسلسل تصویروں سے شاعر نے اسی مرکزی خیال کی ترجمانی کی ہے۔ زندگی سے بھاگ کر اس نے سب سے پہلے محبوب کے ستبر بیابانوں میں، اس کے گرد پہلوؤں یا اس کے ترن رفتار رقص میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جہاں بھی اسے یہی خوف لرزاں رہتا ہے کہ اس پناہ گاہ میں بھی زندگی کسی چور دروازے سے اندر نہ گھس آئے۔ یہ جذبہ "رقص" میں اپنی انتہائی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی زندگی کی بے بسیاں اُسے انتقام پر آمادہ کرتی ہیں اور وہ بے بس ہو کر ایسی حرکتیں کرتا ہے جو کسی توانا ذہن کے قریب نہیں آسکتیں۔ "انتقام" میں اسی شدت یاس کی ترجمانی ہے۔ اور پھر جب ان میں سے کسی چیز سے اس کی تسکین اضطراب نہیں ہوتی تو کوئی پنہاں طاقت اس کی مدد کرتی ہے۔ اور وہ یہ فیصلہ کر کے خوش ہوتا ہے کہ "لگا دوں ایک بے باکانہ جست" اور اس زندگی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دوں لیکن پھر شاید عین وقت پر اُسے افق پر ان ساری دنیاؤں سے زیادہ روشن و تابناک ایک نئی دُنیا نظر آنے لگتی ہے۔ گوشۂ زنجیر میں پھر ایک نئی لرزش، نئی جنبش ہویدا ہوتی ہے۔ اور کوہساروں اور ریگزاروں سے اُسے ندا آنے لگتی ہے کہ اپنے سلاسل توڑ کر چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو چیر ڈالو اور اس ہنگام بادآور کو خیلہ ستجوں بنا دو۔ "رقص، انتقام، زنجیر اور خودکشی" زندگی سے فرار کی چار مختلف تصویریں ہیں جو راشد نے واضح طور پر ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔

راشد کی نظموں میں نئے اشاروں اور نئے حیلوں نے جا بجا بعض اُلجھن بھی پیدا کر دی ہیں۔ اور ذہن پر بار بار زور دینے کے بعد بھی اُن کا دُور کرنا ایک دشوار کام معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ان نظموں میں فکر کی پختگی اور توانائی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں بعض جگہ ان خیالات کے اظہار میں شاعر ہماری تہذیب کی بعض اخلاقی قدروں کا دامن چیرتا اور مذہبی عقیدوں کو مذہبیں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن فن کی حیثیت سے راشد کی شاعری اُردو میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

میراجی نئی شاعری کے سب سے زیادہ بدنام رُکن ہیں۔ اور اس بدنامی میں اُن کی شاعری کی ہیئت اور اس کے موضوع دونوں چیزوں کا برابر کا حصہ ہے۔ میراجی کے ابتدائی دور کی شاعری (یہ ابتدائی دور تقریباً ۱۹۴۰ء کے آخر تک چلا) فن اور تخیل دونوں کے اعتبار سے قدیم روایتوں کی پابند ہے۔ اس میں شاعر نے اُردو کی مروجہ بحروں میں نظمیں کہی ہیں۔ ردیف اور قافیہ کا التزام بھی کیا ہے۔ اور لفظوں کے انتخاب، اُن کی ترتیب اور اُتار چڑھاؤ میں ہر جگہ شاعرانہ ترنم کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ سبک اور نازک لفظ، چھوٹے چھوٹے ہم آہنگ فقرے جن میں نثر کی بے تکلفی اور روانی ہے اور نظم کا زیر و بم۔ خیال کیلئے لطیف اور احساس کیلئے زود فہم۔ ان نظموں میں مناظرِ فطرت کی دلفریبیوں کی طرف شاعرانہ اشارے بھی ہیں۔ اور ہندوستان کے رومان پرور ماضی کی کہانی بھی۔ اور یہی کہانی اصل میں میراجی کا محبوب موضوع ہے۔ انھوں نے خود کو اس روحانی فضا میں اس درجہ گم کر دیا ہے کہ داستانِ فردا بھی اس فضا میں آکر گم ہو جاتی ہے۔ اس دور کی شاعری پر ہندی کے تخیل اور اس کے اندازِ بیان کا گہرا اثر ہے۔ جذبات میں ایک خاص قسم کی نزاکت اور لوچ ہے تشبیہوں پر بھی ہندوستانی تشبیہوں کا اثر ہے۔ جہاں اُسے دامن کی لہریں مسلا مسلا ساگیت دکھائی دیتی ہیں۔ اور رُخصت ہوتی ہوئی رات ڈھلکے ہوئے دوپٹے کا تصور بن کر اس کے سامنے آتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں میراجی خالص ہندوستانی شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس کے بعد کی شاعری کا زیادہ حصہ ایسا ہے جسے شعر کا تصور کوشش کے باوجود اپنا نہیں بنا سکا۔ یہ "آزاد نظم" کی شاعری ہے جس کے زیادہ حصہ میں اتنی آزادی ہے کہ نظم کے ڈانڈے نثر سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس شاعری میں ابہام بھی بہت ہے اور خیالات کی ندرت اور جدت کے باوجود اس کا انداز ایسا ہے کہ اس کا سمجھنا بڑا دشوار کام ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک کا تعلق خود میراجی کی شاعرانہ اور ذہین فطرت سے ہے۔ میراجی ہر چیز میں کوئی نئی بات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے نئی چیزوں کی تلاش میں ان کی نظر بعض ایسی دُور از کار چیزوں پر پڑ جاتی ہے جو ان کے ذہن میں تو صاف اور واضح ہوتی ہیں لیکن پڑھنے والے کیلئے پہیلیاں اور معمہ بن جاتی ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنی نئی شاعری کی بنیاد بعض ایسے اشاروں پر رکھی ہے جن کا لغوی مفہوم تو بالکل واضح اور صریح ہے لیکن ان کے اشارتی مفہوم کی طرف اب تک کسی کا ذہن نہیں گیا۔ اسی لئے ان اشاروں میں جو بات کہی جاتی ہے وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید جب لوگ رفتہ رفتہ ان اشاروں کے عادی ہو جائیں تو کچھ بات بنے۔ ایک اور چیز جس کا تعلق نئے فن سے بھی ہے اور خود میراجی سے بھی۔ آزاد تسلسل کی نفسیات کا

استعمال۔ شاعر کے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے۔ اس خیال کو مرکز اور محور بنا کر وہ اس کے ساتھ آنے والے سارے تصورات کی ذہنی تصویریں بنا لیتا ہے۔ یہ تصویریں بجائے خود رنگین بھی ہیں اور تصور آفریں بھی۔ لیکن ان مختلف تصویروں کو ملا کر جو ایک بڑی تصویر بنتی ہے وہ ان چھوٹی تصویروں کے حسن کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ دیکھنے والا (اس صورت میں پڑھنے والا) نظم میں ایک تصویر کو دیکھتا ہے اور اُسے وہی مسرت محسوس ہوتی ہے جو فن کی کسی اچھی تخلیق سے ہونی چاہئے۔ وہ آگے بڑھتا ہے اُسے پھر ایک دلکش تصویر نظر آتی ہے۔ وہ اور آگے بڑھتا ہے اور ایک تیسری تصویر اس کے سامنے آتی ہے۔ لیکن پہلی دو تصویروں کا نقش اس کے ذہن پر سے غبار کی طرح ہٹتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ پوری تصویر کا مشاہدہ (پوری نظم کا مطالعہ) کر چکنے کے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کہیں کھو گیا۔ نظم کی مختلف تصویروں میں وہ کوئی ربط تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس ربط کی تلاش میں اُسے اپنی دیکھی ہوئی تصویروں کی اصلیت میں بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ میراجی اچھے شاعروں کی طرح واقعات اور محسوسات کی اچھی تصویریں تو بنا سکتے ہیں۔ لیکن اپنی ذہانت کی تیزی میں انھیں اس کا احساس نہیں رہتا کہ ان مختلف تصویروں میں جو باہمی بے ربطی ہے وہ خود ان کے ذہن میں تو ربط بن کر آ سکتی ہے لیکن پڑھنے والا اُسے بے ربطی ہی سمجھنے پر مجبور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میراجی کی بہت سی آزاد نظمیں پڑھنے والوں کے دل پر اپنے مرکزی تصور کا کوئی نقش نہیں چھوڑتیں۔

ایک بات اور بھی ہے جس کی وجہ سے میراجی کی شاعری ادبی بزموں سے زیادہ سماجی گفتگوؤں میں بحث کا موضوع بن گئی ہے۔ میراجی نے باقی ہم عصر شاعروں سے زیادہ، ہندوستانی سماج کے اخلاقی نظریوں کو ٹھکرا کر، اپنی بزم شعر کو آراستہ کیا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اب فن کے نزدیک عورت اور مرد کے جنسی میلانات اور ان جنسی میلانات کی پروردہ ذہنی اور عملی زندگی کو بے باکی کے ساتھ ادب اور شعر کا موضوع بنانے میں اب کوئی حرج باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ چیز بعض پابندیوں کو ذہن میں رکھ کر ادب میں برتی جاتی ہے۔ اور ان پابندیوں میں ایک پابندی سماجی شعور کا احساس ہے۔ میراجی اس لحاظ سے وقت سے بہت آگے جانے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہی دو ایک باتیں ہیں جنھوں نے پڑھنے والوں کے ذہن میں میراجی کی شاعری کی طرف سے ایک طرح کی کدورت پیدا کر دی ہے اور یہ کدورت انھیں شاعری کی لطافتوں کی طرف مائل نہیں ہونے دیتی۔ ورنہ میراجی کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں "شعریت" کے وہ عناصر موجود ہیں جو نثر اور نظم کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

یوسف ظفر نئے شاعروں میں نسبتاً زیادہ نئے ہیں۔ ان کے کلام میں ہر جگہ ایک انفرادیت نمایاں ہے۔ اور یہ انفرادیت ان میں دو چیزوں نے پیدا کی ہے۔ خود اپنی زندگی کی تلخ کامیوں نے اور اس ماحول نے جس میں یہ زندگی پلی بڑھی۔ اس لئے یوسف ظفر جب اپنی تلخی کو محسوس کرتے ہیں تو ان کا ذہن اپنے مادر وطن کی قیدوں تک پہنچتا ہے۔ اور اس سے بھی آگے چل کر پھر عام انسانی قیدیں اس کے خیال کا محور بن جاتی ہیں۔ ظفر کے نزدیک زندگی مجبوریوں کا نام ہے۔ جس میں آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کا ذوق سفر ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ اور اس کے سانس میں جلن، ورنگاہ میں تھکن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اُسے زندگی میں نہیں ملتا اس کی تلاش خوابوں میں کرتا ہے۔ اور یہ تلاش خواب میں روپہلی نغمے بن کر سنائی دیتی ہے۔

ہندوستان مظلوم ہے اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اقوام غالب ان آنسوؤں پر ہنس رہی ہیں۔ اس پر اُبلتے ہوئے خون کے نغمے اُبلتے ہیں لیکن سکوں کی جھنکار میں کھو جاتے ہیں۔ انسان جو زندانی احساس ہے ان چیزوں سے عاجز آ کر شاہ دولت سے کہہ اُٹھتا ہے :-

توڑ دو ہاتھ مرے پھوڑ دو آنکھیں میری
سیسہ بھر دو مرے کانوں میں کہ میں سُن نہ سکوں
سی دو ہونٹوں کو مرے مہر لگا دو ان پر
ورنہ یہ جور و ستم کیسے روا رکھو گے؟

یوسف ظفر کے یہاں طرز میں مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ نظموں میں انگریزی طرز اور قافیوں کے نغمے۔ ان کی تشبیہوں میں ہر جگہ ایک جدت ہے جو اکثر جگہ خوشگوار ہوتی ہے اور کہیں کہیں عجیب۔ یوسف ظفر نے پرانی صفات کو نئے مفہوموں میں استعمال کیا ہے۔

اور کچھ خاص لفظوں سے احساس و تخیل کی گہرائی کے اظہار میں مدد لی ہے۔ ٹمٹماتے چراغ، سرمئی پردے، تاریک اور غیر یقینی سائے، ٹمٹماتے ہوئے تارے، کپکپاتی سی روشنی ـــ ان جیسے لفظوں سے یوسف ظفر نے اپنی نظموں میں ماضی اور مستقبل کے احساسات کی تصویرکشی کی ہے۔ اور زیادہ موقعوں پر پڑھنے والوں کا ذہن ان تصویروں کا اثر محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان کا استعمال اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان اشاروں کا تخیلی اور تصوراتی مفہوم ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ اگر ان کے استعمال کی یہی کثرت رہی تو ان میں تاثیر باقی نہیں رہے گی۔

یوسف ظفر کے تخیل میں تازگی اور طرز میں احساس کے باوجود پختگی اور روانی ہے۔ شاعروں کا ایک گروہ وہ ہے جس کی شاعری تجربے سے زیادہ محسوسات کی شاعری ہے۔ یہاں مادی دنیا کی تصویروں سے زیادہ زور دل کی دنیا کی مصوری پر دیا جاتا ہے۔ اور شاعر جو کچھ کہتے ہیں اپنے دل کی بات سمجھ کر کہتے ہیں۔ اور سننے والے اس بات کو اپنے دل کی بات سمجھتے ہیں۔ یہاں شاعر کی دنیا اور پڑھنے والے کی دنیا کسی نہ کسی منزل پر آ کر ایک ہو جاتی ہے۔ ایسے شاعروں میں نقش فریادی کے مصنف فیض احمد فیض کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ فیض اپنے دور کے ہر شاعر سے زیادہ احساسات کے شاعر ہیں۔ اُن کی نظموں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے سے پہلے کسی مرکزی نظریے یا خیال کی جستجو کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں جو کچھ ہے وہ نظم میں موجود ہے اور شاعر کی طرح کہا گیا ہے۔

تقریباً سارے نئے شاعروں کی طرح فیض کی شاعری بھی نمایاں طور پر دو مختلف دوروں کی شاعری ہے۔ پہلا دور وہی جہاں صرف رومانیت ہے۔ اور شاعرانہ تخیل کا مرکز صرف اپنی ذات۔ شاعر اپنی اکیلی زندگی کا ہمصفیر اور ہمسفر ہو کر ایک نرم اور نازک چال سے زندگی کی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ اس راستے میں اسے کہیں غم جہاں کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو وہ فوراً اُدھر سے نظر ہٹا لیتا ہے۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور وہ محبوب سے مخاطب ہو کر اسی آواز [illegible] طرح اس تک پہنچاتا ہے ع خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو۔ راتوں کی خاموشی میں چھپ کر رونا، بھولی ہوئی یادوں کو سینے سے لگانا، تغافل کے باوجود کسی معصوم قاتل کے بازو کو دعاؤں سے یاد کرنا اور اسی پیار سے زندگی کو زرنگار بنانا یہ اس کی شاعری کے دلچسپ مشاغل ہیں۔

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم　　زندگی زرنگار کر لیں ہم

مستقبل کا تصور بھی اس کے ذہن میں کچھ اس انداز سے آتا ہے ؎

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی　　اپنے دل معصوم کو ناشاد کرو گی

اس کے ماضی اور مستقبل دونوں محبوب کی دلنواز نظر میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن زندگی کی تلخیاں رفتہ رفتہ اُسے اپنی طرف مائل ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ اُسے ان کا احساس ہے لیکن [illegible] جب تک بس چل سکے اُن سے دور رہنا چاہتا ہے ع

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اس رات کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کے اندیشے سے اس کا دل خالی نہیں۔ آخرکار وہی ہونا ہے جس کا ڈر تھا اور ایک دن اُسے محبوب سے کہنا پڑتا ہے کہ ع مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ!

یہاں سے فیض کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جب اپنی تنہا دنیا سے کہیں زیادہ وسیع، اور کہیں زیادہ معنی خیز دوسری دنیا اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور وہ ایک ایک کر کے زندگی کے وہ سارے زہراب محبوب کے سامنے گن کر رکھ دیتا ہے جو اُسے اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ محبت کے سوا اور چیزوں کو بھی کچھ سمجھے:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

شاعری کی یہ منزل ہے جہاں تجربے مشاہدے اور احساس کی پیچیدگیوں سے گھبرا کر شاعر اپنے لئے بیان کی ایک راہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی منزل ہے جہاں آکر بہت سے بھٹک جاتے ہیں۔ فیضؔ نے اس منزل پر اپنے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس نے انھیں شاعروں میں ایک منفرد جگہ دے دی ہے۔ روایتی اسلوب سے تھوڑا سا انحراف، بحروں کے انتخاب میں موثر سلیقہ، خیال کی رفتار میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تیزی۔ اردو کے پرانے استعاروں (خزاں، بہار، گل، گلچیں، ساغر، شراب، ساقی، قفس، دشت و زنداں، چاکِ گریباں اور جوش جنوں) سے نئی تصویروں کا کام۔ دو تین لفظوں سے پڑھنے والے کے ذہن میں ماضی کے نقوش ابھارنے کا فن۔ اور ان سب چیزوں میں ملی جلی رنگینی۔ یہ فیضؔ کے طرز کی خصوصیات ہیں اور اس طرز نے انھیں بعض ایسی نظمیں دی ہیں جن سے نئی شاعری کے نئے تجربے میں پختگی اور ہمہ گیری کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایسے مصرعے ہیں جن سے تصور ایسی تصویریں بنا سکتا ہے جو طویل سے طویل نظموں سے بھی ممکن نہیں ع

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

یا اُن کی مشہور نظم "تنہائی":

"پھر کوئی آیا دلِ زار، نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا"

فیضؔ کو مختصر لفظوں سے پڑھنے والے کے ذہن میں گزرے ہوئے زمانے کی یادوں کا ایک پختہ تاریخی تصور پیش کرنے پر جو قدرت حاصل ہے نئے شاعروں میں کسی اور کو نہیں۔

فیضؔ نے اپنی نظموں میں اپنے زمانہ کی جس کشاکش کی ترجمانی کی ہے، اس میں دھن، دولت، غریبی، امراض، بازاروں میں دردوں اور غریبوں کا بکتا ہوا گوشت اور لہو بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس غلامی کا شدید احساس بھی جس میں فکر محبوس ہے اور گفتار کے

پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ اُس کے دل میں اِن سب چیزوں کی طرف سے ایک بے چینی (بغاوت نہیں!) پیدا ہوتی ہے اور وہ اس سارے غم کو اپنانا چاہتا ہے ؎

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں

لیکن شاید یہ تدبیر کارگر ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔ اس لئے فکر ایک نیا راستہ تلاش کرتی ہے ؎

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا!

محسوس کرنے والے شاعر کے پاس اس کے سوا اور علاج ہی کیا ہے؟

فیضؔ کی آزاد نظموں پر بھی لوگوں کو فنی بے راہ روی کا اعتراض ہے۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ اگر آزاد نظموں کی بے راہروی 'موضوع سخن'، اور 'تنہائی'، جیسی نظمیں پیدا کر سکے تو خدا سب نئے شاعروں کو بے راہرو اور گمراہ کردے۔

اسی مفہوم میں ایک اور 'گمراہ' اور 'بے راہرو'، شاعر معین احسن جذبیؔ ہیں۔ جذبی نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں یا غزل نما نظمیں۔ اور اس 'قدامت پسندی'، یا 'رجعت پسندی'، کے باوجود وہ اُردو کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی وہ ابتدائی غزلیں بھی جن پر ہماری زندگی کے خارجی حالات کا عکس موجود نہیں، ایسے جذبات کی حامل ہیں جو صرف ایک کے نہیں بلکہ سب کے ہوتے ہیں اور اسی لئے ان غزلوں میں صداقت اور خلوص ہے۔ غمِ عشق بھی ہے اور خودداری اور بلند نظری بھی۔ ناکامیاں اور مایوسیاں ہیں۔ عاشق ہمیشہ کی طرح اب بھی ضبط سے کام لیتا ہے لیکن اس کی وجہ میں ایک بلند نظری اور ارادہ کی مضبوطی ہے ؎

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبیؔ خلشِ غم بڑھا رہا ہوں میں

غزل کے مضامین میں تنوع ہونا ضروری ہے۔ جذبی کے یہاں بھی یہ تنوع ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جذبات پر کہیں کہیں عقل کی پاسبانی بھی نظر آتی ہے۔ اور اسی لئے ان کی غزلوں میں ماضی کا ذکر گذرے ہوئے رنگین لمحوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ حال کے ذکر میں نغمہ و آہنگ ہے اور مستقبل آرزو کا ترجمان۔ ان میں اشارے کنائے پُرانے ہیں لیکن فرسودہ نہیں شگفتہ۔ ساحل اور منزل جذبیؔ کے بہت محبوب اشارے ہیں۔ اور ان کے ذکر میں پڑھنے والوں کیلئے ہر جگہ ایک نیا پن ہے۔

گر اپڑتا ہوں کیوں ہر ہر قدم پر الٰہی آ گئی کیا پاس منزل
جہاں تک آخری نظریں تری مشکل سے پہنچی ہیں وہی منزل کی حد ہے خواب منزل دیکھنے والے
کاٹ دی یوں ہم نے جذبیؔ راہ منزل کاٹ دی گر پڑے ہر گام پر ہر گام پر سنبھلا کئے
اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

خود جذبیؔ کی شاعری میں بھی آخر میں وہ دور آ گیا جب انھوں نے ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرنے کے بجائے موجِ بلا کے تھپیڑوں میں لذت محسوس کرنی شروع کردی۔ بھکارن کی بے بسی سے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کیلئے مئے ناب تلخیٔ زہر بن جاتی ہے جنبشِ مضراب سے شرارے اُٹھتے ہیں۔ سینۂ مہتاب میں داغِ دریوزہ گری چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ مفلس کے تبسم سے اسے فاقوں کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور توپوں کی گرج سن کر اس کا جذبۂ بیدار عزتِ مظلوم کی بیداری کیلئے تڑپنے لگتا ہے۔ حسنِ فطرت کو دیکھکر اس کے دل میں مفلس کے جذبات کا تلاطم پیدا ہو جاتا ہے

دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجھ کو مبارک ہو لیکن
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی چکراتی ہے منجدھاروں میں

وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں، کیسی زہرہ، کیسی پروین
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

جذبی کی شاعری نئے دَور کے اس رُجحان کی ترجمانی اور نمائندگی کرتی ہے جس میں شاعری کی ہیئت کچھ بھی ہو۔ خیالات اور محسوسات کا انداز تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک سا ہے۔ نئی شاعری میں غزل بھی موجودہ زندگی کی سیاسی اور سماجی کشاکش سے اسی درجہ متاثر ہے جیسے پابند نظم یا آزاد نظم۔ اب غزل میں بھی سرمایہ کی ضربوں اور نوبوں کی گرج سنائی دینے لگی ہے۔ اور یہ چیز غزل کو سب سے پہلے جذبی نے دی ہے۔ (باقی آئندہ)

سید وقار عظیم ایم اے

نغمۂ زندگی

پھر ایسے خیالات آنے لگے
کہ ہم خود بخود گنگنانے لگے

ہمارا تمھارا عجب حال ہے
نظر مل گئی مسکرانے لگے

جوانی کی اللہ رے سرشاریاں
قدم خود بخود ڈگمگانے لگے

مری قدر شاید کہ ہونے لگی
مرے سر کی قسمیں وہ کھانے لگے

ہنسی ان کے ہونٹوں پہ آنے لگی
ذرا ہم جو باتیں بنانے لگے

اندھیرا اندھیرا سا چھانے لگا
مرے پاس سے جب وہ جانے لگے

یونہی عمر گذرے گی امید میں
وہ کاہے کو تشریف لانے لگے

مری شاعری کا صلہ مل گیا
مرے شعر وہ گنگنانے لگے

اکیلے میں گاتے تھے میری غزل
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے

ترا روٹھنا ہے یہ بے سود ہی
تجھے کیوں وہ فضلی منانے لگے

فضل احمد کریم فضلی

چلے دلّی کو!

(۱)

ان دنوں ریل کا سفر دہلی کسی تیسرے یا منجھلے درجے میں کچھ اسی مزاج کے پر خور بیٹھتا ہے جس کی ہڈیاں پسلیوں کے بدلے فولاد کی سی ہوں اور جسم کے جوڑ بند میں ریل پیل کے سیسہ بھر گیا ہو۔ پھر ایسے پُر زہر مسافر کو راس آتا ہے جس سے پیسے میں واجبی کرایہ دینے کے ساتھ ساتھ ما لوجیوں کے حق حقوق ادا کرنے کی صلاحیت بھی پائی جائے۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ بیچارے مسافر کا ٹوٹا ڈھانچہ تو ریل پہ لد لیا۔ اور آتما ٹکٹ گھر کی کھڑکی پہ منڈلاتی رہی یا جسم پلیٹ فارم پر رہا اور روح منزل مقصود کو پہونچ گئی۔

بعد اس تمہید کے،

نیت کرتا ہوں میں سفر کی، منہ میرا طرف دلّی کے۔ بسم اللہ مجریہا!

سواری کی مدیں جو اکّے ہیں جن کے بل پہ سارا قصبہ چلتا ہے۔ انہی میں سے دو چار وہ دیدار عدد ہیں جنھیں ریل پہ جانے کا دوامی حق حاصل ہے اور ان کی تعریف یہ ہو کر کہ ان کا ماننے کیلئے درجن گنیں کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ شکل و صورت اور ہیئت کذائی کے اعتبار سے اگر ان کی "اکیت" کا ثبوت درکار ہو تو قبلہ معلّم ثالث کے ٹھور تک ٹھہرنا ہوگا۔ تم اعتراف کے بازی کے فن میں نیاز مندہی بیاز مند ہے۔

یہ اکّے قانونِ حرکت کے عام اصول سے علاوہ ایک مستثنیٰ قاعدے کے تحت چلتے ہیں یعنی آپ ایک ایسے اکّے کا تصور کریں جس کے دونوں پہیّوں میں "ایک اور نوں" کی نسبت ہو۔ پھر ان بولنے دو پہیوں کی حرکت دور ان کو موں کے واسطے سے ایک ٹٹو تک منتقل کر دیں۔ جو بیچ عیب شرعی کے سوا پنجاہ عیب غیر شرعی بھی رکھتا ہو۔ چابک اور ٹکاریوں کی پوری گردان کا جواب پہلے جھرجھریوں اور دولتیوں سے دے۔ پھر چلے تو اس حساب سے کہ اگلے قدم جتنے بڑھیں اس سے سوائے پچھلے گھٹیں۔

راستے میں اودوائن یا پرانی تو اڑ کا مرکب ساز ٹوٹتا جائے تو اس کا ماتم بھی ٹٹو ہی اٹھائے۔

ریل کی دوا کچھ ہاتھ پاؤں کی ٹوٹ پھوٹ کا خیال کہ اکّے کی سواری کو ہم نے پار اور گھر سے اسٹیشن کے درمیانی دو میل اپنے پیروں چلنے پر کنبہ برادری نے متفقہ صاد کیا۔

ٹائم ٹیبل کے مطابق سو تین کے بعد کسی وقت بھی ریل کے آنے اور معتبر راویوں کی سند سے جدا لانے چاہا تو آج ٹھہرنے کا بھی امکان تھا۔ اس لئے احتیاطاً بارہ بجتے ہی گھر کو خدا حافظ کہا۔ ورناروں کی چھاؤں میں ہمارا قافلہ اس ترتیب سے اسٹیشن کی جانب راہی ہوا۔ آگے آگے بکھا قوم چمار، ہاتھ میں لالٹین، پیچھے رمدیتا، داب بغل سر پہ صندوق، پھر للتا پاسی، بغل میں بستر، اس کے بعد خود بدولت، یعنی ہم بہ نفس نفیس ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیا ٹوا، دوسری مٹھی میں ٹکٹ کے دام، اور کچھ ریزگاری بطور حفظ ماتقدم۔ ہمارے نقش قدم پر میاں خاں زماں خاں پٹھان، [illegible] کے نہ در کوتل جو ن ا

تو رات سے کہ کھیتوں کی ہری ہری بو سے مست ہو کر جھینگروں کی جھنکار اور مینڈکوں کی ٹرٹر سے برسات کی رُت بول رہی تھی۔ جگنو چمک رہے تھے اور پچھلے پہر کی پُر نم فضا میں پُر خاموش جلوس رواں تھا۔ جو اندھیری رات کے اس سفر پر ایک سہمی ہوئی سی روشنی دکھائی دی۔ ساتھ ہی لال لال دیدوں کا سفید سگنل اور قصبے کا عرصہ مُو اسٹیشن نمودار ہو گیا۔ ہم نے دل کھڑکا کھڑے عدہ شکر ادا کیا کہ ہمارے سفر کی اوّل منزل کسی سانحے یا ماجرے کے بغیر کٹ گئی۔

اسٹیشن میں ہم اور ہمارے جلوسیوں کے سوا باقی سناٹا تھا۔ البتہ مٹھائی کے خالی دونے پر سر رکھے ایک چت کبرا البنڈی ضرور پڑا تھا۔ شاید یہ اسٹیشن ڈیٹنگ روم کیلئے ناموزوں ہے با [illegible]

کیپٹے ڈیننگ روم سے محل ، ناچار تیسرے درجے کے مسافر خانہ میں اناج کے بوروں پر رجمان ہو نا پڑا ۔ اتنے میں کہ ع دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔ چاک نارگھر کا دروازہ کھلا اور سنائی دیا کہ جیسے کسی بھیڑیے کے ٹرد ھڑ کے نیز خرخرے سے "چور چور" نکل ٹرین کی چھت پر نکل رہا ہو ۔ اس ہنگم صدا کے ساتھ دونوں چمار بوروں کی آڑ میں سرک گئے ۔ پٹھانوں نے ٹھسّے سنبھالے ، بتی چاق کر کے دیکھا تو لمبی ہوتی جھنڈیاں تانے پیٹ کی آڑ میں مالوی گھڑے بید کی طرح کانپ رہے ہیں ۔ جسم کے فوری سکڑ جانے سے دھوتی کی بندش کمر سے کھسک کر پنڈلیوں پر جا پڑی ہے اور اس کی تہوں میں سے پانی کا ایک سانپ سا نہ جانے کہاں کا نکل کے فرش کے ڈھالوان کی طرف بھاگا جا رہا ہے ۔

"گھنٹہ مارو ۔ سواری گاڑی چھوڑ" ۔ لیکن جمادار ہوا نیند کے سبھاؤ میں یہ سمجھ میں آیا کہ مرغ سحر ریل کی گھنٹہ میں بانگ دے رہا ہے ۔ حواس جاگے تو ریل کی آمد تھی ۔

"دلی کا ایک تھرڈ کلاس بابو جی !"

"تھرڈ کلاس ختم"

"ڈیوڑھے کا ؟"

"بنانا پڑے گا ۔ کتاب بند ہے ۔ اور چابی بڑے بابو کے پاس "

"سکنڈ کلاس ؟"

"ریزرو آرہا ہے"

"اور فسٹ ؟"

"لائیے سولہ آٹھ آنے"

ٹکٹ پر تاریخ مار کر بابو جی نے دام دیکھے تو دس دس کے دو نوٹ !

"اب باقی کے ساڑھے تین کس کے گھر سے لاؤں ؟ کیش بک برتو مُہر ہو چکی ۔ چلئے گاڑی آ گئی "

اس کھینچا کھینچی میں ریزگاری والی مٹھی ڈھیلی پڑی اور اندھیرے میں چار پانچ چونیاں سرک گئیں ۔ مال موذی تو نہ تھیں ، ہاں نصیب غازی ضرور ہو گئیں ۔ اتنے میں پہلی سیٹی ہوئی ۔ اور بابو جی یہ کہہ کر کہ "خیر واپسی میں دیکھا جائیگا" کھڑکی میں جیتی لگا کے نکلے اور پلیٹ فارم کی دسعوں میں غائب !

بس تو جیسے ذرا تاباہر ہونے کی دیر تھی اندھے سے اندھا بھی وہاں لے کر سر کے گارڈ لوگ کی دردمندی اس حالت میں کہ یہاں سے ۔۔۔ تک ۔۔۔ پلیٹ فارم کا دوسرا نام ظلمات ہو ہمارے لئے سنگ آمد سخت آمد تھا ۔ رہا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ وہ محض برائے بیت !

اب خاں صاحبوں کی پٹھائی دیکھنے کی چیز تھی ۔ جنھوں نے خالص پانچ فٹ کے آدمی کو جلدی جلدی تہ کر کے بچی بنایا ۔ اور ایک "ہاستو" کے ساتھ چھوڑ دے ۔۔۔ جو پھینکتے ہیں تو ایک درجے میں ہم ایسے گئے جیسے گوپھن کا پتھر ، اور پرے صدق الفجر پسنجر ریل چل دی ۔

بڑے بڑے ایسا ۔۔۔ یا دیکھ کر ہمیں خیال آیا کہ دودھ والے نہانے کی عادت ۔۔۔ ان بڑی لوٹھیوں کو اپنی ذمہ داری ، یا موقع ۔۔۔ کا مطلق احساس نہ تھا ہونا ۔۔۔ جو بیچے میں خاں صاحبوں سے ہمیں ۔۔۔ کیا تھا اس ۔۔۔ نازل کی جگہ دودھ کے بکسے کلسے ۔۔۔ اور ہم ۔۔۔ کی اعانت میں سر سے پاؤں تک بسے پڑے تھے !

سل پر میل ، کھاتی ہوئی ریل فراٹے بھرتی جا رہی تھی ۔ اوپر گھرگھر بادل بچے کالے ہو رہے ۔ ۔۔۔ میں نار کے کھمبے جائیں بائیں کرتے آتے ، اور گھومنے لگتے آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ۔ اگلے جنکشن پر ریل کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی بدلنا تھے ۔ اور ہم سوچ رہے تھے کہ نئی ریل کا سفر کس بھیس میں ہو ۔ فسٹ کلاس کا ٹکٹ سوٹ پر مُصر تھا ۔ وقت کا کہنا کہ ہاں اب تو لنگوٹا بھی بہت ہے ۔ دروازہ کھلا ۔ اور ایک چمرخ سا کالی ذات کا صاحب درجے میں گھسا ۔ یہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں ۔ چار پانچ خالی کلسے اوندھے منہ پڑے تھے ۔ جو رہ گئے تھے وہ بھی ٹکرا ٹکرا کر ہلکے ہو رہے تھے ۔

"او ڈیمٹ ، ایک دم بالکل گلیچ !"

انگریزی میں گالی ، معاذ اللہ ! جی میں تو آئی کہ ستوں اور ایک کے دو منہ کر دوں ۔۔۔ بہرطرح دی اور صفائی میں اپنا ٹکٹ دکھا دیا ۔

ٹکٹ دیکھا تو صاحب کے ذرا تیور بدلے "وساری۔ ہیرا تمھارا اسباب کدھر جاتا ؟"

"صاحب فی الحال ٹکٹ ہمارا سے بابو جی!"

جل گیا بابو جی کہنے سے۔

"یہ فرسٹ کلاس کا ہے۔ فرام ——— ٹو ——— مالم ؟"

"جی مالم۔ اور یہ بھی مالم کہ بیس روپئے کا ہے"

"وو روپیہ اور نکالو۔ فرسٹ کلاس کا پنجر تھرڈ میں جانے نہیں سکتا۔ کم آن، فوروہیز!"

"شٹ اَپ پلیز" ہم نے انگریزی کے مارے لال پیلے ہوکر کہا" اور بولے گا تم انگریزی۔ ہم انگلش میں کالج پاس ہیں ہم، مالم؟ ہم کو سب قاعدہ قانون ازبر ہے، جاؤ جنکشن پہ دیکھیں گے"

ریل اب آہستہ آہستہ ایک بلندی پر رینگ رہی تھی۔ جنکشن دکھائی دے رہا تھا۔ کٹ لٹ لٹ! یہ قینچی آئی پٹری بدلی کٹ کٹ کٹ، وہ قینچی آئی اور ریل ٹھہر گئی۔

"بے ٹنگ روم میں نہ جائیے بیٹو تم۔ ہُواں گورن کی سمائی ہے۔ کونو ایک ڈگ دھرد یہے پر ان نکس جہیں۔ ہم تم کاکوان کے نگیچ چھانٹے دیت ہیں۔ لیٹو پوٹو۔ مجے سے کلادتوں کرو۔ ڈلی کیرا کیپر نیس آئے بریاہم تم کا نے جائے کے چڑھا دیبا۔ روپیا ایک لگہے، جانیو"

سر پہ اسباب لادتے ہوئے پوربئے قلی نے ہمارے حکم کی تعمیل میں فرمایا۔

بہرحال دلّی تو ابھی دُور ہے۔ اتنے میں کپڑے بدل لیں۔ اللہ! اس جنکشن پہ آبرو رکھ لے اور ساتھ خیریت کے وہاں پہنچائے پھر کوئی بات ہو۔

آوارہ کا

ایورسٹ

— دیکھ خود اپنی ہی آنکھوں سے
سوچ کہ تو نے کیا دیکھا ہے — ؟
— جس پر اتنا ناز تھا تجھ کو
وہ وادی سنسان پڑی ہے
دُور — پپیہے چیخ رہے ہیں
سامنے اک دیوار کھڑی ہے —!!
— دیکھ فلک کے ایوانوں سے
بزمِ جہاں میں آگ لگی ہے
دیکھ ترے ماتھے کی بندی
اس گرمی سے چھوٹ رہی ہے —!!
— تیرے راجاؤں نے اب تک
اپنے پاپ سے دُور ہی رکھا۔
تیرے دیوتاؤں نے اب تک
تجھکو بھی مغرور ہی رکھا —!!
آج کہ تیری آنکھ کھُلی ہے
دیکھ زمانہ کیا کہتا ہے
دیکھ خود اپنی ہی آنکھوں سے
سوچ کہ تو نے کیا دیکھا ہے —؟!!

سلام مچھلی شہری

چھٹی

نسیم کو آج دفتر نہیں جانا تھا آج چھٹی تھی اور یہ کم بخت دن بہت انتظار کرنے کے بعد آیا تھا۔ تو ہاں نسیم کو آج چھٹی تھی اور وہ ابھی تک بستر پر لیٹا ہوا جمائیاں لے رہا تھا حالانکہ اس وقت تک وہ عموماً غسل سے بھی فارغ ہو جایا کرتا۔ غسلخانے میں نل چل رہا تھا اور پانی ٹب میں گر رہا تھا، اور آج پانی کے ٹب میں گرنے کی آواز بھی کسی ساز کی دلنواز آواز معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ عام طور پر اگر صبح صبح نل کی آواز کان میں پڑتی تو نسیم کا پارہ فوراً چڑھ جاتا۔ بستر سے ہی ایک گرج سنائی دیتی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں سونے سے پیشتر نل نہ کھلا رہنے دیا کرو۔"

"دن بھر دفتر میں چکی پیسنے کو مر کھپ جانا ہے۔ اور یہاں گھڑی دو گھڑی آرام سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

کچھ دفعہ کے بعد۔

"استغفر اللہ! مرد غریب کی بھی کیا زندگی ہے۔ کام! کام! کام! صبح بھی کام، شام بھی کام۔ جب تک زندہ رہو کولھو کے بیل کی طرح کام کرو۔ اور گھر کے دھندے کرو۔ نہ چین نہ آرام!"

اب اگر نسیم کی بیوی نکہت نے اٹھ کر نل بند کر دیا تو خیر ورنہ گرجنے کے بعد یہ طوفان خود بخود تھم جاتا اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ نسیم کو نکہت سے محبت تھی۔ نکہت حسین تھی تعلیم یافتہ تھی اور مرد کی نبض شناس تھی۔ شوہر کے آرام کا بہت خیال رکھتی لیکن تھی پابندِ صوم و صلوٰۃ اور یہی ایک بات میاں نسیم کو ناپسند تھی۔ مذہب کا احترام تو وہ بھی کرتا۔ پانچ نمازوں میں سے ایک صبح کی نماز تو وہ بھی کوئی پونے آٹھ بجے ضرور پڑھ لیتا۔ نسیم صرف اس قدر چاہتا تھا کہ جب تک وہ گھر میں ہو نکہت بس اسی کی طرف متوجہ رہے۔

اس کا روز کا پروگرام یہ تھا صبح اٹھ کر حجامت بنانا غسل کرنا پھر چائے پینا۔ اخبار دیکھنا۔ کھانا کھایا کپڑے بدلے اور بائیسکل پر سوار ہو کر دفتر کی راہ لی۔ اِدھر نکہت صبح اٹھتی تو دریافت سے فارغ ہو کر غسل کرتی۔ نماز پڑھتی اور کچھ دیر قرآن مجید کی تلاوت کرتی۔ اور اس کے بعد میاں نسیم کے دھندے، اور میاں نسیم جنہیں دفتر جانے کی جلدی ہوتی نل رات کھلا رہا تو گرج رہے ہیں۔ کھڑکھڑاہٹ سے نیند اچاٹ ہو گئی اور جو بند رہا تو برس رہے ہیں۔ ماما غریب پر شامت ہو رہی ہے۔

"بھئی اس ماما کم بخت نے بہت پریشان کر رکھا ہے ہزار بار کہا لاکھ بار سمجھایا کہ نیک بخت نل کھلا رہنے دیا کر، صبح پانی گرم ہوتا ہے غسل کرنے میں لطف آتا ہے لیکن یہ اللہ کی بندی کب کسی کی سنتی ہے اس پر تو آسمان سے کوئی صحیفہ ہی اترے تو مانے گی!"

ماما چونکہ میاں کی عادت سے واقف تھی چپکی بیٹھی کام میں لگی رہتی۔ نکہت چائے بنا کر لاتی۔ نوکر باہر سے اخبار دے دیتا۔ اب آپ چائے بھی پی رہے ہیں اور اخبار بھی دیکھ رہے ہیں۔ اور بیوی سے کسی سیاسی مسئلہ پر کچھ گفتگو بھی ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں اگر چائے ٹھنڈی ہو جاتی تو آپ بیوی سے کہتے "نکہت! ذرا اس نیازمند کی طرف بھی کچھ توجہ فرمایا کیجئے یہ گھر کے دھندے تو قیامت تک بھی ختم نہ ہوں گے۔"

نکہت جواب دیتی۔ "میں کوئی بیکار تو بیٹھی نہیں، آپ ہی کا کام کر رہی ہوں۔ دیکھتے نہیں آپ کے کوٹ کے شکن نکال رہی ہوں۔"

"بھئی!" آپ شکوے کے طور پر کہتے "ہمارا کام کیا خاک ہو رہا ہے۔ اتنا تو دیکھ لیا ہوتا کہیں چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔ شام تک تو پھر نصیب نہیں ہوتی۔"

"لیکن آپ ایک وقت میں دو کام کریں کیوں؟" نکہت جواب دیتی۔ "پہلے چائے پیجئے۔ پھر اطمینان سے اخبار پڑھئے۔ لائیے! میں دوسری پیالی بنا دیتی ہوں۔"

نکہت میاں کی پیالی منہ سے لگا کر ایک گھونٹ چائے کا پیتی اور مسکرا کر کہتی "چائے تو کافی گرم ہے۔ جانے آپ کا دھیان کہاں ہوتا ہے۔"

"تمہیں معلوم نہیں!" نسیم بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے

پوچھنا نگہت بھی میاں کی طرف نسدا کر دیکھتی اور یہ مرحلہ بھی ان کی جرح و بحث کے ساتھ ختم ہو جاتا لیکن اب ... دو میاں نسیم کا سارہ کچھ زیادہ خرچ جانا چائے پینے کے بعد ختم ہی ... ورنہ جانے میں کھڑا مالی سے باتیں کر رہا ہے اور اس کے ہر کام کی اصلاح ہو رہی ہے۔ کہیں نوکر کے پاس کھڑا بائیسکل صاف کروا رہا ہے۔

ابے دیکھ تو ! ہاتھ گارڈ کتنا گندا ہو رہا ہے۔ کبھی بائیسکل بھی پالش کر دیا کرو۔" کم بخت ! کبھی تیل بھی دیا کرو۔" اور کبھی "شاباش! آج تو بائیسکل خوب چمک رہی ہے۔" ڈرتی لگتا ہے کوئی ناسمجھ کر اٹھا نہ لے جائے۔ اور کبھی نگہت کے پاس ڈریسنگ روم میں کھڑے ہیں اور محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ "نگہت ! یہ کیا؟ ناخنوں پر کیوٹکس تو لگا لیا کرو۔" "تم ہمیشہ نیچرل کلر کا پوڈر ہی لگاتی ہو کبھی پنک کلر لگاؤ تو رخسار کا رنگ اور بھی کھل جائے۔" "لاؤ ادھر لاؤ ! ہم خود کنگھی کریں گے تمہارے بالوں میں۔" اور نگہت کے بالوں میں کنگھی کرنے کی بجائے اپنے بال بنانے لگتے اسی طرح بہت سا وقت ضائع ہو جاتا۔ پھر چانک "ماما ! ہمارے بابا کا دفتر نہیں، جب چاہا چلے گئے۔ سرکاری دفتر ہے دس بجے کو ہیں اور کھانے کی خبر نہیں۔" "ارے بابا ! کچھ تو لے آؤ۔" "استغفر اللہ! کیا ستا منہ ہے کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"نگہت ! تمہاری ماما نے جان عذاب میں کر رکھی ہے۔"

"نگہت ! کچھ تمہیں بھی فکر ہے۔"

اور نگہت ہنس کر کہتی "آپ کی سجانے میں دفتر چلی جاؤں۔"

اور نسیم نے کہا "تم کیوں جاؤ لیکن ہمارے جانے کا تو انتظام ہونا چاہیئے۔"

نگہت جواب دیتی "کپڑے آپکے نکال رکھے ہیں۔ بائیسکل تیار ہے۔ کھانا کھایئے اور سدھاریئے دفتر کو۔"

نسیم کھانا کھا چکتا تو نگہت خود کپڑے پہناتی۔ میاں نسیم گھر سے نکلتے نکلتے بھی دو ایک بار آئینہ ضرور دیکھ لیتے۔

لیکن آج تو چھٹی ہے، نہ دفتر کا فکر نہ تیار ہونے کی جلدی، نہ صبح صبح غسل کرنے کی حاجت آج تو پورا دن اپنا تھا نسیم پلنگ پر لیٹا ہوا کبھی اِدھر کروٹ بدلتا کبھی اُدھر۔ کبھی آنکھیں کھولتا کبھی بند کر لیتا۔ پھر لیٹے لیٹے دن کا پروگرام بنانے لگتا۔

تو خیر! آج کا دن تو اپنا ہی ہے۔ بازار بھی بند ہوں گے اور نگہت کی بھی یہ لاؤ اور وہ لاؤ کا خدشہ نہیں۔ آج تو گرم پانی سے غسل کروں گا۔ خوب لطف آئے گا۔ گرم پانی کے ٹب میں بیٹھ کر لیکن اخبار دیکھنے کے بعد غسل کروں گا۔ شکر ہے روز کی بدمزہ چائے سے تو آج نجات ملے گی۔ آج تو ناشتہ کروں گا باقاعدہ۔ چائے ہوگی گرم گرم۔ فرنچ ٹوسٹ ہوں گے۔ پنیر تو غالباً ہو ہی گا۔ آج تلوا کر کھائیں گے خوب لطف رہے گا۔ ایک طرف میٹھے ٹوسٹ اور دوسری طرف مزیدار تلا ہوا پنیر۔ کیا مزا ہو جو آج نگہت دو انڈوں کا آملیٹ بھی بنوا دے۔ خدا کرے گھر میں ٹماٹر اور ہری مرچ بھی ہو۔ ٹماٹر اور ہری مرچ کے بغیر آملیٹ کھانا کور ذوقی ہے۔

اچھا تو کھانا کیا پکے آج؟ کوئی نئی چیز پکنی چاہیئے آج تو۔ شامی کباب۔ قیمہ بھرے ہوئے کریلے۔ قیمہ بھر کر کریلے تو ماما خوب پکاتی ہے پراٹھے بھی ضرور ہوں لیکن پراٹھوں کا لطف تو مرغ سے ہے۔ مرغ کہیں بازار سے تو لانا نہیں گھر میں دو چار موجود ہیں لیکن یہ تو نگہت دے گی نہیں۔ کچھ سوچ کر۔ ٹھیک ہے عورت اسی طرح خوش ہوا کرتی ہے۔ بس شامی کباب۔ قیمہ بھرے ہوئے کریلے۔ مرغ اور پراٹھے۔ خوب لطف رہے گا آج کھانے کا۔ لیکن کوئی میٹھی چیز بھی تو ہونی چاہیئے۔ نگہت نادان جائے گی۔ لیکن ماما کم بخت ضرور بحث کرے گی۔ لیکن اس اللہ کی بندی سے کوئی یہ تو پوچھے کہ خدا دینے والا میں کمانے والا۔ نگہت گھر کی مالک اور تم ملازم بھلا تم پکانے سے کیوں جی چراؤ۔

اچھا تو پھر میٹھا کیا ہو؟ میٹھا پلاؤ! نہیں! یہ تو عموماً گھر میں پکا ہی کرتا ہے انڈوں کا حلوا! ہوتا تو مزیدار ہے لیکن دیر سے ہضم ہوگا۔ چھوڑو اسے بھی نگہت سے پوچھوں لیکن ابھی نہیں۔ تو پڈنگ کیسی رہے گی! چیز تو اچھی ہے لیکن نگہت ولایتی مرغیوں کے انڈے دے گی کب۔ آملیٹ ہی کو دو مل جائیں تو غنیمت ہے۔ آہا! خوب سوجھی۔ دودھ میں پکی ہوئی سویاں۔ واللہ ! بالائی کے ساتھ خوب مزے آئیں گے۔ اچھا! تو پھر کھانے کا پروگرام کیا ہوا؟

پہلے چائے اور چائے کے ساتھ فرنچ ٹوسٹ۔ پنیر تلا ہوا۔ آملیٹ ٹماٹر اور ہری مرچ کے ساتھ۔ پاس! کھانے پر شامی کباب۔ قیمہ بھرے ہوئے کریلے۔ مرغ اور پراٹھے۔ اور دودھ میں پکی ہوئی سویاں۔ پاس! گویا دعوت ہوگئی مکمل۔ تو پھر کیا! آج چھٹی بھی تو ہے۔ سب پاس! ہُرّا! ویری گرینڈ!!

تو اب رہی نگہت! سب سے بڑا مرحلہ تو یہی ہے۔ اسے ہنسانا مگر

تو سب کام ٹھیک ہو جائیں گے تو باقی دن کا پروگرام کیا ہو۔ چھ سے نگہت کے ساتھ سینما دیکھیں گے اور اگر نگہت مان جائے تو .. لیکن اُمید نہیں مانے۔ کیسا لُطف رہے جو رات کا کھانا کسی انگریزی ہوٹل میں کھایا جائے۔ لیکن بیچ کا وقت؟ کھانے کے بعد ایک گھنٹہ سوئیں گے یا نگہت گراموفون بجائے گی اور ہم لیٹ کر سُنیں گے۔ کئی ایک خطوں کا جواب دینا ہے۔ پھر جواب لکھیں گے۔ اتنے میں چائے کا وقت ہو جائے گا۔ مٹھائی تو آج بازار سے ملے گی نہیں۔ باقر خانیاں گھر میں ضرور ہونگی۔ اور چائے کے بعد سینما جانے کی تیاری، نگہت سے کوئی بہت خوبصورت ساری پہننے کو کہیں گے۔ واللہ! چھٹی کا دن خوب گُذرے گا۔

میاں نسیم تو چھٹی کا پروگرام مرتب کر رہے تھے، اور نگہت غسل خانے میں تھی۔ جب باہر نکلی تو میاں کو ابھی تک بستر ہی میں لیٹے دیکھ کر بولی:۔

"اوہو! جناب! ابھی سو ہی رہے ہیں۔ معلوم بھی ہے اب تو آٹھ بجنے کو ہیں۔"

"آٹھ؟" نسیم نے ایک جمائی لے کر کہا۔ "ابھی سے کیا؟"

"تو آپ کیا سمجھ رہے ہیں" نگہت نے کہا۔ "ابھی اوّل ہی وقت ہے کیا؟"

"چھٹی ہے آج تو" نسیم نے مُسکرا کر کہا۔ "دفتر تو جانا نہیں سوال تو نہیں آیا؟"

نگہت ہنسکر بولی۔ "آپ سوتے ہیں جاگتے ہیں۔ اتوار کو سوال کب آیا کرتا ہے۔"

"اوہو!" نسیم نے ایک اور جمائی لے کر کہا۔ "چھٹی کا آدھا مزا تو جاتا ہی رہا۔"

"اچھی چھٹی ہے" نگہت نے مُسکرا کر کہا۔ "جو صبح کی نماز تک بھی چھٹی کی نذر ہو جاتی ہے۔"

"چھٹی جو ہوئی نگہت!" نسیم نے کروٹ بدل کر کہا۔

"بس ٹھیک ہے!" نگہت نے پاس بیٹھکر کہا۔ "آج ہر بات کی چھٹی ہی رہے تو اچھا ہے، سو رہیئے۔"

"اب کیا سونا ہے" نسیم بولا۔ "تم کہہ رہی ہو آٹھ بجنے کو ہیں۔ اب تو غسل کروں گا۔ اخبار ہوتا تو پڑھنے کا لطف آتا۔"

"تازہ پانی بھرا رکھا ہے ٹب میں" نگہت نے کہا۔ "اٹھیئے غسل کر لیجئے۔"

"آج تو دریا کے پانی سے غسل کرنے کا ارادہ تھا" نسیم نے کہا۔

"آج کیا ہے!" نگہت نے کہا "تو تازہ پانی سے ہی نہا لی۔"

"ہماری نگہت کی بھی کیا بات ہے" نسیم نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا چاند کی طرح چہرہ چمک رہا ہے۔"

"کہیں نظر نہ لگا دیجئے گا" نگہت نے ہنسکر کہا۔

"وہ چاند ہی کیا جسے نظر لگ جائے" نسیم نے کہا۔

"آج شیو نہیں ہو گا کیا" نگہت نے پوچھا۔

"گرم پانی ملے تو شیو بھی کر دوں" نسیم نے کہا۔

"چائے بھی تیار ہے" نگہت نے کہا۔ "پہلے شیو کریں گے یا چائے پیئیں گے۔ جانے کیا بات ہے ماما ابھی تک نہیں آئی۔"

"چائے" نسیم نے تینوں حرف الگ الگ کر کے کہے۔

"ہاں چائے!" نگہت نے مُسکرا کر کہا۔ "یا آج چائے کی بھی چھٹی ہی رہے گی؟"

"ماما کیوں نہیں آئی" نسیم نے پوچھا

"کل بیٹی کو حکیم کے پاس لے جانے کو کہہ رہی تھی" نگہت نے جواب دیا۔

نسیم نے نگہت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "نگہت پیاری! آٹھ روز بعد چھٹی کا دن آتا ہے۔ اس روز تو کوئی خاص پروگرام ہونا چاہیئے۔ ہم روز والی چائے نہیں پیئیں گے۔"

"پھر اور کیا" نگہت نے پوچھا

"تلا ہوا پنیر۔ آملیٹ جس میں سبز مرچ اور ٹماٹر ہو اور فرنچ ٹوسٹ" نسیم نے بیوی کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔ "سُن لیا جناب!"

"پنیر تو گھر میں ہے" نگہت نے جواب دیا۔ "لیکن آملیٹ اور فرنچ ٹوسٹ کے لئے انڈے کہاں سے آئیں گے بازار بند ہے اور محلے والیاں کہتی ہیں کہ مُرغیاں مر گئی ہیں۔"

"اجی جناب!" نسیم بولا۔ "آپ کی ولایتی مرغیوں کے اگر ہم چار انڈے لے لیں گے تو کچھ گھاٹا تو نہ پڑ جائے گا۔"

"انڈے تو آپ کے صدقے!" نگہت بولی۔ "لیکن میں نے تو کل انڈوں پر مُرغی بٹھا دی۔"

نسیم نے ایک لمبا سانس لے کر آنکھیں بند لیں۔ اور نگہت نے مُسکرا کر کہا۔ "باقر خانی موجود ہے۔ گرم گرم چائے کے ساتھ بہت مزا دے گی۔"

"نگہت!" نسیم کہنے لگا "ہم نے سوچا تھا کہ آج کھانے پینے کا کچھ خاص بندوبست ہو گا لیکن یہاں تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔"

"فرمائیے!" نگہت نے پوچھا "کیا کھائیں گے آپ؟"

"ہمارا خیال ہے کہ آج پراٹھے بنیں۔"

"بن جائیں گے۔" نگہت نے جھٹ جواب دیا

"بڑی مہربانی!" نسیم نے خوش ہو کر کہا "لیکن پہلے ہماری پوری بات تو سُن لیجئے جناب!"

"فرمائیے!" نگہت نے کہا۔

"شامی کباب بھی ہوں" نسیم بولا۔ "اور"

"لیکن!" نگہت بات کاٹ کر بولی "پراٹھوں کے ساتھ شامی کباب کیا مزا دیں گے؟"

"پہلے بات تو سُن لو ہماری!" نسیم نے کہا "بہت روز سے قیمہ بھرے ہوئے کریلے کھانے کو دل چاہتا ہے لیکن کہا اس لئے نہیں کہ چھٹی کے روز پکوائیں گے۔"

"آپ جس روز کہتے پک جاتے۔" نگہت نے کہا۔

"ارے توبہ!" نسیم بولا۔ "پہلے بات تو سُن لو نگہت۔"

"کہہ تو رہی ہوں۔" نگہت بولی۔ "آج ہی پک جائیں گے اور پراٹھوں کے ساتھ مزا بھی دیں گے۔"

"اجی جناب!" نسیم نگہت کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا "پراٹھوں کے ساتھ قیمہ والے کریلے تو مزا دیں گے لیکن اس کے ساتھ بُھنا ہوا مرغ بھی تو ہو پراٹھے قیمہ والے کریلے اور بُھنا ہوا مرغ۔ کیوں نگہت کیا لُطف رہے گا۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے اجازت ہو تو کہہ دوں۔ کچھ میٹھا بھی ہونا چاہیئے دودھ میں پکی ہوئی سویاں اور بالائی۔" پھر بیوی کی ٹھوڑی ہلا کر "سُن لیا جناب نے!"

"سُن لیا!" نگہت نے مسکرا کر کہا۔ "ماما آجائے تو ابھی انتظام کرتی ہوں۔ آپ اُٹھئے شیو کر لیجئے۔ اور نہا لیجئے۔ میں حمام میں کوئلے ڈال دیتی ہوں۔ آپ کے شیو کرنے تک پانی گرم ہو جائیگا۔"

"شکریہ!" نسیم نے بیوی کے رُخسار کو اُنگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔ "بہت بہت شکریہ!"

نسیم بچوں کی طرح پھلانگ کر پلنگ سے اُترا اور نگہت ہنستی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

نسیم شیو کر رہا تھا کہ باہر سے نوکر نے آواز دی۔

"حضور! ماما نے کہلا بھیجا ہے آج وہ نہ آسکے گی۔ اُس کی بیٹی بیمار ہے۔"

"کمبخت!" اندر سے نسیم نے جھنجھلا کر کہا۔ "جہنم کو جائیں دونوں۔"

نگہت حمام گرم کر کے جب واپس آئی تو بولی "ماما تو آج آ نہیں رہی۔ کھانے کا کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا؟" نسیم نے جواب دیا۔ "ہم دونوں ملکر پکائیں گے اور مزے سے کھائیں گے۔ تم سامان منگواؤ۔"

نسیم غسلخانے میں چلا گیا اور نگہت نے نوکر کو بازار سے سامان لانے بھیج دیا۔ نسیم جب نہا کر نکلا تو نگہت نے میز پر چائے لگا دی۔ چائے کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے توسٹ۔ مکھن اور مارملیڈ تھا دونوں چائے پینے بیٹھ گئے اور نسیم نے جو آج کے لئے پروگرام بنایا تھا بیوی کو بتانے لگا۔

نگہت بولی۔ "قمر کی خوشدامن مدت سے بیمار ہے کئی روز سے عیادت کو بھی نہیں جا سکے۔ کھانا کھانے کے بعد اُسے کیوں نہ دیکھ آئیں وہاں سے ہو کر سینما چلے جائیں گے۔"

"ہاں!" نسیم نے کہا۔ "ٹھیک کہا تم نے۔ ضرور جانا چاہیئے۔"

قمر نگہت کا بھائی تھا۔

"آپ بھی تو چلیں گے؟" نگہت بولی۔ "ورنہ قمر کو شکایت ہو گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی!" نسیم نے کہا۔ "ہم تو حکم کے بندے ہیں۔"

جب دونوں چائے پی چکے تو نسیم بولا۔ "تو آؤ نا نوکر کے آتے آتے مرغ ہی پکڑ لیں۔"

"لیکن مرغ تو باہر پھر رہے ہیں۔" نگہت نے جواب دیا۔ "نوکر آجائے تو پکڑ لے گا۔"

"لو آ گیا!" نسیم بولا۔ "مصالحہ وغیرہ تیار کریں۔"

دونوں باورچی خانے میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر سامان لے کر آگیا۔ اور نسیم نے اسے ایک مرغ پکڑنے کو کہا۔ ادھر نوکر مرغ پکڑنے گیا اور باہر سے آواز آئی۔

"میاں نسیم صاحب ہیں؟"

"کون ہے؟" اندر سے نسیم نے پوچھا۔

"میں چھیدا ہوں جناب! قمر صاحب کا ملازم۔" باہر والے نے کہا۔ "قمر صاحب کی خوشدامن فوت ہو گئی ہیں۔ اطلاع دینے آیا ہوں۔"

نگہت اور نسیم ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔

ایم۔ اسلم

سلمائے حدوث و لیلائے قدم

حسن زیبِ داستانِ عشق ہے
حسن ہی جانِ جہانِ عشق ہے

عشق آئینہ کمالِ حسن کا
عشق ہے گنجینہ حالِ حسن کا

حسن دانائے رموزِ عشق ہے
حسن دارائے کنوزِ عشق ہے

ہے منادی عشق طورِ حسن کا
عشق ہی باعث ظہورِ حسن کا

حسن کی سرشاریاں ہیں عشق سے
حسن کے جلوے عیاں ہیں عشق سے

جامِ جم ہے عشق تو جم حسن ہے
عشق ہے راز اسکا محرم حسن ہے

جب دکھانا ہو محبت کی بہار
حسن کرے عشق کا روپ اختیار

حسن کی غایت سمجھ لی عشق نے
داد آنِ حسن کی دی عشق نے

حسن کیا ہے؟ عشق کا پروردگار
عشق کیا ہے؟ حسن ہی کا شاہکار

جب یہ شہکار آئینہ صورت بنا
حسن خود آگاہ کہہ اٹھا انا

عشق جانِ ہمتِ مردانہ ہے
عشق شمعِ حسن کا پروانہ ہے

حسن کے تیور سمجھتا اور کون
حسن سے اتنا الجھتا اور کون

کیفِ عشق و حسن پھر مجھکو ملا
میں نے پھر چھیڑا غزل کا سلسلہ

علی منظور

غزل

میکدے میں مجھ تک آخر دورِ جام آ ہی گیا
میرا رنگِ بے نیازی میرے کام آ ہی گیا

جذبۂ بے اختیارِ شوق تجھکو کیا کہوں
میرے لب پر بے ارادہ اُن کا نام آ ہی گیا

اِک تصور کی بدولت اسطرح ہوں مطمئن
جیسے میرے پاس وہ محشر خرام آ ہی گیا

خشک دامانی کا شکوہ کر رہی تھی بے لبسی
ایک تارا ٹوٹ کر بالائے بام آ ہی گیا

بے کہے دُنیا سمجھ لیتی ہے میرا ماجرا
میری خاموشی کو بھی طرزِ کلام آ ہی گیا

میری بربادی بالآخر رنگ لا کر ہی رہی
اُن کے لب پر میرا ذکر ناتمام آ ہی گیا

اب تو اے بہزاد میں ہوں اور اُنکا آستاں
میرا جذبِ شوق آخر میرے کام آ ہی گیا

۵ شعر

یہ بجھی بجھی ادائیں یہ تھکی تھکی نگاہیں
کہیں دیکھ آئیں شاید مرے غم کی شاہراہیں

تجھے ذوقِ رہروی ہم وہاں کسطرح نباہیں
جہاں راہزن نہ رہبر جہاں منزلیں نہ راہیں

نہ فغاں ہیں اور نہ نالے نہ بیاں ہیں اور نہ آہیں
مرے گرم گرم آنسو مری غمزدہ نگاہیں

مرا دیدۂ تمنا نہیں سیرِ دید ہوتا
یہ میں مانتا ہوں ہرسو ہیں تری ہی جلوہ گاہیں

ترے اضطرابِ ظاہر خوشا اضطرابِ پنہاں
کبھی اِس طرف نگاہیں کبھی اُس طرف نگاہیں

بہزاد لکھنوی

میکدہ

اس جہاں کی جنتِ رنگیں جہانِ میکدہ
غیرتِ حورانِ جنت، حوریانِ میکدہ

منزلت یہ صحبتِ رندانِ مے آشام کی
ہیں شریکِ دور روحیں حافظ و خیام کی

عام ہیں کس درجہ اس عالم میں آثارِ حیات
چہرۂ ہر بادہ کش ہے مظہرِ انوارِ حیات

فکر ہے کس کو یہاں سود و زیانِ دہر کی
اس جہاں سے دور ہے دنیا سگانِ دہر کی

حضرتِ واعظ کے خبطِ پارسائی کو نہ ڈھونڈ
بزمِ رنداں ہے یہاں زہدِ ریائی کو نہ ڈھونڈ

حاصلِ ہر دو جہاں اک جرعۂ ساغر یہاں
ننگِ عظمت عظمتِ جمشید و اسکندر یہاں

حکمتِ رندانہ سے جن کی ہوں سرشار اہلِ ہوش
جمع ہیں وہ محفلِ جام و سبو میں بادہ نوش

جانتے ہیں کھیل غم کو سیلِ ہیبت ناک کو
قہقہوں میں ہیں اڑاتے گردشِ افلاک کو

یہ وہ ہیں جو ظلمتوں کو صبح کا اجلال دیں
موت بھی آئے تو کیفِ زندگی میں ڈھال دیں

انکی رگ رگ میں بجائے خوں مچلتی ہے حیات
جام چلتا ہے جدھر اُس سمت چلتی ہے حیات

اپنی قسمت اپنا یہ مقسوم ہیں سمجھے ہوئے
زندگی کی غایتِ مفہوم ہیں سمجھے ہوئے

انکے مسلک میں جوازِ بادہ پانی ہے حرام
کیف سے خالی ہو جو وہ زندگانی ہے حرام

انکے مسلک میں بجز صہبا پرستی سب غلط
غم کے دردانگیز نوحے غم کی ہستی سب غلط

قول ہے ان کا کہ ہے عہدِ زیست پینے کیلئے
آدمی آیا ہے اس دنیا میں جینے کیلئے

ذکرِ تقویٰ، فکرِ عقبیٰ کو جنوں کہتے ہیں یہ
پائے بندِ زہد کو "صیدِ زبوں" کہتے ہیں یہ

اک طرف رندانِ خوش اطوار محوِ شغلِ جام
اک طرف ساقی بصد انداز سرگرمِ خرام

موت اس ماحول سے پھرتی ہے کترائی ہوئی
زندگی ہی زندگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی

نہال سیوہاروی

اور پھر کوّے کو چھوڑا....

(میراجی)

دھواں دھواں سی بدلیاں ہیں، کچھ عیاں ہیں کچھ نہاں۔
مٹا سکوت کا جہاں۔
سرک چکیں دھواں اُگلتی چوٹیاں۔

میں گھورتا رہا خلا میں دیر تک
میں دیر تک خلا میں واہمہ گھورتا رہا۔
خموش سنسناہٹیں تھیں ہر طرف کہ مجھ کو گھورتی رہیں
نہ کوئی گیت تھا کہ پھڑپھڑا سکے،
نہ کوئی رنگ تھا کہ عکسِ رقص بن کے لہلہا سکے۔
بس اک سکوت تھا سکوت — آس پاس، دُور تک بچھا ہوا۔

دھواں دھواں
عقب کہ نگاہ میں
اُبھرتی چوٹیاں تھیں ان گنت، گماں گماں۔۔
دھواں اُگلتی چوٹیاں
بظاہر اک جمود کا جہاں بسا، منتظر نہیں کسی کا ہے — جانے کس لئے!
ہزاروں گیت تھے کہ جن کی پھڑپھڑاہٹیں
طیورِ پر بریدہ کی طرح
خزیدہ تھیں دھواں اُگلتی چوٹیوں کے درمیاں
شبِ قمر ندیدہ کی سیاہیوں کی گود میں۔

نہ ایک رنگ ایک عکسِ رقصِ منجمد تھا۔ بے بہار و بے خزاں۔
بس اک دھواں تھا رینگتا ہوا — دھواں دھواں

-

"کبھی ستارے دیکھے ہیں؟
— سفید مرمریں چراغ۔ وسعتِ فلک میں گھومتے ہوئے!"
یہ بات کوئی اجنبی ساہات درونِ محویت سے پوچھنے لگا ہی تھا۔
کہ سنسناہٹوں میں سرسراہٹیں اٹھیں۔
دھواں اُگلتی چوٹیاں
عقب کہ نگاہ سے سرک کے یوں خلا میں تیرنے لگیں
کہ جیسے ٹوٹتے ستارے وسعتِ فلک میں ہوں رواں —
لڑھکتے، لڑکھڑاتے، پھڑپھڑاتے ریزہ ہائے سنگ تھے۔
کہ ایک رقصِ ناتواں —
کراہتا ہوا سماں
کچھ ایسے مجھ کو گھورنے لگا
کہ جیسے میں ہی وہ خلا تھا جس نے رنگ رنگ موت کے سپرد کر دیا تھا جستجوئے رنگ میں

شبِ قمر ندیدہ روشنی کی دسترس سے دور ہے تو ہو!
مٹا سکوت کا جہاں۔
سرک چکیں دھواں اُگلتی چوٹیاں —
دھواں دھواں سی بدلیاں ہیں، کچھ عیاں ہیں کچھ نہاں!

انجم رومانی؛

ازلی راستے

افراد

تاراچند	لورن
شوَرام	سنتو
سرداری لال	رانی
سورج ناتھ	رانی
پرتاب	

(پردہ اٹھتا ہے۔ تاراچند کی بیٹھک میں اُٹھتا ہے۔ یہ بیٹھک 'پرانے' اور 'نئے' کا ایک عجیب امتزاج پیش کرتی ہے کیونکہ اس میں کوچ بھی لگے ہیں، چارپائیاں بھی رکھی ہیں اور ایک تخت پر گاؤ تکیہ بھی لگا ہے۔

بائیں دیوار میں ایک بڑی کھڑکی ہے۔ تخت اسی کے برابر رکھا ہے۔ کھڑکی پر پردہ لٹک رہا ہے لیکن شاید پورا نہیں کھینچا گیا، کیونکہ صرف کھڑکی کا کچھ حصہ نظر آ رہا ہے جس کے تیلیوں میں سے باہر جھانکتا ہوا اور اس سے پرے باغیچے کے درخت اور روشیں دکھائی دیتی ہیں۔

کوچ کے ادھر کو ایک دروازہ ہے جو باہر ڈیوڑھی پر کھلتا ہے۔ باہر سے ہو کر بیٹھک میں آنے کا یہی دروازہ ہے۔

سامنے دیوار میں کوچ کا سیٹ اس طرح لگا ہے کہ بائیں طرف کے کوچ پر بیٹھا شخص تخت پر بیٹھے ہوئے آدمی سے بہ آسانی بات کر سکے۔

سامنے کی دیوار کے داہنے کونے میں ایک دروازہ ہے جو آنگن میں کھلتا ہے۔ دروازے پر پردہ لٹک رہا ہے لیکن پردے کے ہٹنے پر آنگن اور آنگن کے پرے برآمدے کا ایک حصہ، پانی کا نل اور حوض نظر آتے ہیں۔

دیواروں پر دو چار دیوتاؤں کی تصویریں ہیں۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال کی بھی ہیں۔ ان میں مارکس اور لینن کی تصویریں بھی کسی نے لگا دی ہے۔ شاید یہ تصویریں تاراچند کے لڑکے پورن نے لگائی ہیں اور تاراچند جی کو شاید اس نے یہ کہہ رکھا ہے کہ یہ بھی اوتاروں ہی کی تصویریں ہیں۔

صبح کا وقت ہے۔ کھڑکی کے سوراخوں سے ہلکی ہلکی دھوپ کمرے میں آ رہی ہے۔ پردہ اٹھنے پر تاراچند حقہ پیتے نظر آتے ہیں اور شوَرام تخت کے دوسرے کونے پر بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی آئے ہیں کیونکہ ٹوپی ابھی تک ان کے ہاتھ میں ہے ... نظر آتے ہیں۔

چند لمحے کے لیے تاراچند حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ پھر رانی کو آواز دیتے ہیں۔)

تاراچند۔ رانو بیٹا، ان کے لیے پانی لانے کو کہا تھا۔

رانی:۔ (آنگن سے) لائی ہوں پتا جی۔

شوَرام:۔ ارے بھئی کون سی جلدی ہے۔ ابھی دور سے چلا ... سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔

١٨٠٢٠

کیا مطلب ہے کہ ۔ ۔

(رانی آنگن کے دروازہ سے پانی لئے داخل ہوتی ہے)

رانی:۔ لیجئے چچا جی۔

شورام:۔ (گلاس لیتے ہوئے) جیتی رہو بیٹا۔

(دو ایک گھونٹ پی کر گلاس تپائی پر رکھ دیتا ہے۔ رانی گلاس اُٹھانے لگتی ہے)

——۔ نہیں ابھی گلاس لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی اور ہوں گا۔ کبھی آہستہ آہستہ پینے کا عادی ہوں میں پانی۔

تاراچند:۔ (حقہ گڑگڑاتے ہوئے) سنتو کو بھیج دینا گلاس لینے، کہاں ہے سنتو؟

رانی:۔ جی سبزی لینے گیا ہے مارکیٹ تک۔

تاراچند:۔ جب آئے، بھیج دینا۔

رانی:۔ جی بہت اچھا۔

(چلی جاتی ہے)

شورام:۔ کیوں بھئی رانی کے متعلق کیا فیصلہ کیا تم نے؟ غریب آدمی بھی نہیں رہی۔

تاراچند:۔ رانو ہی کے دُکھ کا علاج کر رہا ہوں شورام۔ اپنی طرف سے میں اس بات کا پورا خیال رکھتا ہوں کہ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو (حقہ گڑگڑاتے ہیں) اس لئے دوبارہ کالج میں داخل ہونا چاہا۔ اور اگرچہ میں لڑکیوں کی تعلیم کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن پُورن کے زور دینے پر میں نے اس کا انتظام کر دیا۔ اس نے گانا سیکھنا چاہا اور اگرچہ میں ناچ گانے کو جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ڈُوم میراسیوں کی چیز سمجھتا ہوں لیکن پُورن کے کہنے پر اور اس بات کا خیال کر کے کہ رانو کا غم غلط ہو جائے گا میں نے سوروداس ہری رام کو اسے گانا سکھانے کے لئے مقرر کر دیا۔ (حقہ کا لمبا کش لگا کر قدرے رازدارانہ آواز میں) بھی نہیں میں نے ابھی ترلوک کا بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ برندابن کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے۔ اور وہ اسے راہ پر لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ (پھر حقہ گڑگڑاتے اور کھانستے ہیں) میں جانتا ہوں اپنی تعلیم اپنے فن اور اپنی تمام خوبیوں کے باوجود رانو تنہائی کے اس لئے دُکھ کو برداشت نہ کر سکے گی۔

شورام:۔ دھن چوری ہو جائے تاراچند! کھو جائے! آدمی صبر کر لیتا ہے لیکن پاس ہوتے ہوئے، اپنا ہوتے ہوئے بھی اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ ملے! اس بات سے جو تکلیف ہوتی ہے اسے دل ہی جانتا ہے۔

تاراچند:۔ (حقہ کا لمبا کش لگا کر) اسی لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ ترلوک اسے آ کر لے جائے۔

شورام:۔ کیا کہا ہے اس نے؟

تاراچند:۔ ابھی تک تو اپنی ضد پر قائم ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں اُسے منا لوں گا۔ اصل میں اُس نے اس شادی سے بڑی اُمیدیں لگا رکھی تھیں اور جب اس نے دیکھا کہ اس کی اُمیدیں پوری نہیں ہوئیں تو اس نے تمام غصہ بیچاری رانو پر نکالا۔

شورام:۔ اُمیدیں؟

تاراچند:۔ اُس کا خیال تھا کہ اُسے جہیز میں ایک مکان اور موٹر ضرور ملے گی لیکن جب مکان چھوڑ اسے موٹر بھی نہ ملی۔

(پورن باہر جیوتی سے پردہ کھائی دیتا ہے لحظہ بھر کے لئے کھڑکی میں سے اندر جھانکتا ہے پھر ڈرائنگ روم کی طرف آتا ہے)

شورام:۔ اسے مکان اور موٹر کی کیا ضرورت ہے؟ اُس کے والد کے اپنے مکان ہیں اور موٹر بھی ہے۔

تاراچند:۔ (ہنس کر) لیکن ترلوک کے علاوہ اس کے والد کے پانچ بیٹے اور بھی تو ہیں۔ تقسیم کرنے پر شاید کسی مکان کی بیٹھک اور موٹر کا کوئی پرزہ ہی اسکے حصہ میں آئے۔

(پورن داخل ہوتا ہے لیکن دونوں کو باتوں میں مشغول دیکھ کر پل بھر کے لئے چوکھٹ میں کھڑا سُنتا ہے۔)

شورام:۔ آپ کہئے کیا ہیں؟ اُن کے تو اتنے مکان ہیں!

تاراچند:۔ سب گروی رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو پتہ ہی نہ چلا ورنہ میں کبھی رانو کی شادی وہاں نہ کرتا۔

پورن:۔ (ہنستا ہے) اسباب کا پتہ چل جاتا تو کوئی اور بات پردے میں رہ جاتی۔ شادی تو آجکل اندھیرے میں تیر مارنے کے برابر ہے نشانے پر لگ گیا تو لگ گیا ورنہ کمان سے نکلا تیر تو واپس آتا نہیں۔ جب دونوں فریق جھوٹ بولنے

میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں ہوں تو سچ کا پتہ پانا مشکل ہے۔

تاراچند:۔ (حقہ گڑگڑانا چھوڑ کر قدرے تلخ لہجے میں) کہاں سے آئے ہو پورن آوارہ گردی کرتے۔

پورن:۔ آوارہ گردی میں ٹھور ٹھکانا۔ کہاں ؟ سبھی جگہ گھومتا آیا ہوں۔

تاراچند:۔ تمہیں کبھی تمیز سے بات کرنی بھی آئے گی۔ (شوراَم سے) اور شورام تم کہا کرتے تھے بچوں کو جتنا ہو سکے پڑھانا چاہیئے۔ یہ صاحب ایم۔ اے ہیں اور سنتا ہوں کہ جماعت میں اوّل آئے تھے۔ پوچھو کرتے کیا ہیں ؟ (مُنہ سا کر) آوارہ گردی!

پورن:۔ تو آخر آپ ہی کہیئے کیا کروں ؟

تاراچند:۔ (گرج کر) میں کہوں! میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ (شورام سے) میں اس کی خاطر کتنے دوستوں کے آگے بُرا نہیں بنا شورام! رائے صاحب غنیمت رائے کی سفارش سے بڑے دفتر میں ملازم کرایا (نقل اُتارتے ہوئے) "مجھے یہ کلرکی پسند نہیں" ۔۔۔۔ بُرا سا مُنہ بنا کر یہ حضرت وہاں استعفیٰ دے آئے۔ لالہ گلزاری لال کی منتیں کر کے ان کی فرم میں نوکر کرایا چار دن بعد وہاں سے چھوڑ آئے۔ پوچھا۔ کیوں ؟ جواب ملا۔ سارا دن جھوٹ بولنا پڑتا ہے کوئی پوچھے۔ ستیہ وادی ہرلش چندر کے اوتار تو بس تمہیں ہو باقی ساری دُنیا جھوٹ بولتی ہے۔ سر سیتا رام کی مل میں منیجر کی نوکری دلائی۔ ہفتے سے زیادہ وہاں نہ ٹکے۔ پوچھا۔ کیوں ؟ معلوم ہوا ۔۔۔ مزدوروں پر ظلم ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ (پھر پورن سے) اب بتاؤ تمہیں اور کیا کرنے کو کہوں۔ صبح کہاں جانے کو کہا تھا۔ کچھ یاد ہے۔

پورن:۔ میں اُن سے بات تک کرنا اپنی ہتک سمجھتا ہوں۔

تاراچند:۔ لاٹ ہے نا ہندوستان کا تو (مُنہ چڑاتے ہوئے) بات کرنا ہتک سمجھتا ہوں۔ بہن کی ساری زندگی کا سوال ہے اور یہ حضرت بات کرنا ہتک سمجھتے ہیں۔

پورن:۔ میں جانتا ہوں انکے ساتھ بہن کی زندگی ... ...

تاراچند:۔ (اور بھی گرج کر) چُپ رہو اور یہ فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ بہت سُن چکا ہوں۔

رانی:۔ (آنگن سے) پورن بھیّا ذرا ادھر تو آؤ! میرا یہ ٹرنک نیچے اُتروا دو۔

پورن:۔ آیا رانو!

(چلا جاتا ہے)

تاراچند:۔ ضرورت سے زیادہ تعلیم نے اس لونڈے کا دماغ خراب کر دیا ہے (حقہ گڑگڑاتے ہیں) مجھے کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ مالو کا بھی دماغ خراب نہ کر دے۔ عورت کی جگہ اُسکے سوہر کا گھر ہے شورام۔ ماں باپ کے ہاں لڑکی کے دن رہ سکتی ہے۔

شورام:۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے لڑکیوں کو اپنے گھر نہیں رکھ سکتے تاراچند پھر ہماری تمہاری تو بات ہی کیا ہے۔

تاراچند:۔ ایشور تمہارا بھلا کرے (حقہ کا کش لگا کر) تبھی کہو رانو اپنے گھر نہ جائے گی تو کیا تمام عمر یہاں بیٹھی رہے گی۔ میں جو اسے تعلیم دلوا رہا ہوں تو اسی لئے کہ ترلوک کو جو شکایت ہے رفع ہو جائے۔ ورنہ اسے کوئی نوکری تو کرنی نہیں۔

شورام:۔ بھلے گھروں کی لڑکیاں کہیں نوکری کرتی ہیں۔

تاراچند:۔ اور یہ سالا جو آج بھائی بنا پھرتا ہے کل اگر میری آنکھ بند ہو جائے تو بات بھی نہ پوچھے گا۔ دیکھو شورام ان لوگوں کے کہے تو کچھ ہوگا نہیں۔ یہ سب نادان چھوکرے ہیں۔ انہیں یہ تمیز نہیں کہ کونسی بات کہنے کی ہے اور کونسی نہیں۔ تمہیں اتنے سویرے تکلیف دینے سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ تم خود ترلوک سے ملو۔ اور اسے کسی نہ کسی طرح رانی کو بلانے پر آمادہ کر لو۔ دیکھو ترلوک کے باپ سے تمہارا کافی دوستانہ رہا ہے۔ اُس پر بھی دباؤ ڈالو۔ اگر وہ میرا مکان ہی لینا چاہتا ہے تو میں اپنا بُرانا مکان اُس کے نام کر دوں گا۔ آخر داماد اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہے؟ رانی اپنے گھر خوش رہے میں اور مکان بنوا لوں گا۔

شورام:۔ لیکن رانی سے اُسے شکایت کیا ہے؟

تاراچند:۔ سینکڑوں شکایتیں ہیں۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں، مہذب نہیں، خوبصورت نہیں، سلیقہ نہیں، مُنہ پھٹ ہے ساس سُسر کی عزت نہیں کرتی۔ ...

شورام ۔ ہم ۔ ری سمجھا نہیں

تاراچند ۔ ارے ۔۔ وہ ۔۔ سال ۔۔ ہوئی آئی تو میں نے سمجھا تھا کہ ۔۔ دیا تھا۔ لیکن دراصل ۔۔ ۔۔ ہوا ہوں لقصیر ۔۔ ۔۔ کی اُمید کے مطابق وہ جہیز میں ۔۔ اور مکان نہیں ہے گئی۔

شورام ۔ ۔۔ معلوم ہو ۔۔ سامنے ۔۔ ۔۔ کا ذکر چلا

تاراچند ۔ (حقہ گڑگڑاکر) ارے ۔۔ کچھ گیا۔ (نوکر کو ۔۔) ۔۔ ۔۔

رانی ۔ (اندر سے) کیا بات ہے ماجی

تاراچند ۔ ۔۔ ۔۔ ادھر کے دے جائے۔

رانی ۔ وہ لو ابھی آیا نہیں ۔۔ ۔۔

(رانی آتی ہے اور چلم لے جاتی ہے)

تاراچند ۔ (رانی سے) ۔۔ کو ۔۔ پورن کیا کر رہا ہے؟

رانی ۔ (جاتے جاتے) باہر چلے گئے ہیں ۔۔ میں۔

تاراچند ۔ (خالی حقہ گڑگڑاتے ہوئے) ترلوک نے مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں کہا میرے سامنے تو اس نے جھجکتے جھجکتے ابھی ۔۔ کا ذکر کیا لیکن رانی نے ۔۔ میں ابھی شروع ۔۔ ۔۔ معلوم ۔۔ بتایا اُسی سے مجھے معلوم ہوگیا۔ ۔۔ میں ۔۔ ہے شروع شروع میں ترلوک نے رانی کو اس کے باپ کی کنجوسی کے طعنے دیئے اور کہا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے اسے اُمید دلائی گئی تھی کہ ایک موٹر اور مکان جہیز میں دیا جائے گا۔

شورام ۔ ہوئی تھی ایسی بات؟

تاراچند ۔ ہرگز نہیں ۔۔ میں اور ۔۔ ترلوک کو دیکھنے گئے تھے اس بات کا ذکر ۔۔ نہیں ہوا ۔۔ اُس وقت تو ۔۔ پڑھی لکھی کی ضرورت تھی نہ خوبصورتی کی میرے سامنے ترلوک نے صاف صاف کہا تھا کہ میں بہت پڑھی لکھی لڑکی پسند نہیں کرتا ۔۔ شریف گھرانے کی نیک اور قبول صورت لڑکی چاہیئے جو مجھے گھر کا آرام دے سکے جب میں شام کو کچہری سے تھکا ہارا گھر آؤں تو مجھے محسوس ہو کہ میں گھر میں آگیا ہوں۔ مجھے ایسی ۔۔ نہیں چاہیئے جو گھر ۔۔ کو کچہری بنائے رکھے ۔۔ اور میں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ رانو میں یہ سب خوبیاں پائیگا۔ اب ترمانند نے اسی طرف سے اُسے کوئی سبز باغ دکھلائے ہوں تو مجھے خبر نہیں۔

(رانی چلم لئے آتی ہے)

رانی ۔ یہ لیجئے چلم پتاجی، اُپلے کی آگ رکھکر لائی ہوں۔

تاراچند ۔ (حقہ گڑگڑاکر) جیتی رہو بیٹی (شورام سے) لو شورام پیو۔

(رانی چلی جاتی ہے اور شورام بے پروائی سے حقے کے دو کش لگا کر تاراچند کی طرف کر دیتا ہے۔)

شورام ۔ لیکن تمہاری مرضی کے بغیر ترمانند نے ایسا کیوں کیا ہوگا۔

تاراچند ۔ کبھی میرا خیال تھا موٹر اور مکان دیدے گا۔ لیکن بھائی مجھے راجی کی بھی تو شادی کرنی تھی۔ اگر رانو کو مکان دیتا تو راجی کو بھی دینا۔ اور پھر جب ترلوک اور اس کے باپ نے کہا کہ ہمیں جہیز کی بالکل پروا نہیں۔ اسکے ۔۔ خدا کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے، ہمیں تو بس سوشیل اور شریف لڑکی چاہیئے تو میں نے ارادہ چھوڑ دیا اور پھر پورن کا بھی خیال تھا لاکھ آوارہ ہو لیکن پھر بھی میرا بیٹا ہے۔

شورام ۔ ہاں، ہاں، پورن کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑنا۔ سرے سے الٹا ہی ہوتی پڑھا لکھا بے عیب اور کالج ہے جس دن بھی ٹھیک کر بیٹھ گیا تم سے دگنا کمالے گا۔

تاراچند ۔ (لمبا سانس لے کر) وہ دن تو آئے (چُپ چاپ حقہ گڑگڑاتے ہیں) مجھے کیا معلوم تھا کہ ترلوک اور اُس کے باپ نے جو کچھ کہا وہ سب اُوپر کی باتیں تھیں۔ اُن کی آنکھیں تو موٹر اور مکان پر لگیں تھیں۔ جونہی رانو گھر گئی اُسے سُننا پڑا کہ وہ ایک کنجوس باپ کی بیٹی ہے۔ آئی ساس نے اُس کے سسرے اُس کی جیٹھانیوں اور نندوں نے اُسے جہیز کی کمی کے طعنے دیئے۔ ترلوک نے کئی بار ان لڑکیوں کا ذکر کیا جنکے والد اسے کہیں زیادہ جہیز دینے کو تیار تھے یا جو زیادہ پڑھی لکھی یا زیادہ مہذب تھیں۔

(اچانک کال بیل بجتی ہے)

۔۔۔۔۔۔ (رانی بات جاری رکھتے ہوئے) یا اس سے زیادہ خوبصورت حلیم یا مسکین تھیں۔

(کال بل پھر بج اٹھی ہے)

——— : (دور سے روتے) ارے سنتو، دیکھ کون ہے بیٹھاؤ باہر برآمدے میں (شوورام سے) وہ کچھ بھی کہتی یا کرتی اسے کسی نہ کسی لڑکی یا اس کے رشتے داروں کی بات سُننی پڑتی جی کہ اسے اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ یہاں آگئی۔ تب میں نے اسے سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔ سمجھایا کہ بیٹی پتی جس حال میں رکھے اسی میں رہنا چاہئے اور سسرال کے دوش گننے کی بجائے گن ڈھونڈنے چاہئیں اور میں جانتا ہوں رانو نے اپنی طرف سے کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ برہمنوں کے بھیس میں یہ لوگ کھٹ بتے ہیں۔ لیکن شوورام جو بھی ہو لڑکی کی جگہ تو اس کی سسرال ہی ہے۔ تم ذرا کوشش کر دیکھو مجھے مکان یا موٹر کی پروا نہیں رانو کے سکھ کی خاطر میں اس کا انتظام کر دونگا۔

پورن :- (باغیچے کی طرف سے آتا ہوا) پتا جی رائے سردار لال آئے ہیں۔

تاراچند :- (گھبرا کر اٹھتے ہوئے) تو انہیں لے آتے ہوتے۔

پورن :- جی انہوں نے کہا میں یہیں برآمدے میں بیٹھا ہوں، دھوپ بڑی پیاری لگ رہی ہے۔

شوورام :- اچھا بھئی تو میں چلا۔ پرلوک سے آج ہی ملونگا۔

تاراچند :- ارے بھئی چلو ذرا دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔

(شوورام کو ساتھ لئے چلتے ہیں)

——— :- (جاتے جاتے پورن سے) سنتو آئے تو حقہ باہر بھجوا دینا پورن۔

پورن جی بہتر۔

(رانی تیز تیز آتی ہے اور بھائی کے گلے لگ جاتی ہے)

رانی :- (روتے ہوئے گلے سے) پورن!

پورن :- (اس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے) کیوں رانو کیا بات ہے۔

رانی :- پتاجی مجھے پھر وہاں بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں تمہی کہو میں کیا کروں گی وہاں جا کر؟ کیا اس طرح ان کی طمع کا پیٹ بھرنے سے میرا گھر ملو جیون سکھی ہو سکے گا۔

پورن :- تم فکر نہ کرو رانو، تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں وہاں نہیں بھیج سکتے۔

رانی - (روتے ہوئے گلے سے) پورن!

پورن :- (اس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے) میں کہتا ہوں تم گھبراؤ نہیں۔

رانی :- پتا جی دوسروں سے تو کچھ کہتے ہیں لیکن دل میں وہ بھی مجھے کم قصوروار نہیں سمجھتے۔ (اچانک پورن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) ایک بات پوچھوں۔

پورن :- کہو۔

رانی :- تم بھی تو دل میں کہیں مجھی کو قصوروار نہیں سمجھتے؟

پورن :- قصوروار ـــ قطعاً نہیں بلکہ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ تم نے اپنی خودداری کو برقرار رکھا۔

رانی :- میں اس دم گھوٹنے والے ماحول میں کس طرح رہ سکتی تھی۔ مجھے پتا جی کا ڈر نہ ہوتا تو میں کبھی کی آجاتی۔ مجھے خوف تھا وہ مجھے پھر اسی نرک میں جانے کے لئے کہیں گے پہلی بار جب میں آئی تھی تو جانے ہوں انہوں نے کیسا شور مچایا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اپنی غلطی مان جائیں گے اس لئے میں نے پتاجی سے سب باتیں نہ کہی تھیں لیکن اس بار سب کچھ بتا دینے پر بھی وہ مجھے اس نرک میں بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پورن :- تم کسی طرح کا فکر نہ کرو۔ پتا جی پتی کو پرمیشور سمجھتے ہوں تو سمجھیں میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک پتی کا مرتبہ صرف اس کا ساتھی ہے اور اس ساتھ کو نبھانے کی ساری ذمہ داری بیوی ہی پر نہیں شوہر پر بھی ہے۔

(پنڈت تاراچند اور رائے سردار لال باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

تاراچند :- عجب موسم ہے بھئی سردار لال دھوپ میں بیٹھو تو گرمی لگتی ہے اور سائے میں بیٹھو تو ٹھنڈ لگ (بیٹھتے ہیں) ابھی دو منٹ پہلے دھوپ کتنی پیاری لگتی تھی لیکن اتنے ہی میں سر چکرانے لگا (پورن سے) ذرا سنتو کو بھیجو پورن، حقہ تازہ کر جائے، اور دیکھنا باہر کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔

پورن :- جی

(جاتا ہے رانی بھی جانے لگتی ہے)

تاراچند :- رانو بیٹا تمہارے چچا آئے ہیں۔

رانی:- (مڑکر) چچا جی پرنام۔

سرداری لال:- جیتی رہو بیٹی، سہاگوتی بنو اور اپنے گھر خوش و خرم رہو۔

(رانی بھاگی ہوئی چلی جاتی ہے)

تاراچند:- تم نے دیکھا سرداری لال! رانو کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ تم ایک بار کوشش تو کر دیکھو میں کہتا ہوں جب تک یہاں ہے میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔

سرداری لال:- میں نے تم سے کہہ دیا میں پوری کوشش کروں گا۔

(سنتوا آتا ہے اور حقہ اٹھا کر لے جاتا ہے)

تاراچند:- رانو جیسی میری بیٹی ہے سرداری لال، ویسی ہی تمہاری ہے۔ میں تو سچ پچھتا رہا ہوں یہاں شادی کر کے۔ لیکن جو ہو چکا ہو چکا۔ میں نہیں چاہتا کہ بات اب اور بڑھے کسی نے کہا ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل — دور رہے تو دور ہو جائیں گے۔ میں جانتا ہوں ترلوک رانی کو پسند کرتا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے اسے دیکھ بھی لیا تھا۔ اسے جس بات کی شکایت ہے وہ میں پوری کر دوں گا۔ میری بس اتنی خواہش ہے کہ وہ اسے عزت سے رکھے

(راج اُداس اُداس آتی ہے)

راج:- (اپنی اُداسی کو چھپاتے اور ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) پتا جی پرنام۔ چچا جی پرنام!

تاراچند:- ارے راجی (اُٹھ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) کہو بیٹی خوش تو ہو۔

سرداری لال:- اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں۔

. . . .

تاراچند:- ارے بھئی ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ کم سے کم دروازے تک تو پہنچا آؤں۔

سرداری لال:- (اُٹھتے ہیں) اس تکلف کو چھوڑو۔

تاراچند:- تم نے راجی کے پرنام کا جواب ہی نہیں دیا سرداری لال!

سرداری لال:- (مڑ کر) جیتی رہو جیتی رہو بیٹی۔

تاراچند:- (اُٹھتے اور راجی کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے بھی ساتھ لیجاتے ہوئے) راجی!

راج:- جی پتا جی۔!

تاراچند:- تم اتنی دُبلی کیوں ہو گئی ہو؟

راج:- (غم کو دباتے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) جی نہیں میں تو پہلے سے موٹی ہو گئی ہوں۔

تاراچند:- (چلتے چلتے لحظے بھر کو رک کر) تمہارا سامان کہاں ہے۔

راج:- ٹرنک ہے سو باہر برآمدے میں پڑا ہے۔

تاراچند:- مدن نہیں آیا۔

راج:- نہیں میں اپنے دیور کے ساتھ آئی ہوں۔

تاراچند:- تو کہاں ہے وہ ساتھ کیوں نہیں لائی۔

راج:- اُسے جلدی تھی۔ مجھے یہاں چھوڑ کر سکول چلا گیا ہے۔ جیجی کہاں ہے۔

تاراچند:- یہیں تھی۔ شاید ادھر آنگن میں ہو۔

راج:- اور بھتا وہ بھی ادھر ہی باغیچہ میں ہوگا۔

تاراچند:- (اس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے) اور تو سب خوش ہیں تمہارے ساس سسر . . .

راج:- (چلتے چلتے شرما کر) جی۔

تاراچند:- (اسے چھوڑ کر سرداری لال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے) بڑے بھلے لوگ ہیں سرداری لال — نہ اکڑفوں نہ حیلہ بناوٹ — سیدھے سادے بھولے بھالے، مرنجان مرنج آدمی ہیں راجی کے سسر اینک حیال اور دھرم پرایَن! غرور تو انہیں چھو تک نہیں گیا۔ جب میں شروع شروع میں راجی کے لئے ان سے ملا تو کہنے لگے (رک رک کر) ہمیں لین دین میں وشواس نہیں پنڈت جی۔ ہم تو آپ کو چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہو گئے تو اور کیا چاہئے (پھر چل پڑتے ہیں) میں تو ایسے ہی آدمیوں کو پسند کرتا ہوں اور جانی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ ترلوک کے نام ہو یا نہ ہو میں مدن کے نام ایک مکان ضرور کر دوں گا — لڑکا تو بیچارہ گائے ہے۔

(چبوترے سے دروازے نکل جاتے ہیں)

راج:- (اپنے پتا کی آخری بات سن کر رک گئی ہے، مڑ کر جاتے ہوئے اپنے پتا کو دیکھتی ہے۔ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے) بیچارہ گائے!

(دھم سے دہلیز آنگن کے دروازے کے پاس کوچ میں دھنس جاتی ہے۔ سنتو حقہ تازہ کر کے لاتا ہے)

سنتو:- ارے راج بیٹی ہے۔ کہو بیٹی کب آئیں۔

راج:- ابھی آرہی ہوں سنتو۔

(باغ کے دروازہ سے پورن بھاگا آتا ہے)

پورن:- ہیلو راجی۔

راج:- بھیّا.. ..

(گلے سے لپٹ جاتی ہے)

پورن:- پاس سے نکل گئی اور مجھے دیکھا تک نہیں (جب اُس کے چہرے کو دیکھتا ہے تو چونکتا ہے) ارے تم تو پیلی ہوگئی ہو۔ ہلدی کھاتی رہی ہو یا (ہنسکر) جیجا جی نے.....

راج:- (درد بھرے غصّے سے) بھیّا ——

پورن:- اچھا اچھا بھئی (پیٹھ تھپتھپاتا ہے) خفا کیوں ہوتی ہو جیجا جی کا نام سُنکر ہماری سُرخ و سفید بہن کو سے کے زرد ہلدی کردیا اور ہم اتنا بھی نہ کہیں کہ .. ..

راج:- (رندھے ہوئے گلے سے) بھیّا تم کبھی باز نہ آؤگے.. .

پورن:- اچھا بھئی بگڑتی کیوں ہو (رانی کو آواز دیتا ہے) رانو دیکھو راجی آئی ہے۔ (سنتو سے جو حقّہ رکھکر جا رہا تھا) سنتو ذرا رانو کو بھیجو۔ اور راج کا ٹرنک اُٹھاکر اندر رکھو۔ باہر برآمدے میں پڑا ہے۔

سنتو:- (جاتے جاتے) جی بہتر۔

(چلا جاتا ہے۔ رانی آنگن سے بھاگی بھاگی آتی ہے)

رانی:- (راجی سے گلے ملتے ہوئے) ارے تو ادھر بیٹھک میں کیا گوبر گنیش بنی بیٹھی ہے ادھر کیوں نہیں آئی۔

راج:- پتا جی اور چچا سرداری لال بیٹھے تھے اسلیے۔

(کال بیل بج اُٹھتی ہے)

پورن:- (بیزاری سے) یہ اتوار کا دن تو ایک مصیبت بن گیا ہو صبح سے جو کال بیل بجنی شروع ہوتی ہے تو......

(کال بیل پھر بجتی ہے، اور پورن جی آیا کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے)

راج:- (رانی کے گلے سے چمٹتی ہوئی رندھے ہوئے گلے سے) جیجی۔

(رانی اُس کی پیٹھ تھپتھپاتی ہے راج آہستہ آہستہ رونے لگتی ہے)

رانی:- ارے... بات کیا ہو .. . راجو... ...کیوں!

راج:- (اور بھی چمٹتے ہوئے) جیجی!

(اور بھی زور سے سسکنے لگتی ہے)

رانی:- کیوں راجو کیا بات ہے؟

راج:- (آنسو پونچھتے ہوئے ذرا سنبھل کر) بات کیا ہوگی۔ یونہی تمہیں دیکھکر جی بھر آیا۔ کہو ترلوک جیجا جی آئے؟

رانی:- (طنز سے ہنسکر) آ گئے۔ تم اپنی کہو۔ تمہیں کیا دکھ ہے۔

راج:- نہیں جیجی میں ہر طرح سے خوش ہوں۔

رانی:- (دردا ہنسکر) خوشی کی کوئی علامت تو تمہارے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ دیکھو راجو، مجھ سے نہ چھپاؤ میں سب کچھ بھگت چکی ہوں۔

راج:- کچھ بھی تو نہیں جیجی۔

رانی:- کیا تم یہ سب میری طرف دیکھکر کہہ سکتی ہو۔

راج:- (مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) کیوں۔

رانی:- مُسکراہٹ میں دُکھ کو چھپانے کی کوشش نہ کرو راجو، تمہاری آنکھیں تو ڈبڈبا رہی ہیں۔

راج:- (بھرے ہوئے گلے سے) جیجی۔

(ایک دم رانی کے گلے سے چمٹ کر رو اُٹھتی ہے)

رانی:- (اُس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے لمبا سانس لے کر) دُنیا بھر میں شادی عورت کے لئے سُکھ سنتی کا وردان ہے۔ لیکن ہماری غلامی پر اس کے بعد سدا غلامی کی مہر لگ جاتی ہے۔ (راج سسکتی ہے) بس بس غم کو دل میں چھپاؤ بہن گھاؤ کر دیتا ہے اور وقت پاکر وہی گھاؤ ناسور بن جاتا ہے —— کیا ساس تنگ کرتی ہے۔

راج:- نہیں وہ بیچاری تو کبھی کچھ نہیں کہتیں۔

رانی:- سسُر۔

راج:- وہ تو دیوتا ہیں۔

رانی:- نندیں۔

راج:- وہ ہوتیں تو میں ابتک شاید ختم ہو چکی ہوتی۔

رانی:- تو پھر . . تو پھر......

(راج پھر بہن کے گلے سے چمٹ کر سسکنے لگتی ہے)

——:- لیکن بروفیسر مدن تو بڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بات کیا ہے کہہ ڈالو۔

(راج چُپ چاپ سسکے جاتی ہے)

رانی:- محبت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی (راج سے کچھ جانی پہچانی) کچھ کہتی ہی۔ ہر دلعزیز صاحب تو بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج آدمی ہیں۔

(آہستہ پھر کوچ پر بیٹھا دیتی ہے)

راج:- (آنسو پونچھتے ہوئے آہستہ آہستہ) ہنستی ہوں بڑے ہنس مکھ تھے۔ قہقہے لگانے تھے تو مکان کو سر پر اُٹھا لیتے لیکن میں نے اُن کا کبھی قہقہہ نہیں سنا۔ مسکراتے ہیں لیکن اس مسکراہٹ میں خوشی کا تو کہیں ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں چلتا۔

رانی: لیکن وہ تو ... شادی میں تو

راج:- ایک دن میں نے پوچھا ہنستی ہوں آپ جب پہلے قہقہے لگاتے تھے میں نے تو ایک بھی نہیں سنا۔ سب قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔ حالانکہ کھوکھلا سا مرا قہقہہ

رانی:- (سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہوں ۔۔۔

(خود بھی کوچ کے بازو پر بیٹھ جاتی ہے)

راج:- اگر کہیں ہنس بھی رہے ہوتے اور میں چلی جاتی تو اُن کی ہنسی ہونٹوں پر بند ہو جاتی۔ کالے کالے سے بادل اُن کے چہرے پر گھر آتے۔ پھر جو مسکراتے بھی تو اُن کی مسکراہٹ بہت دُور سے آتی ہوئی دکھائی دیتی جیسے اُن کے چہرے پر چھائے ہوئے بادلوں کو چیرنے میں وہ ناکام ہو۔

رانی:- اُنہوں نے تمہیں پسند نہیں کیا۔

راج:- سُنتی ہوں کہ کسی بہت پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ایک تو اُس لڑکی کے ماں باپ نہ تھے دوسرے وہ برہمن نہ تھی اس لئے اُن کے ماتا پتا تیار نہ ہوئے۔ اُنہوں نے بہتیرا سمجھایا لیکن ماں نے ان سب تکلیفوں کا واسطہ دلایا جو انہیں پال پوس کر بڑا کرنے میں اُس نے اُٹھائی تھیں اور باپ نے اُن منی آرڈروں کی رسیدوں کا ڈھیر اُن کے سامنے لگا دیا جو اُن کی تعلیم کے لئے وہ ہر مہینے بھیجتے رہے۔ بارہ ہزار کی رسیدیں تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کا لڑکا اُن کی مرضی کے مطابق شادی کرے۔

رانی:- اور لوگ ماں باپ کی محبت کے گیت گاتے ہیں۔

(اُٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگاتی ہے اور پھر اُس کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے)

رانی:- تو اُنہوں نے تمہیں پسند نہیں کیا۔

راج:- میں کیا جانوں بہن ۔۔۔ لیکن معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اُس لڑکی کو بھلا نہیں سکے۔ میں نے اُن کا دل بہلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ جب اُن کے پاس جاتی تو ایسے بیٹھے رہتے جیسے مجھ سے کوسوں دُور ہوں۔ باتیں کرتے تو معلوم ہوتا جیسے مجھ سے نہیں ہوا سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیٹتے تو لگتا جیسے برف کے پانی میں نہا کر لیٹے ہیں۔

رانی: (صرف لمبا سانس لیتی ہے اور اُٹھ کر کمرے میں گھومنے لگتی ہے)

راج:- لیکن جب میں رونے لگتی تو مجھے بانہوں میں کھینچ کر پیار کرنے لگتے۔ کہتے ۔۔۔ تم بدقسمت ہو راج میں بھی بدقسمت ہوں اور درشنو بھی۔

رانی:- درشنو کون؟

راج:- وہی لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ پورا نام شُدرشن ہے۔ ایم۔ اے ہے اُس نے ابھی تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

رانی: خوب لے جا لڑکی ہے۔

راج: کبھی جب میں کہتی ۔۔۔ آپ جیسے چاہیں تو مجھ سے پیار کریں ۔۔۔ مجھے کبھی نہ ٹھکرائیں تو مجھے بانہوں میں بھر لیتے لیکن صاف محسوس ہوتا جیسے دل سے نہیں محض میرے رونے سے مجبور ہو کر پیار کرتے ہیں۔ اور کبھی اسی طرح پیار کرتے کرتے اپنے بال نوچنے لگتے۔ کہتے ۔۔۔ میں بُزدل ہوں بزدل، غدار اور کیڑا۔ ماں باپ کے خوف سے میں نے اپنی اور تمہاری زندگی تباہ کر دی۔ اور پھر رونے لگتے۔ اُس وقت نہ جانے میرے جی کو کیا ہونے لگتا میں اُنہیں بانہوں میں بھر لیتی لیکن میرے چھونے میں جیسے ہزاروں بچھوؤں کے ڈنک ہوں وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے، مجھے پرے ہٹا دیتے۔ پاگلوں کی طرح چلا اُٹھتے۔ تم مجھ سے کیوں چمٹتی ہو راج ۔۔۔ تم مجھ سے کیوں چمٹتی ہو تمہیں مجھ کو چھوڑ کر چلے جانا چاہیئے، تمہیں میرا کوئی کام نہ کرنا چاہیئے (لمبا سانس لیتی ہے) لیکن میں نہ جانے کیوں جتنا وہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتے اتنا ہی میں اُن کے نزدیک

رہنا چاہتی۔

رانی:۔ (تھکی سی آکر اُس کے پاس کوچ پر بیٹھ جاتی ہے) تو اب وہ تمہارے پاس نہیں آتے۔

راج:۔ نہیں! ہفتہ بھر تک برابر آتے رہے۔ لیکن جب بھی آئے معلوم ہوتا جیسے بندھے بندھے آتے ہیں۔

رانی:۔ (صرف لمبا سانس لیتی ہے)

راج:۔ (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) ایک دن کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔ ایک دوسرے کی خوبیوں کو جان جائیں گے۔ پھر ہم میاں بیوی کی طرح رہنے لگیں گے میاں بیوی کی طرح ایسی زندگی بنائیں گے جس کا ہر سیا دن تھکن اور اکتاہٹ لانے کی بجائے محبت اور رفاقت لائیگا

رانی:۔ تم ایسا ہی کر لیتیں۔

راج:۔ میں نے ایسا ہی کرنے کی کوشش کی لیکن تب ساس جی نے کہا۔ تم تو پگلی ہو۔ وہ تم سے دُور رہنا چاہتا ہے۔ اُس پر اُس چڑیل نے جادو کر رکھا ہے۔ اُس کا من اُڑتا رہتا ہے باندھ کر نہ رکھو گی تو اُڑ جائیگا اور اُڑا ہوا پنچھی پھر ہاتھ نہیں آتا۔ میں نے انہیں کا کہنا مانا۔ جیسا وہ کہتی رہیں میں کرتی رہی۔ لیکن اس کوشش میں جو تھوڑا بہت بندھن تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

(رانی کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن نہیں کہتی۔ ایک لمحے تک دونوں چُپ رہتی ہیں)

——:۔ جُوں جُوں میں ان کے نزدیک جانے کی کوشش کرتی وہ مجھ سے دُور بھاگتے۔ دوپہر کو انہوں نے گھر آنا چھوڑ دیا۔ لنچ کالج ہی منگا لیتے۔ شام کو بھی دیر سے آتے۔ آہستہ آہستہ اس دیر میں اضافہ ہونے لگا۔ بہت رات گئے گھر آتے اور چُپ چاپ بستر پر جا لیٹتے۔ میں چاہتی ان کے پیر دبا دوں، ان کے سُکھ دُکھ کی بات پوچھوں۔ لیکن میری تو شکل سے جیسے انہیں ڈر لگتا۔ "مجھے مت چھیڑو" "مجھے سونے دو" یہی کہتے۔ میں چُپ چاپ رونے لگتی تو پلنگ پر اُٹھ بیٹھتے۔ اور گھنٹوں آنگن میں چکر لگا کر گذار دیتے۔ کبھی چڑ کر کہتے "تم کس مٹی کی بنی ہو۔ تمہیں خود داری کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں، میں تم سے اتنی نفرت کرتا ہوں اور تم میرے پیر دبانا چاہتی ہو۔

رانی:۔ (کمرے میں گھومتے گھومتے رُک کر) میں حیران ہوں تم نے اتنا عرصہ یہ سب کس طرح برداشت کیا۔ میں تو بہت پہلے چھوڑ کر چلی آتی۔

راج:۔ نہ جانے کیوں۔ ان کی اس تمام نفرت کے باوجود مجھے کبھی ان پر غصّہ نہیں آتا جیجی۔ وہ جب کبھی مجھ سے نفرت کا سلوک کرنے کی کوشش کرتے میرے دل میں ہمیشہ ایک رحم کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ اسی جذبے کی وجہ سے میں انکے اور بھی نزدیک جانا چاہتی۔ لیکن جتنا میں انکی طرف جاتی اتنا ہی وہ دور کھنچتے۔

(گلا رندھ جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں)

رانی:۔ (اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھے پر پیار کا ہاتھ پھیرتے ہوئے) راجی ——

راج:۔ (رندھے ہوئے گلے سے) لگاتار روتے جاگتے میری یہ حالت ہوگئی (ہچکی روک کر) گھر والوں سے آنکھ ملاتے ہوئے مجھے شرم آنے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا گویا سب مجھے رحم کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے آہستہ آہستہ انکا رحم نفرت میں بدل رہا ہے۔

رانی:۔ میں کہتی ہوں تم کیوں نہ پہلے ہی چلی آئیں۔

راج:۔ اُمید کا ایک نامعلوم سا تار بندھا ہوا تھا جیجی۔

(کچھ لمحے چُپ رہتی ہے۔ رانی بدستور خلا میں دیکھتی گھومے جاتی ہے، دانت اُسکے بھینچے ہوئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے جیسے غصّہ کا ایک بے پناہ طوفان اُس کے دل میں اُٹھ رہا ہے)

——:۔ پرسوں معلوم ہوا کہ اب ہوسٹل ہی میں رہیں گے —— سپرنٹنڈنٹ ہو گئے ہیں۔ بس وہ تار بھی گیا میں نے رقعہ لکھ کر انہیں دو تین منٹ کے لئے بلوایا اور کہا۔ میرا دل یہاں نہیں لگتا مجھے میکے بھجوا دو۔ کہنے لگے۔ ہاں تم کچھ دنوں کے لئے ہو آؤ۔ اور چُپ چاپ انہوں نے میری سب چیزیں ٹرنک میں بھر دیں۔ ایک چھلا تک ساس کے پاس نہ رہنے دیا۔ اور چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ آئے اس کے بعد وہ جیسے چپ چاپ آئے تھے ویسے ہی چلے گئے نہ انہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور نہ میں ہی کچھ کہہ سکی

کچھ تو مجھ سے سنی۔

رانی۔ سامنے نہیں رہوں گا۔

راج۔ انہوں نے بہت کہا۔ ان کی طرف دیکھتی تو وہاں سے ہلنے کو جی نہ چاہتا۔ میں تو ان کی سیوا ہی میں زندگی گذار دیتی۔ لیکن وہاں آتے ہی تو نہیں دوسرے بھی تو ہیں اور ان سب کی نظروں کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

(برج ناتھ اور تارا چند باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں۔)

تارا چند:۔ تم ضرور کر دیکھو برج ناتھ۔ تم اسکے باپ کے بڑے دوست ہو۔ تمہارا وہ بڑا ادب کرتا ہے۔ تمہاری ہر بات مانتا ہے راتو تمہاری بھی تو بیٹی ہے۔

رانی:۔ چلو آنگن میں چل کر بیٹھیں

(دونوں چلی جاتی ہیں۔ تارا چند آ کر تخت پر بیٹھتے ہیں اور برج ناتھ کرسی پر)

تارا چند:۔ (حقہ گڑگڑا کر) یہ چلم تو بجھ گئی۔ سنتو۔ ارے سنتو۔

سنتو:۔ (آنگن سے) جی سرکار

(بھاگا آتا ہے)

تارا چند:۔ یہ حقہ تازہ نہیں کیا تم نے۔ چلم تو بالکل ٹھنڈی پڑی ہے۔

سنتو:۔ سرکار میں تو تازہ کرکے رکھ گیا تھا، سرکار ہی چلے گئے تھے۔ ابھی لاتا ہوں۔

(چلم لیکر چلا جاتا ہے)

تارا چند:۔ (خالی حقہ کو گڑگڑاتے ہوئے) جب تم سب باتوں سے پوری طرح واقف ہو تو پھر کوشش کیوں نہیں کر دیکھتے میں نے برندا بن سے کہہ رکھا ہے سنتو رام، سردار لال اور دوسرے دوستوں سے بھی کہہ رکھا ہے (رازداری کے لہجے میں) میں خود اس سے یہ بات نہیں کر سکتا۔ اسکو جو شکایت ہے وہ میں دور کرنے کو تیار ہوں لیکن اگر میں خود اس سے پوچھوں گا تو وہ اس شکایت کے وجود ہی سے انکار کر دیگا۔ راتو کو پھر سے بسانے کیلئے تم دلیلیں تو دوسری دو لیکن بڑی صفائی سے اس بات کی طرف اشارہ کردو کہ اگر وہ دونوں الگ رہیں گے تو میں اپنا ایک مکان ان کے نام کردونگا۔ اور کچھ عرصے کے بعد موٹر بھی لے دونگا۔

(سنتو چلم لئے آتا ہے)

سنتو:۔ لیجئے سرکار ایسی بھر کے لایا ہوں کہ دن بھر نہ بجھے۔

تارا چند:۔ (حقہ کا کش لگا کر اور کھانس کر) اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر تم دانائی سے کوشش کرو گے تو یہ بگڑی ہوئی بات بن جائے گی (اور بھی رازدارانہ لہجہ میں) اور پھر بار میں تمہارا جو رسوخ ہے اس کو بھی تم استعمال کر سکتے ہو ــــ دھمکی دینا ہی کافی ہوگا۔ راتو کی زندگی سنور جائے گی اور میں عمر بھر تمہارا شکرگذار رہوں گا۔

(حقے کے لمبے لمبے کش لگاتے ہیں)

برج ناتھ:۔ میں پوری پوری کوشش کرونگا لیکن تمہیں پورا یقین ہے کہ اور کوئی باعث نہیں ہے۔

تارا چند:۔ یوں تو بیسیوں ہیں لیکن یقین کرو اس کی اس ناپسندیدگی کی تہ میں یہی بات کام کرتی ہے۔ وہ مانیگا نہیں لیکن اگر تم دانشمندی سے کام لوگے تو وہ راہ پر آ جائے گا۔

برج ناتھ:۔ میں آج ہی اس سے ملونگا۔

تارا چند:۔ مجھے راتو کی شادی میں بڑا تلخ تجربہ ہوا برج ناتھ۔ اچھے اچھے ہوشیار اور لائق لڑکے میری آنکھوں کے سامنے آئے۔ لیکن میں اسی ضد پر قائم رہا کہ لڑکی اپنے سے بڑے گھرانے میں جاتے۔ میں کیا جانتا تھا کہ باہر سے بڑے نظر آنے والے بہت سے گھرانے اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔

برج ناتھ:۔ میں تو شروع ہی سے اس بات کے حق میں تھا ہوں کہ گھرانے کی بجائے لڑکا دیکھا جائے۔

تارا چند:۔ (ایک لمبا کش لگا کر) راجی کے لئے میں نے لڑکا ہی دیکھا ہے۔ مدن کے پتا بے حد غریب تھے۔ اپنی آدھی پنشن بیشگی لے کر انہوں نے مدن کو تعلیم دلوائی۔ اور ان کی سب محنت اور قربانی سپھل بھی ہوئی۔ ایم۔ اے کرتے ہی اُسے کالج میں جگہ مل گئی۔ اب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہا ہے۔ اتنا نیک سمجھدار ہنس مکھ اور خوش اطوار لڑکا ہے کہ جو کوئی اس سے چند منٹ باتیں کر لیتا ہے اُس کے گیت گانے لگتا ہے۔

برج ناتھ:۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ راج اتنے اچھے گھر بیاہی گئی۔

تاراچند:۔ مدن تو گائے ہے گائے۔ راج وہاں سچ مچ راج کرے گی۔

(مسرت سے حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں شورام گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

شورام:۔ تاراچند تم نے سنا تمہارا داماد دوسری شادی کر رہا ہے۔

(حقے کی نے تاراچند کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتی ہے اور وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

تاراچند:۔ (آدھے بیٹھے آدھے اٹھے ہوئے) کون، ترلوک!

شورام:۔ نہیں مدن۔

(تاراچند پھر دھم سے تخت پوش پر بیٹھ جاتے ہیں آنگن سے کسی کے گرنے اور رانو کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

رانی:۔ پتاجی، پتاجی......

شورام:۔ میں کہتا ہوں تم بیٹھ کیا گئے ہو تاراچند اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو ابھی کار لے کر چلو۔ کھاتی والوں کی دھرم شالہ میں ہو رہی ہے شادی۔ مجھے تو سنتو پنڈت سے معلوم ہوا۔ اُس کا وہ سر پھرا لڑکا گیا ہے بیاہ پڑھانے۔

تاراچند:۔ (فوراً اٹھ کر) سنتو ـــ سنتو ـــ

(سنتو بھاگا آتا ہے)

رانی:۔ (آنگن سے) پتاجی! پتاجی!!

تاراچند:۔ کار لے جاؤ اور تنبولڑی سے بجلی پہلوان اور چند دوسرے مزدوروں کو لے کر کھاتی والوں کی دھرم شالہ میں پہنچو۔ میں تمہاری کار میں چلتا ہوں شورام۔

شورام:۔ میں تو پہلے ہی بھاگا آیا ہوں۔

برج ناتھ:۔ چلئے میں آپ کو اپنی کار میں لے چلتا ہوں۔

تاراچند:۔ کیا یہ شادی مدن کے پتا کی مرضی......

شورام:۔ چلو چلو میں سب بتاتا ہوں۔

(سب جلدی جلدی نکل جاتے ہیں)

رانی:۔ (آنگن سے) پتاجی پتاجی... سنتو... پورن

(باغیچے کے دروازے سے پورن بھاگا آتا ہے)

پورن:۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے۔

(اندر کی طرف بھاگا جاتا ہے)

رانی:۔ (آنگن سے) راجی بیہوش ہو گئی ہے دیکھو تو اس کے دانت بھچی ہو گئے ہیں۔

(دوسرے لمحے پورن اور رانی بیہوش راج کو اٹھائے ہوئے آتے ہیں)

پورن:۔ بات کیا ہوئی۔

رانی:۔ بس کھڑے کھڑے گر پڑی۔

(اسے تخت پر لٹا دیتے ہیں)

پورن:۔ گھبراؤ نہیں پیک کر تھوڑا سا پانی لے آؤ۔

(رانی جاتی ہے)

ـــــ:۔ ایک چمچہ بھی لیتی آنا۔ (راج کو ہلاتے ہوئے) راجو۔ راجو۔

(راج بیہوش ہے)

ـــــ:۔ راجو راجو....

(اٹھ کر بجلی کا پنکھا چھوڑ دیتا ہے۔ رانی پانی لاتی ہے)

رانی:۔ ارے تم نے پنکھا چھوڑ دیا۔ یہاں تو پہلے ہی ٹھنڈ ہے۔

پورن:۔ تم فکر نہ کرو۔ پانی لاؤ۔ اس کے منہ پر چھینٹے دوں۔

(رانی پانی دیتی ہے پورن راج کے چہرے پر چھینٹے دیتا ہے)

ـــــ:۔ راجی... راجی...

(راج بدستور بیہوش ہے)

ـــــ:۔ (پھر چھینٹے دیتا ہوا) راجی . راجی...

(راج نہیں ہلتی بیہوش پڑی رہتی ہے)

ـــــ:۔ ذرا چمچہ دو۔

رانی:۔ میں بھول گئی۔ ابھی لائی۔

(بھاگ جاتی ہے)

پورن:۔ (اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا) راج . راجی... (رکہتی تھی میں بڑی خوش ہوں سسرال میں۔

(رانی چمچہ لے آتی ہے)

رانی:۔ لو یہ چمچہ۔

پورن:۔ تم ذرا اس کی ناک انگلیوں میں دباؤ۔ میں پانی کا چمچہ
مُنہ میں ڈالتا ہوں۔
(رانی راج کی ناک دباتی ہے)
———۔ (چمچہ مُنہ میں ڈالتا ہوا) یہ ہسٹریا کا دورہ ہے یا کچھ
اور۔ پہلے تو کبھی ایسے غش نہ پڑتے تھے۔

رانی:۔ دانت بھنچے ہیں۔ پانی تو بہ گیا سارا۔

پورن:۔ تم فکر نہ کرو۔ ناک دبائے رکھو۔
(رانی ناک دبائے رکھتی ہے۔ سانس کے رک
جانے سے راج کے دانت کھل جاتے ہیں۔ پورن
پانی کا چمچہ مُنہ میں ڈالتا ہے کچھ لحظ بعد راج
تیز تیز سانس لینے لگتی ہے۔ وہ دوسرا چمچہ منہ
میں ڈالتا ہے، بیہوشی میں غرغراہٹ کے ساتھ
راج پانی پی جاتی ہے)
———:۔ راجی۔ ۔ راجی۔ ۔

رانی:۔ راجو۔ ۔ راجو۔
(راج پورے طور پر تو ہوش میں نہیں آتی لیکن
پہلے اُس کا ایک ہاتھ ہلتا ہے۔ پھر اسکی آنکھیں
کھل جاتی ہیں)

پورن:۔ (پیار سے) راجو کیا بات تھی چکر آ گیا تھا۔
(راج اُٹھنا چاہتی ہے۔ پورن اپنے بازو کے
سہارے سے اسے اُٹھا کر بٹھا دیتا ہے)
———:۔ کامریڈ بہاری لال آ گئے، میں اُن کے ساتھ باتوں میں
اُلجھ گیا۔ بات کیا ہے اتنی کمزور ہو رہی ہو تم۔ کبھی آئینہ
لے کر اپنی شکل نہیں دیکھی۔ کھانے کو نہیں دیتے رہے
جیجا جی تمہیں۔

رانی:۔ تمہارے جیجا جی دوسری شادی کر رہے ہیں۔

پورن:۔ کون ——۔ ۔ ۔

رانی:۔ مدن۔

پورن:۔ مدن ——
(چونک کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سہارا ہٹ جانے
سے راجی پھر لیٹ جاتی ہے)

رانی:۔ ابھی چچا شو رام نے بتایا۔ کھائی والوں کی دھرم شالہ میں
ہو رہی ہے شادی۔ پتاجی، چچا شو رام اور برج ناتھ کے
ساتھ وہیں گئے ہیں۔
(پورن کرسی میں دھنس جاتا ہے)

پورن:۔ (خفگی اور اُداس آواز میں) میں نے پہلے ہی کہا تھا۔
شادی سے پہلے بھی اُڑتی اُڑتی خبر میں نے سنی تھی کہ پروفیسر
مدن کسی دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔

رانی:۔ ایم۔ اے پاس لڑکی ہے۔ جس کے نہ ماں ہے نہ باپ۔

پورن:۔ شادی کیلئے نہ ماں کی ضرورت ہے، نہ باپ کی۔

رانی:۔ ذات کی بھی وہ کھتری ہے۔

پورن:۔ ذات کا بھی شادی سے کوئی تعلق نہیں۔ شادی کے لئے
صرف ساتھی چاہیئے —— ہمدرد، ہم خیال، پسندیدہ ساتھی
اور میں نے پتاجی سے کہا تھا کہ آپ مدن کے پتا سے بات
کرنے کی بجائے مدن سے اچھی طرح بات کر دیکھئے اُس کے
خیالات کو جانیئے —— آپ نے اپنی طرف سے پڑھا لکھا،
نیک، برسر روزگار لڑکا ڈھونڈ لیا یہ کبھی دیکھا اس کی
ضروریات کیا ہیں لیکن پتاجی تو مجھے سمجھتے ہیں آوارہ اور
سرپھرا! کہنے لگے "میں لڑکے کے پتا سے ملا ہوں، بڑے
نیک آدمی ہیں، غرور تو اُن میں نام کو بھی نہیں ہے ملاقات
ہوئی تو کہنے لگے —" میں تو آپ کو پا کر دھنیہ ہو جاؤں گا"
میں نے کہا آپ نے لڑکے کے پتا کی ضروریات جان لیں،
لڑکے کی ضروریات بھی تو جانیئے۔ وہ بھی آپ کی لڑکی کو پا کر
دھنیہ ہوگا یا نہیں۔

راج:۔ (نحیف آواز میں) کیا میں اُن کی ہمدرد نہیں مجھ سے
بڑھکر اُن کا کون ہمدرد ہے۔

پورن:۔ لیکن شاید تم ان کی ہم خیال نہیں ہو۔ وہ پروفیسر ہیں
اور وہ ایم۔ اے دونوں ایک دوسرے کے مذاق کو ایک
دوسرے کی طبیعت کو سمجھتے ہونگے۔ تم شاید انکی ضرورت
کو نہیں جان سکتیں اور وہ بھی شاید تمہاری ضرورت کو
نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے پتاجی سے یہی کہا تھا۔ آپ نے راجی کو
اونچی تعلیم نہیں دی اور اُس کی سب سے بڑی خوبیاں یہ
ہیں کہ وہ اچھا کھانا پکا سکتی ہے۔ اچھے کپڑے سی سکتی ہے
کئی نمونوں کے سویٹر بُن سکتی ہے۔ میز پوش اور پلنگ پوش
کاڑھ سکتی ہے اور گھر کا کام نہایت خوش اسلوبی اور
کفایت سے چلا سکتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کی یہی

جوبیاں وہاں جاکر خامیاں بن جائیں! لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ کہنے لگے "تمہیں پڑھاکر جو میں بہت سکھی ہوگیا ہوں جو اب لڑکیوں کو پڑھاؤں گا"۔
میں نے کہا "اس صورت میں اس کی شادی اتنے پڑھے لکھے سے نہ کیجئے"۔ کہنے لگے "تو میرا بیٹا ہے یا باپ"۔ (زہر خند سے) جیسے ان کے باپ ہونے سے میری بات غلط ثابت ہوگئی۔

رانی:۔ میں پوچھتی ہوں پتا جی تو اتنے پڑھے لکھے نہیں۔ پروفیسر مدن تو کافی پڑھے لکھے ہیں۔ جب وہ ایک لڑکی کو چاہتے تھے تو کیوں کی یہاں شادی۔

پورن:۔ (کندھے جھٹکا کر) کہہ نہیں سکتا لیکن شاید..

راج:۔ (نحیف آواز میں) میں جانتی ہوں۔ ماں باپ کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے۔

رانی:۔ (طنز سے) تو پھر اس احسان کو اتنی جلدی کیوں بھول گئے؟ نبھائے جاتے۔

راج:۔ میں نے بھی ایک دن یہی پوچھا تھا کہنے لگے۔ میرے لئے شادی کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ میرا خیال تھا میں اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دونگا۔ اپنے ماضی کے لئے میں بالکل مرجاؤنگا۔ لیکن میں مر نہیں سکا اور جی بھی نہیں سکا۔ میں اپاہج ہوگیا ہوں۔ تم اس آدمی کا خیال کرو جو خودکشی کی کوشش میں اپاہج ہوجائے۔

رانی:۔ تو اب دوسری شادی کرکے وہ جی جائیں گے۔

راج:۔ شاید اُن کا خیال ہو کہ وہ اپاہج نہ رہیں گے۔

رانی:۔ اپنی شان و شوکت سے آئے تھے خودکشی کرنے۔

راج:۔ شان و شوکت اُن کے رشتے داروں کی وجہ سے تھی۔

رانی:۔ اتنا ہنستے تھے۔ قہقہے لگاتے تھے

راج:۔ وہ سب تو خول تھا۔ دل تو وہ پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔

رانی:۔ لیکن تمہارے متعلق اُنہوں نے کیا سوچا۔ تمہارا بھی تو اُن پر حق ہے تم اُنکی بیاہتا بیوی ہو۔

راج:۔ ایک دن ساس کے کہنے پر اُن کے پاس گئی تھی۔ اُداس تھکے تھکے سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے ہنسکر کہا درشنو کی بات سوچ رہے ہو۔ ایک اُداس سی مُسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ میرا بھی حق ہے میں آپکی بیاہتا بیوی ہوں۔ اتنے باراتیوں کے سامنے اگنیہ کی اگنی کو ساکشی کرکے آپ مجھے بیاہ لائے ہیں۔ کہنے لگے۔ تمہارے حق کی بنیاد محض ایک بیرونی رسم ہے۔ دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ درشن کا حق میرے دل سے تعلق رکھتا ہے۔ باراتیوں نے، پنڈت پروہتوں نے، ہمارے ماتا پتا نے، اگنیہ کی اگنی نے، ہم کو ایک دوسرے کے جسم سونپ دئے ہیں دل تو نہیں سونپے۔

پورن:۔ یہی میں کہا کرتا ہوں۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں شوہروں سے دل ہی دل میں نفرت کرنے کے باوجود بظاہر ان پر اپنا سب کچھ قربان کردیتی ہیں۔ اور نہ جانے کتنے شوہر اپنی بیویوں سے سخت نفرت کے باوجود ان سے نبھائے جاتے ہیں۔

راج:۔ کہتے تھے۔ میرے دل پر درشن کا اختیار تھا میں نے سوچا اسے وہاں سے ہٹا کر تمہیں بٹھا لوں گا۔ لیکن میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

رانی:۔ عجب بے شرم لڑکی ہے یہ درشنو بھی۔ جب اُنہوں نے اُسکی اتنی ہتک کرکے تم سے شادی کرلی تو وہ کس طرح اُن کا پیچھا پکڑے ہوئے ہے۔ میں تو ایسے شخص سے کبھی زندگی بھر بھی کلام نہ کرتی۔

راج:۔ شاید وہ اب بھی ان سے محبت کرتی ہے۔

رانی:۔ میں لاکھ محبت کرتی لیکن اتنی ہتک کے بعد اپنی خودداری کو چھوڑ کر یوں انکے پیچھے ماری ماری نہ پھرتی۔

راج:۔ جب دھوپ چمکتی ہے تبھی تو برسوں کی جمی ہوئی برف پگھل اُٹھتی ہے۔

(ایک لمحے کیلئے سب چپ رہتے ہیں)

رانی:۔ لیکن آخر تو کریگی کیا؟

راج:۔ پرماتما کو جو منظور ہوگا۔

رانی:۔ پرماتما کو یہی منظور رہا ہے کہ مرد عورتوں پر ظلم کریں۔ سڑے ہوئے پھول یا پھل کی طرح اُٹھا کر پھینک دیں۔ پرماتما۔۔۔

(برامدے سے پنڈت تاراچند کی آواز آتی ہے)

تاراچند:۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں برج ناتھ۔ اس طرح آسانی سے میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں راجی کو اسی وقت وہاں

بھیج دونگا۔ اُس نے سمجھا ہوگا کہ شاید وہ اس طرح آسانی
سے نکل جائیگا۔ اُسے راجی کو گھر میں بسانا ہوگا۔
(اندر داخل ہوتے ہیں)

تاراچند:۔ ارے یہ راجو کیوں اس طرح پڑی ہے۔ طبیعت تو
اس کی ٹھیک ہے۔

رانی:۔ اسے غش آ گیا تھا۔

تاراچند:۔ اس حالت میں غش نہ آتا تو اور کیا ہوتا۔ (نوکر کو آواز
دیتے ہیں) سنتو، سنتو ——

سنتو:۔ (باہر کے دروازے سے آتا ہوا) جی سرکار۔

تاراچند:۔ بھاگ کر بازار سے چار چھ آنے کا گاجر کا مربعہ اور
کچھ چاندی کے ورق لے آ۔ یہ بہت کمزور دکھائی دے
رہی ہے۔
(سنتو جی سرکار کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے)

——:۔ (راج کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتے ہوئے) تو کسی طرح
چنتا نہ کر بیٹی وہ اُس مادر پدر آزاد لڑکی کے پھندے میں
پھنس گیا ہے۔ اس بیسوا نے .....

پورن:۔ ایک شریف لڑکی کو بیسوا کہتے ہوئے آپکو جھجک

تاراچند:۔ چُپ رہو۔ وہ بیسوا نہیں تو اور کیا ہے۔ جو لڑکی ایک
شادی شدہ مرد کے ساتھ ننگے سر، ننگے مُنہ، مہین کپڑے
پہنے، ہونٹ مُنہ رنگے، آوارہ گھومتی ہے، جسے نہ اپنا
خیال ہے نہ شریف گھرانے کی دوسری لڑکی کا، وہ بیسوا
نہیں تو اور کیا ہے۔ میں کہتا ہوں بیسواؤں میں بھی اتنی
شرم ہوتی ہوگی! کیوں برج ناتھ! ملن اس بیسوا
کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ لیکن جلدی ہی اُس سے
مُکتا جائیگا میں لکھے دیتا ہوں۔

برج ناتھ:۔ یہ تو ایک ظاہری کشش ہے تاراچند، چند ہی دنوں
میں زائل ہو جائے گی۔

تاراچند:۔ اس کی تو ساری تنخواہ اُس کی ایک ساڑھی پر خرچ
ہو جلئے گی۔

پورن:۔ آخر آپ کیا فیصلہ کر آئے۔

تاراچند:۔ میں مار مار کر بھگا دیتا سب کو لیکن شادی ہو چکی
تھی۔ ایک بھی بھانوراکم رہ جاتا تو میں زبردستی رُکوا دیتا۔
بجلی پہلوان تو پھر کس بات کے رکھ رکھا سکو۔ لیکن راجی کا خیال

آ گیا۔

رانی:۔ آپ نے اُن سے پوچھا نہیں کہ اگر تمہیں اسی لڑکی سے شادی
کرنا تھی تو کسی دوسری شریف لڑکی کی زندگی کیوں خراب کی۔

تاراچند:۔ پوچھا نہیں —— میرے سوالوں کے مارے ناطقہ بند
ہو گیا پروفیسر صاحب کا۔ بات تک نہ مُنہ سے نکلی۔ میں
چاہتا تو انکے اور انکے حمایتوں کے ہوش ٹھکانے کر دیتا
لیکن پنڈت اسے شنکر وہاں پہنچ گئے۔ انہیں اس لڑکے کے
کرتوت کا انہیں بھی اسی وقت پتہ چلا تھا۔ پگڑی اُتار کر انہوں
نے میرے قدموں پر رکھ دی اور کہنے لگے —— لڑکے سے
غلطی ہو گئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں ہماری بیٹی کو کسی طرح کی
تکلیف نہ ہونے پائیگی۔ چند دن کی بات ہے۔ اس لڑکی کا
جادو اُترا کہ وہ اسی کے قدموں پر جا گریگا۔

برج ناتھ:۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ جوانی کے جوش میں لڑکے کئی بار
ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔

رانی:۔ تو کیا اس شادی کے باوجود آپ راجی کو وہاں بھیجیں گے۔

برج ناتھ:۔ نہیں تو کیا بیٹا اُس چڑیل کے پاؤں وہاں جمنے دئے
جائیں گے۔ اِسوقت وہ راجی کو بھی رکھنے کیلئے تیار ہے۔

پورن:۔ لیکن انہوں نے راجی میں کچھ نقص تو بتایا ہوگا۔

برج ناتھ:۔ کچھ نہیں۔ اُس پر اُس لڑکی کا جادو سوار ہے۔ وہ
کہتا ہے راجی میں اور مجھ میں کسی طرح کی ذہنی رفاقت
نہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ ذہنی رفاقت ایک مہینے میں
نہیں ہو جاتی۔ سدرشن کو آپ ایک برس سے جانتے ہیں۔
راجی کو آپ ایک برس دیکھئے جہاں تک میرا خیال ہے اُسنے
یہ کام اپنے پتا سے بدلہ لینے کی خاطر کیا —— وہ یہاں شادی
نہ کرنا چاہتا تھا انہوں نے مجبور کیا۔ اسی کے خلاف انتقام
کا یا غصّہ کا اظہار ہے یہ شادی!

پورن:۔ لیکن اس گھریلو جھگڑے میں ایک دوسری معصوم
زندگی تباہ کرنے کا اُسے کیا حق تھا۔

رانی:۔ اور اس بے عزتی کے بعد راجی ہی کیوں وہاں رہے۔

برج ناتھ:۔ راجی کا وہ گھر ہے۔ اُس پر اسکا حق ہے اگر پتی ایک
غلطی کرتا ہے تو پتی برتا استری کو اُسے کشما کر دینا چاہیئے۔

رانی:۔ لیکن اگر استری ایسی غلطی کرتی ہو تو کیا پتی اُسے معاف
کر دیتا ہے؟

تاراچند:۔ رانی ـــــ

برج ناتھ:۔ اگر راجی اس وقت چلی جائیگی اور ایمان کے خیال کو چھوڑ کر سمجھداری اور دانائی سے کام لے گی تو وہ اپنے پتی کو اس لڑکی کے برے اثر سے بچا سکے گی۔ (راجی سے) دیکھو بیٹی تمہارے شوہر نے ایک غلطی کی۔ تم دوسری غلطی نہ کرنا۔ اُس کی غلطی کو معاف کر دینا۔ اُسے ایسا لینا۔ اُسے اُس کی غلطی یاد نہ دلانا۔ اس لڑکی کو کبھی نہ کوسنا ـــــ یہ کام تم اپنے ساس سسر کیلئے چھوڑ دینا۔ اگر وہ اس لڑکی کے پاس جائے تو اُسے نہ روکنا۔ اگر وہ لڑکی تمہارے پاس آئے تو اس سے نفرت کا سلوک نہ کرنا۔ اگر تم ایسا کروگی تو آخر میں جیت تمہاری ہوگی اس لڑکی سے وہ چند دن میں اُکتا جائیگا۔

پورن:۔ لیکن وہ لڑکی اب محض دوسری لڑکی نہیں اُن کی بیاہتا بیوی ہے۔

رانی:۔ کیا آپ راجی کو سوت سمجھیں گے۔

برج ناتھ:۔ ماتا کوشلیا کی ایک کی بجائے دو سوتیں تھیں۔

پورن:۔ لیکن دسرتھ راجہ تھے۔ آپ عام آدمیوں کی بات کریں۔ اور پھر کوشلیا ہی کونسی سکھی رہیں۔ چودہ برس تک روتے روتے اُنکی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ راماین میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا؟

تاراچند:۔ (انتہائی غصے سے) پورن۔

رانی:۔ جس شخص نے راجی کی اتنی ہتک کی، کسی قصور کے بغیر دوسری شادی کرلی اس کے پاس جانے کو اُس کی خدمت کرنے کو آپ سمجھ کہتے ہیں۔

برج ناتھ:۔ بھگوان شنکر کی طرح ہندو دلہنوں نے بارہا جان بوجھ کر ہلاہل پیا ہے۔

پورن:۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ زہر پینا ہی کیوں ضروری ہو۔

تاراچند:۔ (جھنجھلا کر) تو کیا تم چاہتے ہو کہ وہ ساری عمر یہاں بیٹھی کڑھتی رہے۔

رانی:۔ کڑھتی کیوں آپ اسے پڑھائیے لکھائیے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھائیے۔

برج ناتھ:۔ بیٹا پڑھانا لکھانا لڑکی کو مالی طور پر آزاد بنانے کیلئے ہوتا ہے۔ لیکن شادی کا صرف یہی پہلو ہی تو نہیں دوسرا بھی ہے۔ اگر شادی کا صرف مالی پہلو ہی ہوتا تو راجے مہاراجے کبھی اپنی لڑکیوں کی شادیاں نہ کرتے۔

پورن:۔ راجی کی دوسری شادی ہو سکتی ہے۔

تاراچند:۔ } پورن!
برج:۔ } چپ!

پورن:۔ مرد ایک عورت کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرسکتا ہے تو عورت کیوں نہیں کرسکتی اور خاص طور پر مرد کے ٹھکرا دینے پر۔

برج:۔ قانوناً ہندو شادی نہیں ٹوٹ سکتی۔ قانون راجی کو اس بات کی اجازت نہ دے گا۔

پورن:۔ پروفیسر بدن دیو دینگے۔

راجی:۔ (درد و کرب سے ـــ جیسے اس ذکر ہی سے اُسے تکلیف ہو رہی ہو) بھیا ـــــ

تاراچند:۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اب برہمنوں کی لڑکیاں بیسوائیں بنیں گی۔

پورن:۔ تب برہمنوں کی لڑکیاں کیا ـــ

تاراچند:۔ (گرج کر) چپ رہو۔

راجی:۔ میں جاؤں گی پتا جی۔ آپ مجھے خود ابھی جا کر وہاں چھوڑ آئیے۔

رانی:۔ گیلی لکڑی کی طرح تمہیں سلگنا پسند ہے، سوکھی کی طرح بھڑک کر جلنا پسند نہیں۔

راجی:۔ میں یہاں بھی سلگتی ہی رہونگی جیجی۔

(برندابن خوش خوش داخل ہوتا ہے)

برندابن:۔ تاراچند بدھائی ہو۔ منہ میٹھا کراؤ۔ اور راجو کو تیار کردو۔

تاراچند:۔ کیا تریلوک سے تم ملے۔

برندابن:۔ میں کہتا ہوں میں نے اس صفائی سے بات کی کہ نہ صرف وہ مان گیا بلکہ راجو کو لینے کیلئے آرہا ہے۔

تاراچند:۔ میں تمہارا زندگی بھر احسان مند رہونگا برندابن۔ تم نے میرے خاندان کو اس کلنک کے ٹیکے سے بچالیا۔ تم نے نہ صرف راجو کی زندگی سنواری بلکہ میری بھی سب سے بڑی چنتا دور کردی۔ یہ بتاؤ کہ یہ معجزہ ہوا کیسے۔

برندابن:۔ ایک دن اپنے لڑکے کا ذکر کرتے کرتے میں نے باتوں

باتوں میں ترلوک نے اُس کی شادی اور گھریلو زندگی کی بات چلادی۔ اور اُس کی قسمت کو سراہا کہ اُسے رانی جیسی شریف اور اچھے گھرانے کی سوشیل اور تعلیم یافتہ لڑکی مل گئی ہے۔ اس پر حل کر وہ اپنی ساہنا زندگی کی ناکامی کا رونا رونے لگا۔ اُس نے رانی کے متعلق شکایات کا ایک دفتر کھول دیا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ جہاں کنبے اکٹھے رہتے ہیں وہاں بہوؤں کے خلاف یہ شکایات عام ہیں۔ سو میں سے شاید ہی ایک بہو ایسی ملے جس کے خلاف یہ شکایتیں نہ ہوں۔

تاراچند :- (تشکر اور تعریف کے لہجے میں) پرماتما تمہارا بھلا کرے۔

برندابن :- (داد سے خوش ہوکر) اس پر وہ جھینپا۔ پھر کہنے لگا۔ اس حالت میں جبکہ میں نے پریکٹس ابھی حال ہی میں شروع کی ہے میرے لئے الگ گھر بسانا مشکل ہے۔ میں نے کہا اگر تم الگ رہنا چاہو تو تمہارے سسر ہی تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ ان کا بڑا سا مکان کچہری روڈ پر واقع ہے۔ ایک دن وہ ذکر بھی کر رہے تھے کہ شادی کے موقعے پر چند ایک وجوہات سے میں اُسے رانی کے نام نہ کر پایا۔ اگر تم اور رانی اُدھر اُٹھ آؤ تو وہ بہت خوش ہونگے۔ مکان تم لوگوں کو دے دیں گے۔ اور یوں بھی وہ ہر طرح تمہاری مدد کرتے رہیں گے۔

تاراچند :- پرماتما تمہارا بھلا کرے۔

برندابن :- اس پر وہ مان گیا اور خود ہی کہنے لگا کہ دراصل سو میں اسّی فیصدی زندگیوں کی ناکامی کنبوں کے ایک ہی جگہ اکٹھے رہنے کے سبب ہوتی ہے۔ نئے گھر میں آکر نئی بیاہی لڑکیوں کو اپنی شخصیت کو نئے سرے سے ڈھالنے کی مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جب بار بار وہ اس کوشش میں ناکام رہتی ہیں تو انہیں ہردم ساس نندوں کے طعنوں تشنوں کا شکار رہنا پڑتا ہے ـــــــ اور میں تمہیں سچ بتاؤں، کہنے لگا۔ میں تو دراصل رانو کو دل سے محبّت کرتا ہوں لیکن ماں باپ اور بہنوں کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

برج ناتھ :- اور کیا۔ یہ انپڑھ ساس نندیں جو نہ کریں تھوڑا ہے۔

برندابن :- بس اُس دن تو اتنی بات کہہ کر چلا آیا آج ملنے گیا تو معلوم ہوا اس عرصے میں باپ بیٹے میں باقاعدہ جنگ ہو چکی ہے۔ لڑکے کی اس تجویز کو سُن کر کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو جائیگا باپ نے اُسے بیدخل کرنے کی دھمکی دی ہے اس پر وہ بھی تن گیا۔ اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ تنگی سے گذارہ کر لیگا لیکن رانی کو لے کر الگ ہو جائیگا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ تمہارے سسر تمہاری ہر طرح مدد کریں گے۔ رانی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تمہاری بیحد اچھی رفیق ثابت ہوگی۔ اُس نے کہا تھا میں ابھی رانی کو لینے کیلئے جانے کی سوچ رہا ہوں۔ بس یہ سُنکر میں سیدھا اِدھر بھاگا آیا ہوں۔ آج وہ کسی وقت بھی رانی کو لینے کے لئے آسکتا ہے۔ لو اب کراؤ مُنہ میٹھا۔

تاراچند :- (اُٹھکر اُسے آغوش میں کھینچ لیتا ہے) اس احسان کا بدلہ کس طرح چکاؤں۔ تم نے مجھے زندگی بھر کے لئے خرید لیا ان سفید بالوں کی عزت رکھ لی تم نے برندابن۔ (پورن سے) کیوں پورن میں نہ کہتا تھا برندابن اسے راہ پر لے آئیگا۔ دانا لوگ یوں بگڑی بات بنا لیتے ہیں۔ اور تم کہتے تھے (نقل اُتار کر) میں اس سے بات تک کرنا اپنی ہتک سمجھتا ہوں۔

پورن :- میرا خیال اب بھی وہی ہے۔

تاراچند :- (مُنہ چڑاتے ہوئے) میرا خیال اب بھی وہی ہے شرم تو نہیں آتی۔ (رانی سے) چلو رانو تیاری کر و بیٹا۔

رانی :- آپ نے انہیں مکان کا لالچ دیا ہے۔

تاراچند :- لالچ ـــــــ وہ تو میں تم لوگوں کے نام کرنے ہی والا تھا۔

رانی :- (اور بھی سختی سے) آپ نے انہیں مکان کا لالچ دیا ہے۔

تاراچند :- تم تو پاگل ہو۔ وہ تو میں تمہارے ہی نام کرونگا لیکن بیٹا استری کا دھن اُس کے پتی ہی کا تو ہوتا ہے۔ تم اور ترلوک کوئی دو ہو۔

رانی :- نہ میں اُنکا گھر چاہتی ہوں نہ آپ کا مکان۔

تاراچند :- کیا .. !.... !....

رانی :- میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔

تاراچند :- پاگل ہوگئی ہے۔

رانی :- جس شخص کے نزدیک چند ہزار کے ایک مکان کی وقعت میری عزت سے کہیں زیادہ ہے جو مجھے نہیں مکان کو چاہتا

ہے۔ میں اس لڑکی کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی

تاراچند:- (غصہ سے) رالو ———

برندابن:- ہم سب دو لوگ ان سب باتوں سے ہی [illegible] سب نہیں بولیں۔

پورن:- چاہے وہ ان کتنا بھی ظالم کیوں نہ ہو۔

تاراچند:- پورن ——

برندابن:- تم لوگ غلط سمجھتے ہو۔ وہ ظالم نہیں، وہ لڑکی ہی نہیں وہ تو بیچارہ کالے ہے۔ سارا قصور دراصل اُس کے ماں باپ کا ہے۔

پورن:- (طنز سے) بیچارہ کالا ہے ——

برندابن:- راٹو وہ دراصل تم سے محبت کرتا ہے۔ دل میں تمہاری عزت کرتا ہے۔ تمہارا خیال تو وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑنے کو بھی تیار ہے۔

رانی:- میں نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ اپنے ماں باپ سے الگ ہو، اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیں لیکن اس قدر ہے اگر وہ ایک مکان ہمیں سکیں تو انہیں اس [illegible] دھندوں سے بھی عار نہ ہوگا۔ آپ کہتے ہیں وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اگر مکان کے ساتھ آپ ہمیں سو روپے کر دینے کا بھی وعدہ کریں تو وہ میری پوجا تک کرنے لگیں گے۔

راج ناتھ:- (رطان کے انداز میں) رانی بیٹی ...

رانی:- میں پوچھتی ہوں اس طرح کا شادی آپ کب تک کرتے رہیں گے ہیں۔ اور میں ہی ایسے دیتی ہیں اسی لئے کہ [illegible]

تاراچند:- (بڑی مشکل سے اپنے آپ پر ضبط کا قابو رکھتے ہوئے) تو آج تو جانا ہے کیا؟

رانی:- میں وہاں نہیں جانا چاہتی

تاراچند:- (ضبط کو ہاتھ سے دیتے ہوئے) نہیں جانا چاہتی

رانی:- جو شخص میری اتنی بے عزتی کر سکتا ہے۔ میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔

تاراچند:- (گرج کر) تو اسے یہ بتا دو۔

رانی:- (بے خوفی سے) میں اس سے سخت نفرت کرتی ہوں۔

تاراچند:- (ضبط کو ہاتھ سے جانے دیتے ہوئے) تو یہ بیٹی کا بدلہ ہے اور میں خاموشی سے تیرے منہ کی طرف دیکھتا ہوں

تو نہیں جانتی کہ اپنے پتی کے خلاف سننے میں کتنی بُری بات ہے۔ ایک بڑا پاپ ہے۔ تو نہیں جانتی کہ تو نے ان کے گھر میں جنم لیا ہے، مجھے تک شرم آ رہی ہے کہ ایسے گھر میں پیدا نہیں ہوئی۔

پورن:- جہاں تک سنسکار کا تعلق ہے، پتی اور چنڈال میں کوئی فرق نہیں۔ اور پھر پتی کی لڑکی کا دل [illegible] لڑکی سے بڑا نہیں ہوتا اور یہ دنیا ختم ہوتا ہے اور سچ ہی۔

تاراچند:- جب تمہارا اور تمہارا فلسفہ ہے تو ایسی باتیں ہوں گی۔ رانی یہ ادا ہے، تم ادھر اپنی بات کے دامن سے تو اپنی ادھرم کی بات کرتی ہے اور وہ دونوں ملا کر کھڑا کر لے گا۔

رانی:- آپ کے دھرم کی بات میں نے بہت سُنی ہیں۔ آپ کا دھرم بھی مردوں کا دھرم ہے۔

برندابن:- میں کہتا ہوں بیٹی، یہ لوگ درحقیقت تمہاری عزت کرتا ہے۔

رانی:- میں اُس شخص کو آپ سے بہتر جانتی ہوں۔

راج ناتھ:- تمہارے فائدے ہی کے لئے تو یہ مکان تمہارے نام کر رہے ہیں بیٹی

رانی:- آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مکان میرے نام کر کے مجھ پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ میرے لئے ہمیشہ کے لئے علاج کا خیال رہے۔ مجھے اس سے ساتھ رہنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ جس کے لئے میرے دل میں کوئی عزت نہیں رہی۔ یہ مجھے کہ اس مکان میں دو آدمی ہیں، جہاں گھٹ گھٹ کر میں [illegible] ہوئی ہوں۔ ان کو نام پر ان کے گلے ہم کو کوئی دیتے ہیں چاہیے اتنی بڑی اس مکان میں گھٹ گھٹ کر مر جائے۔

تاراچند:- (اپنی غصے) رالو ———

رانی:- (خود سے ہاتھ سے) میں اس مکان کے ساتھ ایک رسی باندھ رہی ہوں۔ اور جیسا میں اسے ان ہوں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مکان کے لئے [illegible] بیچ دیا جائیگا۔ دو سو روپے نقد اور تو تمام عمر کی کیا اسی قسمت سے کہ بعد میں جدید سے بہت بدلہ سنے گی اور ان کی عزت کو اپنی آنکھ کے سامنے مرتے دیکھوں گی۔

سمجھ سکوں گی۔

تاراچند:۔ معلوم ہوتا ہے اس بیچ اور وہ لڑکے نے تمہارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔ باپ کی حیثیت سے میرا حکم ہے کہ تو اپنے پتی کے گھر جائے گی۔

رانی:۔ میں یہ حکم نہیں مان سکتی۔

تاراچند:۔ تو اپنے شوہر کے گھر جائیگی یا اس گھر میں بھی نہ رہیگی۔

رانی:۔ میں اس گھر کو ابھی سے خیرباد کرتی ہوں۔

(جانے کو ہوتی ہے)

برج ناتھ:۔ رانو بیٹی تو کہاں جا رہی ہے۔ تو نہیں جانتی کہ تو لڑکی ہے۔ تو کہاں جائے گی؟

رانی:۔ (روتے ہوئے گلے سے) جہاں میری قسمت لے جائیگی چلی جاؤنگی۔ لیکن اس گھر میں ایک پل بھی نہ رہوں گی

پورن:۔ اس بات کی چنتا نہ کیجئے چچا جی۔ رانو کو کہیں اور نہ جانا پڑے گا۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ جسے آپ لوگ نکما اور آوارہ سمجھ رہے ہیں وہ اپنی سب آوارگی چھوڑ کر جی جان سے محنت کریگا۔ کمائیگا اور اپنی بہن کو اس قابل بنائے گا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔ اور اپنے والد کے مکان یا موٹر کے بل پر نہیں بلکہ اپنی قابلیت کی بنا پر عزت حاصل کر سکے۔

تاراچند:۔ اچھا تو یہ آگ تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ نکل جاؤ تم دونوں میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں ناخلف قرار دیتا ہوں۔ میں تمہیں تمام جائداد سے عاق کرتا ہوں۔ نکل جاؤ — اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔

راجی:۔ (گھٹ کر اپنے والد کو سمجھاتے ہوئے) پتاجی —

پورن:۔ چلو رانو — ان ساہوؤں اور سیٹھوں میں کوئی فرق نہیں۔

برندابن:۔ } تاراچند!
برج ناتھ:۔ } پورن!

تاراچند:۔ (اسی غضب کی حالت میں) چلے جائیں میری آنکھوں سے دور ہو جائیں۔ ایسی اولاد سے میں بے اولاد بھلا۔ بچپن ہی میں انکی ماں مر گئی۔ اتنی مصیبتوں سے میں نے انہیں پالا۔ کیا اسی لئے کہ بڑے ہو کر یہ ایسے ناخلف ثابت ہوں۔

رانی:۔ (روتے ہوئے گلے سے) آپ زیادتی کرتے ہیں پتاجی۔ آپکے احسانوں کا بدلہ ہم نہیں چکا سکتے لیکن ...

تاراچند:۔ (چلا کر) چلے جاؤ میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔

راج:۔ (رانی کی طرف بڑھتے ہوئے) جیجی۔

رانی:۔ (جاتے جاتے رک کر) آج سے ہمارے راستے الگ الگ ہوں گے راجو لیکن میں پرارتھنا کرونگی کہ تم سکھی رہو۔

پورن:۔ خودداروں کے لئے ازلی راستہ کھلا ہے راجو۔

راج:۔ میرا راستہ بھی تو ازلی ہے بھیا۔

پورن:۔ پر مانا تمہارے پاؤں چھلنی ہوتے (اپنے رانی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے) چلو رانی۔

(چلے جاتے ہیں)

برندابن:۔ تاراچند!

برج ناتھ:۔ پورن!

(پردہ)

اوپندر ناتھ اشک ؔ

رُبابِ شکستہ

وصلِ تسکینِ ہوس کا نام ہے
عشق اپنا آپ ہی انعام ہے

تجھ سے ہیں تخئیل کی رعنائیاں
بادۂ گلگوں سے رنگیں جام ہے

بھر گئے دل میں سکونِ اضطراب
چاندنی محبوب کا پیغام ہے

حُسن جب تک خود محبت بن نہ جائے
عشق اِک دیوانگی کا نام ہے

سرخوشی ہی جس میں دردِ سر نہیں
تیرے ہونٹوں میں وہ رُوحِ جام ہے

مِل بھی جاتے تھے کبھی بچھڑے ہوئے
اب کہاں وہ گردشِ ایام ہے

زندگی کیا جب نہ ہو دل میں خلش
موت بھی اِک بے حسی کا نام ہے

عشق سے ہوتا ہے آغازِ حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

اِک تبسم یاس میں ڈوبا ہوا
بس یہی مجبور کا پیغام ہے

پریم پجاری

وہ دوپہر

دور [illegible] ساحل کی فلک بوس دیواروں کے پیچھے ایک [illegible] کی طرح سانس لے رہا تھا۔

وہ جھلملاتی استوائی [illegible] دوپہر تھی۔ گرم [illegible] کو [illegible] اور [illegible] میں [illegible] رہی ہوں، اُس روز آفتابی شعاعوں میں ایک شاعرانہ جلال و [illegible] محسوس ہو رہی تھی۔

میں زرد [illegible] بازوؤں میں لپٹی پیشانی [illegible] کے ایک [illegible] کے سائے میں [illegible] دوپہر کے حسن اور ویرانی کا مطالعہ کر رہی تھی۔ دور ——— [illegible] جہاں [illegible] سے نیلا آسمان [illegible] رخسار چومتا ہے کوئی اونٹوں کی قطار [illegible] جا رہی تھی۔ دوسری طرف [illegible] اور ناریل کے لمبے لمبے [illegible] اور [illegible] آسمان [illegible] عالم میں ساکن تھے۔

گرم ساحلوں کی حسین اور ہوش ربا دوپہر کے ویران حسن کی بڑی [illegible] پرستار ہوں مگر اُس دوپہر ایک [illegible] تھا۔ کاش! [illegible] ساتھ ہی میں ایک ذہنی ہلچل میں مبتلا ہوئی! ہلچل ——— جس نے پورے نظام [illegible] کو بے قرار سا کر رکھا تھا! میں ایک شاعرانہ انداز میں اکتائی ہوئی اونٹوں کی گھنٹیوں کی اُس موسیقی کو سُن رہی تھی جو اس منظر کو دردناک سا بنا رہی تھیں۔

اسی وقت مجھے محل کے اندرونی ایوان سے ارغنوں کے سُروں پر ایک عربی نغمہ سنائی دینے لگا۔ میں موسیقی سے مسحور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دفعتاً صدر دروازے کی طرف سے نواب صفدر جاہ کی دو ایک کرب آمیز چیخوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر میں انجیر کی ٹہنیوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔

صدر دروازے کے عقب سے مجھے دادی زبیدہ کے پرائیویٹ سکرٹری کی آواز آئی: "نواب صفدر جاہ بہادر کا آج کیا حال ہے ڈاکٹر؟"

"جیسا کل تھا"

"اور جو [illegible] کا [illegible] ———" میں نے اپنے دل میں کہا اور [illegible] گئی۔

اسی وقت [illegible] کے درخت پر کوئل زور زور سے کوکنے لگی۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور مڑ گئی۔

حرم سرائی کی سبز دھاری دار سنگِ مرمر کی دیواروں سے ملحق دادی [illegible] کا [illegible] بلوریں شیشوں کا غسل کا کمرہ نظر آیا۔ اُس زمانے میں دادی جان بالائے بنفشی شعاعوں کی اور آفتابی غسل کی بہت قائل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ یہ گہرا بنفشی بلوریں کمرہ [illegible] دوپہر کے مہمانوں کا استقبال کا کمرہ تھا اور [illegible] غسل کے لئے وقف تھا۔

میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو دادی زبیدہ نیلے بلور کی خوابناک روشنیوں میں صندل کے ایک منقش تخت پر دریائی طوطوں کے پروں والے تکیوں کے درمیان نیم دراز اپنی بوڑھی سہیلی شہزادی عائشہ سے ڈومنی لوس کھیلنے میں محو نظر آئیں۔ کمرے کے [illegible] درمیان میں چار فوارے کھلے ہوئے تھے اور [illegible] بلوریں چھت کے نیچے اپنے بنفشی رنگ کے آبی موتی اس طرح بکھیر رہے تھے جیسے [illegible] تاریک [illegible] کسی گلستان میں جگنو اتر رہے ہوں۔

[illegible] میری نظر نواب اترج پر پڑی جو کوچ کے مرمریں ستون کے پروں کے سائے میں کھڑے تھے۔ انہیں وہاں دیکھ کر مجھے [illegible] تعجب ہوا۔ [illegible] ابھی آئے تھے۔

دادی جان [illegible] کے سوال کے جواب میں کہہ رہی تھیں "آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا نواب اترج! [illegible] کی موسیقی کا [illegible] ہے۔ وہ نماز عصر کے وقت فارغ ہو جاتی ہے۔"

نواب اترج کہنے لگے "تو پھر میں شوق سے انتظار کروں گا۔ مگر موسیقی کے لئے بیگم زبیدہ کیا شام کا وقت زیادہ موزوں نہیں ہوتا؟"

دادی زبیدہ نے اوڈی کولون سونگھتے ہوئے کہا۔ "اس کی خوشبو میرے اعصاب کو سکون بخشتی ہے۔ کیا فرمایا آپ نے؟ شام کا وقت ہے۔ ساڑھے تین بجے کے بعد اس کی مصوری کا گھنٹہ شروع ہو جائیگا مصوری کا یا ناچ گانے کا۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ پھر اس کے بعد اس کی دستکاری کا گھنٹہ ـــــ"

نواب ایرج پریشان ہو کر بولے "اور فرصت کا گھنٹہ کب شروع ہوگا بیگم زبیدہ؟"

دادی زبیدہ نے جواب ناک آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا "میرا خیال ہے۔ غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے اس کی چہل قدمی کا گھنٹہ شروع ہو جائے گا۔"

نواب ایرج اکتا کر بولے "اور چہل قدمی کے دوران میں ان کا کوئی اور گھنٹہ تو شروع نہیں ہوگا بیگم زبیدہ؟"

دادی زبیدہ بولیں "نہیں وہ اس کی فرصت کا گھنٹہ ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے نواب ایرج ـــــ (اوڈی کولون سونگھتے ہوئے) اس کی خوشبو میرے اعصاب کو سکون بخشتی ہے ـــ تو بات دراصل یہ ہے نواب ایرج۔ مجھے نو عمر لڑکیوں کا بیکار رہنا سخت ناگوار گذرتا ہے اس سے بعض ذہنی امراض کی علامات پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاندان کی تمام لڑکیوں کی تربیت میرے ہی زیر نگرانی ہوئی ہے گذشتہ سال میں کچھ علیل تھی۔ اسی لئے شائستہ کی طرف سے کچھ غفلت رہی۔ گذشتہ سال مجھے کیا ہوا تھا عائشہ؟ ناک پر کوئی پھنسی نکل آئی تھی ـــــ یا زکام ہوا تھا۔ اب یاد نہیں رہا نواب ایرج شاید پھنسی ہو۔ یا شاید زکام ـــــ پھنسی ہی تھی پھنسی۔ خوب یاد آیا۔ بجا پھنسی ـــ"

نواب ایرج بے حد اکتا کر بولے "تو میں پھر حاضر ہو جاؤں گا"۔

دادی زبیدہ کہنے لگیں "مجھے بڑا افسوس ہے نواب ایرج ڈومی نوس کھیلئے گا؟"

"جی نہیں بیگم زبیدہ۔ میں غروب آفتاب کے وقت حاضر ہو جاؤنگا"

"تو پھر تازہ انناس کا رس ہی نوش فرماتے جائیے"۔

"جی نہیں شکریہ"۔

دادی زبیدہ مصر ہوئیں "چکوترا یا انار؟ آجکل وٹامن سی کی ہم سب میں اتنی کمی ہو گئی ہے نواب ایرج۔ کہ پھلوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے تو لوگ بیری بیری جیسے عبرت انگیز مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں خدا کی پناہ ان امراض سے میں تو پھلوں کا رس اس طرح پیتی رہتی ہوں جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں کا رس پیتی ہیں۔ لہٰذا اس کے مجھے تسکین ہی نہیں ہوتی۔ ایسے اس موسم میں نواب ایرج بھلا ٹھوس غذا سے کسی کو کیا رغبت ہو سکتی ہے؟ میرا تو تمام دن تازہ پھلوں کا شربت پینے میں یا اوڈی کولون اور پکھلیو دیکھنے میں گذر جاتا ہے۔ اور یہ میرے دھیان کے لئے مفید بھی ہے ویسے بھی میں خوشبوؤں کی عاشق ہوں تو پھر آپ نے کیا کہا کس کا رس؟"

تو پھر شہزادی عائشہ جو اپنے آپ کو نوجوان سمجھنے کے جنون میں مبتلا تھیں ایک رومان بھری نظر سے نواب ایرج کو دیکھتے ہوئے بولیں "نوجوان آدمی کو سردی گرمی کا احساس کم ہوتا ہے۔ نواب ایرج ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں"۔

دادی زبیدہ نے شہزادی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ "لیکن یاد رہے عائشہ جب میں پندرہ سال کی تھی اس وقت بھی میری کیفیت یہی تھی۔ تمہارا خیال ہے جوانی میں انسانی احساسات زائل ہو جاتے ہیں؟"

نواب ایرج پریشان ہو کر باہر جا چکے تھے

دادی اماں پھر ڈومی نوس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شہزادی عائشہ نے ایک پُرمعنی تبسّم سے زیرلب کہا۔ "گذشتہ ہفتہ کی دعوت طعام کے بعد میرا خیال ہے نواب ایرج اور شائستہ میں خاص تعلقات قائم ہو گئے ہیں"۔

دادی زبیدہ نے کسی قدر بے چینی سے تالو پر اوڈی کولون ڈالتے ہوئے فرمایا۔ "تو کیا بری بات ہے؟ کیوں نہ ہوں آخر؟ لو تم پھر ہار گئیں۔ راستہ بند ہو گیا اب کونسی چال چلو گی؟"

شہزادی عائشہ ہنس کر بولیں "واہ میں کیوں ہار جاتی؟ تو تمہارے چار سے میں نے چار لگا دئے۔ اور تمہارا راستہ بند کر دیا"۔

دادی زبیدہ اپنی شکست پر جھینپ سی گئیں "کھیلوں میں یہی تو خرابی ہے۔ کہ آدمی خواہ مخواہ ہار جاتا ہے۔ خیر میری تو نماز کا وقت ہو گیا (کچھ دیر بعد) خدا بخشے نواب ضمیر الزماں جاہ بڑے اچھے کھلاڑی تھے میرے ساتھ ہمیشہ شطرنج کی بازی ہوا کرتی تھی"۔

"اور بازی کس کی ہوتی تھی؟" شہزادی عائشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیسی ہو سکتی تھی؟" دادی رشیدہ نے مغرور لہجے میں کہا "نواب ضمیر الزماں خاں ہار جاتے تھے"

"ظاہر ہے" شہزادی عائشہ نے ہنس کر کہا "وہ تم سے کبھی نہیں جیتے اور جیتے بھی کیسے۔ وہ تو [illegible] تمہارا دم بھرتے تھے۔"

دادی رشیدہ گردن کو [illegible] پر رکھتے ہوئے بولیں "ایک نواب ضمیر الزماں خاں ہی کیا [illegible] اس زمانے کا کون نوجوان نواب تھا جس نے مجھ سے [illegible] کے لئے درخواست نہیں کی؟ نواب ضمیر الزماں خاں میں کوئی برائی کا پتہ تو لگا نہیں تھا۔ ویسے ہمارا بڑا [illegible] زندگی کی ناکامی نے مارا [illegible] کچھ ٹھیک یاد نہیں رہا"

یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

شہزادی عائشہ بولیں "کہاں چلیں یہ کھیل تو ختم کر دو۔ کم از کم اپنی ہار مانتی جاؤ۔"

دادی رشیدہ نے چڑ چڑے [illegible] کہا "میں نے اپنی زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی [illegible] مجھے اجازت دو کہ نماز ظہر پڑھ آؤں [illegible] آہستہ سے) میں روحی دیکھو، وہی اس بات کی [illegible]"

اتنا کام [illegible] میں [illegible] کی آڑ میں ہوگئیں [illegible] کے قریب سنگ سنز سے بنا ہوا ایک [illegible] دادی جان کی نظر [illegible] پڑ ہی گئی۔

"بیٹی روحی بیٹی روحی [illegible] کام تو نہیں تمہارے سمندری [illegible] کا گھنٹہ تو نہیں؟ کچھ دیر [illegible] کی طرف سے تم کھیلو میں نماز ظہر ادا کر آؤں۔"

دادی جان کی عمر سہیلی بوڑھی شہزادی عائشہ مجھے ہمیشہ ناپسند سی رہیں کچھ تو اس لئے کہ بوڑھاپے میں انہیں نوجوانی کا غیر معمولی احساس تھا اور کچھ اس لئے کہ دولت کی حرص ان میں جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ میں بادلِ ناخواستہ ناک بھوں چڑھائے آگے بڑھی اُدھر دادی جان اپنی محبوب کنز صنوبر کا بازو تھامے باہر چلی گئیں۔

شہزادی عائشہ نے مجھے مخاطب کیا۔ "آؤ بازی ختم کرو۔ پھر میں بھی نماز کے لئے اٹھونگی۔" کچھ دیر بعد بولیں "ابھی ابھی نواب [illegible] آئے تھے [illegible] کی موسیقی کا گھنٹہ تھا یا زبیدہ نے بہانہ بنا دیا خوبصورت اور سعادت مند نوجوان ہے۔"

"اسی لئے تو مجھے ناپسند ہیں۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

[illegible] وہ کیوں؟

میں [illegible] ہوئی بولی: "کیونکہ خوبصورت آدمی مغرور ہوتا ہے اور سعادت مند احمق۔"

شہزادی عائشہ کہنے لگیں "مگر اس کی سب سے بڑی خوبی تو دولت ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے دولت مند آدمی [illegible] کاہل ہوتے ہیں۔"

شہزادی عائشہ [illegible] ہو کر بولیں۔ "تمہاری بھی عجیب باتیں ہوتی ہیں روحی کون لڑکی ہوگی جو نوجوان نواب اس طرح کی [illegible] ناپسند کرتی ہو؟"

میں نے کہا "کیوں [illegible] میں جو ناپسند کرتی ہوں۔ ان میں [illegible] ایک ایسا شخص لگتا ہے جس میں آپ کوئی رنگ نہیں ہوتا۔"

شہزادی عائشہ تنگ آکر بولیں "میرا تو خیال ہے کہ آدمی کا اخلاق اس کی [illegible] سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

[illegible]

شہزادی عائشہ ذرا سے وقفہ کے بعد بولیں "میں نے افواہ سنی ہے کہ [illegible] اور نواب [illegible] کے تعلقات زیادہ مستحکم ہو رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں۔"

شہزادی عائشہ بولیں "افواہیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔"

"[illegible]" میں نے کہا "اور ان میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ غلط نکلتی ہیں۔"

"تو کیا یہ غلط ہے؟" وہ چونک پڑیں۔ "خدا کا شکر ہے کیونکہ [illegible] کے لئے یہ مناسب نہیں۔"

میں نے طنز سے کہا "[illegible] کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ ایک مخبوط الحواس آدمی سے بے چون و چرا شادی کر کے اپنی زندگی برباد کر لے۔ یہی نا؟ کھیلئے کھیلئے دیر ہو رہی ہے۔"

"تم خفا کیوں ہو روحی؟"

"کئی وجوہ ہو سکتی ہیں شہزادی عائشہ۔ آپ کھیلنا چاہتی ہیں یا نہیں؟"

"کھیل تو رہی ہوں۔ تم تو ہیں پر پرسوں جاتی ہو۔ اور کھیلوں بھی کیا خاک؟ تم چراغ پا ہو رہی ہو"

"میری چراغ پائی سے کھیل کا کیا تعلق؟"

"آخر بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے" میں نے تنگ آ کر کہا "مجھے آپ سب کا طرز عمل بُرا لگتا ہے آخر شاہینہ پر یہ قید و بند کیوں؟ نواب ایرج بقول آپ کے خوبصورت اور سعادت مند ہیں اور میرے نکتۂ نظر سے مغرور اور احمق، دونوں کی راہ پر نگاہ۔ سب بے ضرر ٹھیرا مگر دادی جان شاہینہ کا اس سے میل جول بھی گوارا نہیں کرتیں آپ نے آج دوپہر نواب صفدر جاہ کی چیخیں سنیں؟ پچھلے تین دن سے ان کا جنون ترقی پر ہے۔ تو ان کا ذہنی توازن بالکل ہی قائم نہیں رہا تمام دوپہر چیخوں کی آواز باغ میں گونجا کرتی ہے اور یہی گھنٹہ دادی جان نے پچھلے تین دن سے شاہینہ کی موسیقی کا مقرر کر رکھا ہے تاکہ اس بد نصیب مجنوں کے کراہنے کی آواز اس کے کان میں نہ پڑے۔ کل رات نماز عشا کے لئے میں حرم سرا کے باغیچے کی مسجد میں جا رہی تھی دھوپ گھڑی کے پاس جا رہی تھی کہ میں نے نواب صفدر جاہ کو قیدیوں کی طرح جکڑے ہوئے کوٹھے سے میری تو چیخ نکل گئی اور میں جلدی سے اندر چلی گئی۔"

شہزادی عائشہ نے ذرا تامل کے بعد کہا "ایک طرح تو تمہاری دادی کے قصور ہیں۔"

میں جل کر بولی "قصور ہوں یا نہ ہوں قصور روں ہی سے سرزد ہوتے ہیں شہزادی عائشہ۔ یہ معصوم دادی جان اتنی وہمی کیوں واقع ہوئی ہیں حالانکہ وہ تو مسلمان ہیں۔"

"یہ سوال تو تم اپنی دادی ہی سے کر سکتی ہو۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہاں البتہ اتنا سب جانتے ہیں کہ شاہینہ کا عقد سوائے نواب صفدر جاہ کے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ نواب ایرج کو شاید ابھی ان باتوں کا علم نہیں۔"

"مگر اس سلسلے میں نواب ایرج کا نام کیوں لیتی ہیں آپ؟ شاہینہ کی ملاقات ان سے گذشتہ ہفتہ صدر گاہ پر ایک شاہی دعوت طعام میں ہوئی۔ شاہینہ کے رشتہ کے لئے اور کئی نوجوان موجود ہیں۔"

شہزادی عائشہ کے چہرے پر شگفتگی آ گئی "تو گویا نواب ایرج کا خیال شادی کا نہیں؟"

میں نے لاپروائی سے کہا "مجھے علم نہیں"

کہنے لگیں "خدا کرے نہ ہو"

میں نے بے پروائی سے پوچھا "کیوں؟"

شہزادی عائشہ بچا کر بولیں "بات یہ ہے" چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ آ گئی۔ "بات یہ ہے میرا خیال ہے۔ نواب ایرج کا رشتہ اگر مجھ سے ہو جائے تو کیسا ہو؟"

شہزادی عائشہ کا شادی کا جنون بہت پرانا ہو چکا تھا اس کی تہہ میں دولت کی حرص کے سوا اور کچھ نہ تھا ذرا دیر میں عجیب جواب دل ہی دل میں جلتی رہی پھر بولی "اپنی قیمتی رائے کا اظہار آپ نے نواب ایرج سے بھی کیا یا نہیں؟"

شہزادی عائشہ مسکراتی ہوئی بولیں "ابھی تو نہیں مگر آخر اس میں خرابی کیا ہے؟ تمہیں علم ہے نواب کی لمبی چوڑی جاگیر ہے شاید اتنی ہی جتنی نواب صفدر جاہ بہادر کی ہو گی۔"

میں نے غصہ کو ضبط کرتے کہا "تو گویا آپ نواب ایرج کی جاگیر سے شادی رچانا چاہتی ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو آپ نواب صفدر جاہ کو شادی کا پیام کیوں نہیں دیتیں؟ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ دادی جان شاہینہ کا عقد نواب صفدر جاہ سے ان کی بے پناہ دولت کی وجہ سے نہیں کر رہی ہیں بلکہ کچھ اور ہی خاندانی وجوہ کی بنا پر یہ خیال اُن کے دماغ میں سما گیا ہے۔"

شہزادی عائشہ کہنے لگیں "میں نواب صفدر سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ شاہینہ کی قسمت میں لکھا ہے۔ وجوہ جو کوئی ہوں خیال تو کرو نواب صفدر جاہ کی جائداد کوئی تھوڑا سا ہے؟"

بوڑھی شہزادی کی خبطی گفتگو کا مجھ پر بے حد بُرا اثر ہوا اور میں اُکتا کر کھڑی ہو گئی۔ مزید براں اُس شام مجھے عرشۂ جہاز پر ایک جلسۂ رقص میں شریک ہونا تھا اس لئے میں نے معذرت چاہی اور اپنے لباس خانے میں چلی آئی اور دیر تک بے چینی کے عالم میں ٹہلتی رہی۔

شام گرم تھی، اور کچھ گھٹن سی ایک رہی تھی۔ اس لئے تبدیل لباس کے بعد میں لوبان کو روشن کرنے کے لئے باہر نکل آئی اور سبق کے اسلامی سالوں میں کچھ دیر چہل قدمی کرنے کے خیال سے فوارے کی طرف آئی تو نیچے، دیکھ کر تعجب ہوا کہ شاہینہ لیمو کی معطر گھاس پر لیٹی ہوئی بڑے انہماک سے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ تو گویا دادی زبیدہ نے اسے نواب ایرج کی آمد کی اطلاع دے دی تھی؟ ورنہ یہ کہاں!

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میرا خیال تھا تم استقبالی کمرے میں ہو گی"۔

"کیوں؟" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"نواب ایرج تم سے ملنے نہیں آئے ہیں؟"

میرا فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ باغ کے صدر دروازے پر نواب ایرج شام کی سیاہ جاکٹ میں وائلٹ کے چند جھکے ہوئے پھول لگائے نمودار ہو گئے۔

شاہینہ ذرا حیران ہو کر بولی "آپ؟"

نواب ایرج نے باغ میں داخل ہو کر کہا "تسلیم۔ یہ آپ کی چہل قدمی کا گھنٹہ تو نہیں؟"

"جی نہیں آج میں چہل قدمی نہیں کروں گی"۔

"نوازش!" کچھ وقفہ کے بعد کہنے لگے "آپ بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں"۔

شاہینہ ذرا باریک سی آواز میں بولی: "بہار کی ان دوپہروں میں احساس زندگی بڑھ گیا ہے۔ شام میں ذرا فارغ ہوتی ہوں البتہ ——"

یکایک باغ کے مشرقی حصہ سے جہاں آفتاب گھڑی ایستادہ تھی نواب صفدر جاہ کی مخصوص دعوت آداب کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی حبشی خانہ زادوں کی زور زور کی باتیں۔

نواب ایرج نے گھبرا کر کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے"

شاہینہ ذرا پریشان سی ہو گئی۔ بولی "آپ اندر تشریف لے چلئے میرا خیال ہے دادی زبیدہ کے کچھ لوگ غل مچا رہے ہیں۔" پھر موضوع بدلتے ہوئے میری طرف مخاطب ہو کر بولی "کس قدر دیدہ زیب ہے۔ شبنم کا گلوبند! کہیں باہر جا رہی ہو روحی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ سندرگاہ کے ایک جشن پر مدعو ہوں۔ یہ جشن شروع ہونے ہی والا ہے اس لئے اپنی مصروفیت جلد ختم کر لینا چاہتی ہوں۔ پھر روزوں کی راتوں میں شام باہر صرف نہیں کی جا سکتی"۔

شاہینہ نواب ایرج کی طرف مڑ گئی۔ "نواب ایرج کیوں نہ ہم بھی ساحل پر چلیں؟ آجکل سمندر کا رنگ گہرا فیروزی رنگ کا ہو رہا ہے"۔

نواب ایرج نے مسکرا کر کہا: "یا اس بید مجنوں کی لرزاں ٹہنیوں کے نیچے بیٹھ کر باتیں کریں؟ کبھی کوئل کی ولولہ انگیز کوک سنیں، کبھی بلبل کا رقت انگیز نالہ ——؟"

"تو پھر خدا حافظ ——" میں نے کہا اور کچھ سوچتی ہوئی باغ کے صدر دروازے سے باہر نکل آئی۔

حجاب امتیاز علی

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے

شاعری ہی پر منحصر نہیں، فنون لطیفہ کے جتنے شعبے ہیں، خواہ وہ مصوری ہو یا سنگ تراشی، موسیقی ہو یا رقاصی۔ یہ سب فن کاروں کے پیش نظر رہتی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں کو کچھ اس طرح پیش کریں کہ ایک طرف تو ان میں حسن و دلکشی اور مسرور و سرخوشی کی وہ باتیں مسکراتی ہوئی نظر آئیں اور دوسری طرف سماج کے افراد جن کے لئے وہ تخلیقات پیش کی گئی ہیں، ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ فائدے سے مطلب کوئی سیاسی، معاشی یا اقتصادی فائدہ ہی نہیں، بلکہ سماج کے افراد کے لئے اگر یہ تخلیقات، ذہنی اعتبار سے کسی قسم کے سکون کا باعث بھی بنتی ہیں تو وہ بھی ایک قسم کا فائدہ ہی ہے۔ بہر حال فن کار خواہ کسی نظریے کا ماننے والا ہو چاہے وہ ادب برائے ادب پر ایمان رکھتا ہو یا ادب برائے حیات پر چاہے وہ چند مخصوص سیاسی و اقتصادی نظریات کا پرچار کرنا چاہتا ہو یا یونہی آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کرنے کا متمنی ہو، اس چیز کو اپنی تخلیقات میں ضرور محفوظ رکھتا ہے۔ اور جب اس کے فن کی بنیادیں اسی فائدہ رسانی پر ٹھہریں، تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے انداز بیان، طرز ادا، اسلوب، اور خیالات کو ڈھال کر پیش کرنے والے سانچوں کو، سماج کے افراد کی ذہنی ساخت اور رجحانات کے مطابق بنائے تاکہ اس کے خیالات، اس کے پیش کئے ہوئے نظریات میں تاثر کی کیفیت زیادہ گہری زیادہ دیرپا اور زیادہ روداں ہو سکے۔

لیکن سماج کے افراد کے رجحانات ہمیشہ ایک نہیں رہتے۔ وہ اپنے وقت کے مادی حالات اور ان کے تغیرات سے اثرات قبول کرتے ہیں سماجی حالات کی ذرا ذرا سی تبدیلیاں اُن کے اذہان پر گہرے نقوش چھوڑتی ہیں دفن کی کروٹیں، ور زندگی کے سمندر کی مضطرب اور بے قرار موجیں ان کو ایک لمحہ بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ ان کی طبیعتوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ان کا مذاق بدلتا رہتا ہے۔ ان کی دلچسپیوں میں انقلابات آتے رہتے ہیں اور چونکہ فنون لطیفہ کے بیج اسی زمین میں پھوٹتے اور ان کے پودے انہیں حالات کے سائے میں پروان چڑھتے ہیں، اس لئے اُن کے ہر شعبے میں تغیر و تبدل کی حکمرانی کا قانون کسی دور، کسی زمانے اور کسی وقت میں بھی اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتا۔ چنانچہ حالات و واقعات کی انہیں کروٹوں اور وقت و ماحول کے انہیں بدلتے ہوئے تیوروں کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ کبھی ایک حالت پر چل نہیں سکتے ان میں جمود اور ٹھہراؤ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب بھی سماج کسی انقلاب سے دوچار، جب بھی حالات کوئی نئی کروٹ بدلتے ہیں، جب بھی زندگی کسی نئے موڑ پر آتی ہے، اور فکر یات کی بہتی ہوئی ندی کا دھارا مڑ کر کوئی نیا رخ اختیار کرتا ہے تو فنون لطیفہ بھی اپنے اندر انقلابی کیفیت پیدا کرنے کیلئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

دوسرے فنون لطیفہ کی طرح شاعری کا بھی یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہ سکتی اس میں بھی سماجی تغیرات کے ساتھ ساتھ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ بہر حال سماج کی آغوش میں پرورش پاتی ہے اس لئے سماج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی ہونا ناگزیر ہے۔ یہ تبدیلی مواد اور ہیئت، دونوں اعتبار سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں قسم کی تبدیلیاں اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ ایک کے بغیر دوسری کے ظہور پذیر ہونے کا مطلق امکان نہیں جب فن کار کے پاس پیش کرنے کے لئے کچھ نئی چیزیں ہوتی ہیں، کچھ نئے خیالات ہوتے ہیں، کوئی نیا نظریہ ہوتا ہے، تو ان سب کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کیلئے وہ جدت کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ان نئے خیالات کو پرانے اور مروجہ سانچوں میں ڈھال کر پیش کرے گا، تو اُن میں تاثر کی وہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے گی، جس کے پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہر فن کار کا پہلا فریضہ ہے۔ ہر فن کار میں اس بات کا شعور ہونا ضروری ہے کہ وہ خیالات اور ہیئت کی ہم آہنگی کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔ ورنہ اس کی تخلیقات میں وہ امتیازی شان پیدا نہ ہو سکے گی، جو کسی فن پارے کو اوّل درجے کا شرف بخش کر ایک ایسی بلندی سے ہمکنار کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے اسکو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ اپنے جدید خیالات کو پُرانے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے، یا پُرانے خیالات کو جدید سانچوں میں ڈھالتا ہے، تو وہ بالکل اُسی

سے جوڑسی بات ہو گی۔ ہر چیز ایک مخصوص صورت چاہتی ہے۔ ہر خیال سامنے آنے کے لئے ایک مخصوص لباس کی تمنا رکھتا ہے۔ یہی تمام چیزیں ہیں جو شاعری کو ہیئت کے اعتبار سے مختلف قسم کی تبدیلیوں سے روشناس کرتی رہتی ہیں۔

شاعری کی صدیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے اس کی حالت ہر دور میں ایک سی نہیں رہی۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلی۔ اُس سے بدلتی ہوئی دنیا کے تمام اثرات قبول کئے۔ جب کبھی بھی سماجی اور تہذیبی انقلاب ہوا تو اُس نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ زندگی نے جب اپنا چولا بدلا تو اس کے ساتھ وہ بھی ایک نیا روپ دھارنے کے لئے تیار ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاص دور کی شاعری، دوسرے دور کی شاعری سے مختلف نظر آتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہومر کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کی سی نظمیں آج نہیں لکھی جاتیں؟ کیا وجہ ہے کہ آج کوئی شاعر ڈانٹے کی سی Divine Comedy لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا؟ کیا سبب ہے کہ کیٹس، شیلے اور بائرن نے چاسر کی سی شاعری نہیں کی؟ آخر کیوں گوئٹے کی شاعری سارے جرمن شاعروں سے مختلف ہے؟ میاکوسکی، ڈمیان بیدنی، لوریس، پیسٹرناک اور سرگئی یسینن کی شاعری نے کیوں زار روس کے زمانے کے شاعروں کا رنگ اختیار نہیں کیا؟ فرانسیسی تمثیل نگاروں یعنی بادلیئر، رمبو، ورلین اور میلارمے وغیرہ نے کیوں ساری دنیا کی شاعری کے انداز بیان اور طرز ادا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ والٹ وھٹمن نے شاعری کے لئے کیوں ایک بالکل ہی نئی شاہراہ بنائی؟ ٹی ایس ایلیٹ، ازرا پاؤنڈ، آڈن اور سپنڈر آج کیوں پچھلے انگریزی شاعروں سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں؟ امرا القیس کی سی نظمیں آج عربی میں کیوں نہیں لکھی جاتیں؟ فردوسی کا شاہنامہ اور سعدی کی سی اخلاقی نظمیں، آج کے جدید ایرانی شاعر کیوں نہیں لکھتے؟ حالی و آزاد، سرور و چکبست، عظمت اللہ خاں و اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری اپنے پیشروؤں سے مختلف کیوں ہے؟ کیسے نظیر اکبر آبادی نے اپنے وقت کے مروجہ طرز سے انحراف کر کے ایک دوسرا راستہ بنا لیا؟ کیوں اقبال اور جوش، میر و سودا کی سی شاعری نہ کر سکے؟ اور راشد و میراجی، تاثیر و خالد، فیض و مجاز، اختر شیرانی و جاں نثار اختر، ندیم و سلام، شاد عارفی و مخدوم، جذبی و علی جواد زیدی، احترام الاسلام و حبیب الرحمٰن، یوسف ظفر اور قیوم نظر آجکل کیوں پیدا ہوئے؟

بات یہ ہے کہ ان تمام شعراء کا دور ایک دوسرے کے دور سے مختلف ہے۔ وہ مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اُنھوں نے جن چیزوں کے اثرات قبول کئے وہ بھی جدا گانہ تھیں۔ ان میں کوئی زیادہ حساس تھا کوئی کم۔ کسی میں شعور کی کمی تھی، کسی میں زیادتی! ان میں سے کوئی کوئی حوادث کی موجوں کا شکار ہو سکتا تھا لیکن کسی کو یہ کہ ان کو قابو میں کر کے وہ ایک نیا رخ اختیار کرے۔ کسی کی طبیعت سراسر جدت پسند تھی اور کسی کی قدامت پرست! انہیں تمام باتوں کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا شاعروں کی تخلیقات ایک دوسرے سے مختلف ہیں معنوی حیثیت سے بھی اور صوری اعتبار سے بھی!

غرض یہ کہ اس قسم کی تبدیلیاں کوئی نئی چیز نہیں ہیں، جب انسان اس دنیا میں بالکل نو وارد اور انجان تھا تو اُس زمانے میں اس نے جو گیت وغیرہ بنائے ان کی ہیئت میں کوئی زیادہ فن کاری، کوئی زیادہ صناعی، کوئی زیادہ کوئی برتی ہوئی کیفیت اور کوئی زیادہ سڈول پن کی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا نو وارد انسان وحشی تھا۔ اور وحشی انسان کے اندر فن کارانہ شعور کی کمی کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کی دنیا محدود تھی۔ اس کی تخیل کی پرواز محدود تھی، وہ فن کاری کے میدان میں بہت دور آگے نہیں جا سکتا تھا چنانچہ اُس زمانے کے آرٹ میں یہ خصوصیات، خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ ان میں نہ تو زیادہ سڈول پن ہے اور نہ زیادہ بناؤ سنگھار کی کیفیت! غرض صناعی و فن کاری کی ان خصوصیات سے وہ یکسر محروم ہے، جو آجکل کے آرٹ میں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ برخلاف اس کے اُن کے اندر ایک قسم کا بھدا پن ۔۔ coarseness بے نقاب ہے۔ آرٹ سے قطع نظر ابتدائی شاعری میں بھی یہی خصوصیات جھلکتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اس زمانے کی زندگی ہی میں ایک طرح کی سادگی و معصومیت تھی ۔۔۔۔ ایک قسم کا "الھڑپن" تھا جس کے اثرات ان کی تخلیقات میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی ابتدائی تخلیقی کوششوں کو دیکھنے کے بعد ہمیں اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اوّلین شاعروں اور فن کاروں نے اپنے اپنے پہلے تخلیقی اور فنی کارنامے پیش کرنے کے بعد ہی اس بات کی کوشش شروع کر دی تھی کہ وہ اسکی ہیئت کو زیادہ سڈول بنائیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا، کہ جن سانچوں میں اُنھوں نے اپنے نئے خیالات کو ڈھال کر پیش کیا ہے، ان میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ، زیادہ دل موہ

لینے والی کیفیت پیدا ہو جانے کے امکانات ہیں۔ چنانچہ ہیئت کے اعتبار سے مختلف قسم کے تجربے اسی وجہ سے شروع ہوئے، ہمیشہ ہوتے رہے اور جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ یہ ہر زمانے کی شاعری کی مسلسل داستان معلوم ہوتی ہے، ہیئت کے تغیر و تبدل اور تجربانی کوششوں کی!

ہیئت کی ان تبدیلیوں کو ظہور میں لانے کے لئے ان فن کاروں کا ہونا ضروری ہے، جن کا احساس زیادہ بیدار، جن کی نظر زیادہ دور رس و دوربین، جن کا شعور زیادہ بیدار اور جن کی طبیعت زیادہ حساس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ہیئت کے تجربات اگرچہ ہر دور میں ہوتے رہتے ہیں، لیکن کوئی صرف انگریز فرم کا انقلاب کسی خاص دور میں کسی فن کاروں کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے، جن میں مذکورۂ بالا خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر فن کار اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

مثال کے طور پر اردو شاعری ہی کو دیکھئے! اس میں ایک زمانے تک غزل کا رواج رہا جس کی ہیئت صرف چند خاص قسم کے خیالات ہی کی متحمل ہو سکتی ہے اور اردو کے بہت سے بڑے بڑے شاعر آج اسی کے سہارے زندہ ہیں۔ لیکن انہوں نے اس صنف سخن میں ہیئت کے اعتبار سے کوئی جدت کی اور نہ کسی دوسری صنف سخن کی طرف توجہ کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غزل کی ہیئت داخلی کیفیات کے بیان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اور ہندوستان کا ہر فن کار داخلیت ہی میں کھویا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر کسی دوسری چیز پر نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ چنانچہ غزل کی صنف سخن ایک طرف تو اس وجہ سے کامیاب ہوئی کیونکہ وہ فن کاروں کے افتاد طبع کے مطابق تھی اور دوسری یہ بات ہوئی کہ ہندوستان میں ایک زمانے تک کوئی ایسی ہیجانی کیفیت پیدا نہیں ہوئی جس سے ہمارے فن کار کوئی اثر قبول کرے۔ حملے ہوئے، لڑائیاں لڑی گئیں، بیسیوں سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا، سینکڑوں بادشاہ تخت پر بیٹھے اور اتارے گئے، لیکن ہمارے شاعروں نے ان حالات و واقعات کا جیسے کوئی اثر ہی قبول نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شاعر اپنے آپ کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھتے تھے۔ اسی انقلابات کی ان کے نزدیک کوئی سماجی اہمیت نہ تھی۔ اجتماعیت کا کوئی تصور ان کے پیش نظر نہ تھا۔ اس لئے سماجی انقلاب کے دامن ان کی اپنی فکر پڑ جاتی تھی۔ اور بس! چنانچہ ان انقلابات کا رد عمل چند داخلیت کے رنگ میں رنگے ہوئے اشعار کی صورت میں ہمارے کچھ شاعروں کے یہاں ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کے سب غزل کے رد عمل ہیں! سماجی انقلابات کے ساتھ فنی انقلاب کوئی ابھی تک نظر ہی نہیں آتا جس سے فن کار اپنا رخ بدلنے کیلئے مجبور ہو جاتے۔ ان سب کا فن میدان میں ہتی ہو کی کسی سٹیک حرام بدی کی طرح اپنے راستے پر چلتا رہا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ غزل کی ہیئت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن ہی نہ تھا۔ ہر چند وہ ان کی داخلیت اور انفرادیت کو زیادہ اچھی طرح پیش کر سکتی تھی۔ اسی وجہ سے خود اس میں تبدیلی کرنے کا خیال ان کو کبھی نہیں آیا۔ البتہ ان شاعروں میں سے جب کچھ داخلیت سے باہر نکل کر انھوں نے دنیا پر نظر ڈالی اور کچھ خارجی چیزوں کو شاعری میں پیش کرنا شروع کیا تو وہ مجبور ہو گئے غزل کو چھوڑنے اور دوسری اصناف سخن کو اپنانے کے لئے! چنانچہ انہیں غزل گو شاعروں میں سے ہمیں بعض ایسے شاعر ملتے ہیں جنہوں نے دوسری اصناف سخن کے سانچوں میں اپنے خیالات کو ڈھال کر پیش کیا ہے۔

سودا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کے مسدس، مخمس، مثلث، ہیئت کے تجربات کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں۔ حالانکہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ لیکن جب ان کے پاس غزل کے داخلی میں پیش ہونے والی کیفیات کے علاوہ پیش کرنے کے لئے کچھ نئی چیزوں کا ذخیرہ فراہم ہوا، تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ غزل کے ادب میں زیادہ فن کاری اور زیادہ آسانی کے ساتھ پیش نہیں کئے جا سکتے اس لئے انہوں نے دوسری اصناف سخن کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اور اپنی خارجی کیفیت اور اجتماعی محسوسات کو انہیں سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کے یہاں عشقیہ کیفیات و واردات کا بیان، اگرچہ غزل میں اچھی خاصی فن کاری کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے علاوہ کسی اور موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں، تو ان کا رنگ بدل جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ ہجویات لکھتے ہیں تو ان میں ان کی معنویت کے پیش نظر صورت میں بھی ان کو تبدیلی کرنی پڑتی ہے جب وہ مراثی لکھتے ہیں، تو وہ اس مروجہ صورت و ہیئت کو استعمال نہیں کرتے جو انکو پیش کرنے کے لئے سودا کے پیشروؤں نے استعمال کی تھی۔ سودا نے جب مرثیہ لکھا تو اس کے ہر بند کو چار مصرعوں میں تقسیم کیا۔ اور

آگے چل کر اگرچہ انہوں نے مسدس کی صورت اختیار کر لی لیکن سودا کی یہ ابتدائی کوشش مراثی کے ہیئتی ارتقا میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بہرحال یہ عام باتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ سودا میں ہیئت کے صحیح استعمال کا شعور موجود تھا اور انھوں نے اس سے کام لے کر اس اعتبار سے بھی اپنی شاعری کو اجتماعی بلند کر دیا۔ سودا کے علاوہ میر میں بھی یہ خصوصیات ایک حد تک پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی شہر آشوب لکھتا ہے، تو غزل یا مثنوی کا فارم استعمال نہیں کرتا بلکہ ان خیالات کو مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہے لیکن میر کے یہاں یہ کوشش شعوری نہیں معلوم ہوتی بلکہ غیر شعوری نظر آتی ہے۔

اردو شاعروں کی ان انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر اگر ہم اجتماعی طور پر بھی دیکھیں تب بھی ہمیں اردو شاعری کے اندر ہیئت کے اعتبار سے کافی تنوع نظر آتا ہے۔ ایک طرف اگرچہ اس میں غزل ہے تو دوسری طرف مثنوی کا فارم بھی موجود ہے اور کہیں مثلث ہے کہیں مربع، کہیں مسدس، کہیں مخمس، کہیں ترکیب بند ترجیع بند۔ غرض یہ تمام اصناف ہیں جو خیالات کی مناسبت سے استعمال کی جاتی ہیں اور اس مناسبت کا انحصار ہے فن کار کے صناعانہ شعور پر۔ اگر اس میں اس شعور کی کمی ہے تو وہ ان کے استعمال میں جہاں تک تناسب کا تعلق ہے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

متقدمین شعرائے اردو میں نظیر اکبرآبادی اس اعتبار سے بہت بلند ہے۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے اس کی شاعری میں ایک انقلابی کیفیت نظر آتی ہے۔ آخر نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہیئت کے اعتبار سے اپنے ہمعصر شاعروں کے مقابلے میں اتنی مختلف کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ نظیر اپنے ہمعصر شاعروں کی طرح سوچنے کا عادی نہ تھا۔ اس کی نظر میں وسعت تھی۔ وہ مختلف صحبتوں میں بیٹھتا تھا۔ اس نے عوام کے درمیان زندگی کے دن گزارے تھے۔ وہ اپنی شاعری کو صرف اپنے آپ ہی تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پیش نظر ساری دنیا تھی۔ حالات و واقعات، واردات و کیفیات اور جذبات و احساسات کا تصور اس کے یہاں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ وہ ایک خاص طبقہ کا شاعر نہیں معلوم ہوتا بلکہ عوام کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شاعری میں داخلیت کی جگہ خارجیت کا غلبہ ہے۔ اس کے موضوعات میں تنوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ان کی مناسبت سے اپنی شاعری کو ہیئت کے مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کیا۔ چونکہ صرف غزل کی ہیئت [illegible] ان تمام رنگوں اور تجربات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس نے کہیں مسدس سے کام لیا ہے تو کہیں مخمس سے [illegible] ترکیب بند ہے تو کہیں ترجیع بند ہے۔ غرض اس کی شاعری میں ہیئت کا یہ تنوع موجود ہے اور اس کا وجود حالات کے تنوع کا مرہون منت ہے۔ اگر نظیر کے خیالات اور تجربات میں یہ تنوع نہ ہوتا تو اس کی شاعری بھی [illegible] صوری [illegible] اس کی شاعری میں سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ [illegible] نظر نہ آتے۔

چنانچہ [illegible] یہ بات ظاہر ہو گئی کہ خیالات و ہیئت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور جب ایک میں تغیر پیدا ہوتا ہے تو دوسرے میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ایک کا رنگ بدلتا ہے تو دوسرے کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔

مقصد کی یہ تبدیلیاں، جن کا اوپر ذکر ہوا بہت معمولی سی تبدیلیاں تھیں لیکن جہاں تک ان کے وقت اور ماحول کے پس منظر کا تعلق ہے وہ بعض حیثیتوں سے اہم ضرور ہیں۔ لیکن ان سے قطع نظر ہماری شاعری میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد صوری و معنوی، دونوں اعتبار سے جو تغیر ہوا وہ بہت ہی انقلاب انگیز ہے۔ [illegible] حالی و آزاد نے اپنی شاعری پیش کی، جس میں مروجہ طرز سے تھوڑا سا انحراف تھا۔ حالی و آزاد کی مثنویاں اس دور کی خاص چیزیں ہیں۔ جن میں ایک نیا انداز بیان اور ایک نیا اسلوب نظر آتا ہے۔ غدر کا انقلاب ہماری زندگی میں اپنی طرز کا پہلا انقلاب تھا، جس نے لوگوں میں بیداری کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ ہر شخص کو اپنی ہستی کا احساس ہو چلا۔ غور و فکر کے دروازے بھی کھل گئے۔ [illegible] نئے نئے خیالات کی اشاعت ہوئی۔ نئے نئے انداز سے باتیں کی گئیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندوستانی سوچنے [illegible] آگے بڑھے۔ غرض یہ کہ زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی [illegible] ادب پر بھی بے پناہ اثرات تھے۔ اب شاعروں کا شعور زیادہ بیدار ہو چلا۔ یہی وجہ ہے کہ غدر کے بعد کا ادب، غدر کے [illegible] ادب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ حالی و آزاد اس زمانے کے نمایندہ شاعر ہیں۔ اور ان کی شاعری میں اگرچہ ہیئت کے تجربات ایسے [illegible] زیادہ نظر نہیں آتے لیکن پھر بھی اگر اسلوب، طرز ادا اور اندازِ بیان کو بھی ہیئت کے تحت شمار کیا جا سکتا ہے، اور ضرور کرنا چاہئے تو یقیناً ان دونوں کی شاعری ہیئت کے اعتبار سے بھی انقلاب انگیز

مثنوی نے شعری سانچوں میں بعینہٖ کوئی ایسی زیادہ تبدیلی نہیں کی سوا اس کے کہ ان دونوں نے مثنوی کے روپ میں چند ایسی نظمیں لکھ دیں جن کا موضوع مثنویوں میں پیش کیے جانے والے روایتی خیالات سے بالکل مختلف تھا۔ مثنوی کے اس استعمال نے اردو شاعری کو اس صنف سخن سے روشناس کیا جس کو ہم آج نظم کہتے ہیں۔

حالی و آزاد کے بعد ادبی تجربات نے کچھ اور بھی تیزی اختیار کر لی۔ چنانچہ اسی زمانہ وہ بھی آیا جب اسمٰعیل میرٹھی نے بے قافیہ نظمیں لکھیں اور شرر نے آزاد نظم کا تجربہ کیا جو ہیئت کے اعتبار سے اردو میں بالکل نئی چیزیں تھیں۔

اسمٰعیل میرٹھی نے ہماری شاعری کو سب سے پہلے نظم معرّا سے روشناس کیا جس میں قافیہ و ردیف کی پابندی نہیں ہوتی۔ اور ان کی یہ کوشش بلا شبہ بڑی اہم ہے، کیونکہ اس زمانے میں کسی نے اس صنف سخن کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں کے مذاق میں بھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اسمٰعیل کی نظموں کی سادگی اور معصومیت نے پڑھنے والوں پر اثر کیا اور بہت سے ان کی نظموں کے گرویدہ ہو گئے۔ اسمٰعیل کی مقبولیت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی بلکہ نظم معرّا کی ہیئت چونکہ پابند نظم کی ہیئت سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتی، اس لئے عوام کے مذاق کو اس کی ترویج میں کوئی بہت زیادہ چیز ایسی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ نظم معرّا میں سوائے اس کے کہ ردیف و قوافی نہیں ہوتے اور باقی وہ ہر حیثیت سے پابند نظم کی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ یہی تمام وجوہات تھے جنھوں نے اسمٰعیل کی راہ میں روڑوں کو نہ اٹکنے دیا۔

برخلاف اس کے شرر نے چونکہ آزاد نظم کا تجربہ کر کے اردو شاعری کو ایک حیرت انگیز انقلاب سے دوچار کرنا چاہا، اس لئے وہ اس وقت زیادہ مقبول نہ ہو سکے کیونکہ عوام کے اذہان اس وقت تک اتنے بلند نہیں ہوئے تھے کہ وہ ایک بالکل نئی چیز کو گوارا کر لیتے۔ چنانچہ شرر کو اس وقت کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اور لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس کی تجرباتی کوششوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی لئے ان کی کوشش ادبی تجربات (؟) کی حیثیت سے آج زندہ نہیں۔

ان دونوں شاعروں کی تجرباتی کوششوں نے یہ اثر ضرور کیا کہ آنے والے شاعروں کو آزاد نظم کا راستہ دکھا دیا۔ جس پر عمل کر کے وہ بہت دور نکل گئے اور آج اردو شاعری کی ہیئت میں جن تجرباتی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے اس میں بڑی حد تک ان دونوں کے تجربات کو بھی دخل ہے۔ آج ان کے تجربات مقبول ہو رہے ہیں کیونکہ حالات سازگار ہیں عوام کے اذہان میں زیادہ بلندی، دماغوں میں زیادہ روشنی اور شعور میں زیادہ بیداری آ چلی ہے ——

حالی و آزاد کے بعد اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے سرور و چکبست، اقبال، جوش، اور عظمت اللہ خاں وغیرہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔

سرور و چکبست نے حالات کے پیش نظر اپنی شاعری کی ہیئت میں کچھ خاص جدتیں کی ہیں۔ وہ خیال کی مناسبت سے بحروں کا استعمال کرتے ہیں اور نظموں کی ہیئت میں بندوں کی ساخت خاص طور پر ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ ان کے خیالات زیادہ تر مسدس، مخمس، مربع اور مثلث وغیرہ میں ڈھلے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری جدتیں پابندیوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن ان جدتوں میں ہیئت کے اعتبار سے تبدیلی پیدا کرنے کا ایک شعوری احساس موجود ہے جو ملتے جلتے حالات کو ہیئت سے ہم آہنگ کرنے کا۔

اقبال کا شعور اس معاملے میں زیادہ بیدار تھا۔ وہ ان کی شاعری میں ہمیں شروع سے آخر تک اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہیئت کو اپنے خیالات کے مطابق بنانا چاہتے تھے۔ وہ خیال کی مناسبت سے بحروں کا استعمال کرتے ہیں اور نظموں کی ہیئت میں بندوں کی ساخت خاص طور پر ان کے بھی پیش نظر رہتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی شاعری میں مواد ان کے اسلوب اور طرز ادا پر غالب ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے پیش نظر یہ حقیقت بھی رہی ہے کہ وہ ان خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کچھ ایسے سانچوں کا استعمال کریں جن میں ڈھلنے کے بعد ان کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں معنوی اعتبار سے جو ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے، وہی صوری اعتبار سے بھی ہے۔ اپنی شاعری کے شروع دور میں جب ان پر وطنیت غالب تھی۔ تو اس وقت ان خیالات کو کچھ ایسی ترنم اور نرم بحروں میں ڈھال کر پیش کرتے تھے جن کا ترنم اور آہنگ بالکل ان خیالات سے ہم آہنگ

ہوتا تھا۔ ان کی اس قبیل کی نظمیں "ہندی ترانہ"، اور "نیا سوالہ" وغیرہ ہیں۔ خیر جیسے جیسے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں معنوی اعتبار سے تغیر ہوتا گیا، تو ان کی شاعری کی ہیئت بھی تبدیل ہوتی گئی۔ یعنی وہ بلند اور فلسفیانہ خیالات کے لیے سخت بحریں استعمال کرنے لگے۔ ان کی ایک نظم ہے جس میں انھوں نے افغانیوں کو خودی کی طرف راغب کیا ہے ؎

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان!
تو بھی اے فرزندِ کہستاں! اپنی خودی پہچان!
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان
موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا، وہ کیسا دہقان!
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!

اس نظم کی بحر، اس کا اتار چڑھاؤ، اس کے اشعار میں الفاظ کی دروبست اور اس کی صورت، یہ سب مل کر مجموعی حیثیت سے افغانوں کی شجاعت، وجاہت، عزم و اخلاص اور شان و شوکت کو ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ اقبال نے ہماری شاعری کی ہیئت میں کافی جدتیں کی ہیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ عوام کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات کے مطابق بنایا ہے تاکہ اس کا مجموعی تاثر زیادہ گہرا ہو سکے۔

جوش بھی اقبال کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ہیئت میں ظاہری صورت کے اعتبار سے کوئی ایسی حیرت انگیز تبدیلی نہیں لیکن الفاظ کا صحیح استعمال، بحروں کا مناسب انتخاب، بندوں کی باقاعدہ تقسیم، خیالات کے ساتھ ساتھ اسلوب، طرزِ ادا اور اندازِ بیان میں ایک خاص قسم کی روانی۔ ان تمام چیزوں نے مل کر جوش کی شاعری کو ہیئت کے اعتبار سے کافی بلند کر دیا ہے۔

اب رہے عظمت اللہ خاں! — تو ان کی شاعری کی ہیئت سارے اردو شاعروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے سنسکرت اور ہندی کے پنگل کو استعمال کر کے ہماری شاعری کو ہندوستانی آہنگ و ترنم سے روشناس کیا۔ انھوں نے اس کو ہندوستانی موسیقی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ لیکن عظمت اللہ خاں نے ایسا کیوں کیا؟ اور وہ کیوں اپنے اس تجربے میں کامیاب ہوئے؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ تو یہی ہے کہ جن خیالات کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے، وہ شروع سے آخر تک ہندوستانی تھے۔ ان میں نہ تو ایران اور فارسی شاعری کی تقلید کا اثر تھا اور نہ ان روایتی جذبات و احساسات کی ترجمانی تھی، جس کو ہمیشہ سے اردو شاعر پیش کرتے آ رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ ان خیالات کو پیش کرنے لگے تو ان کے فن کارانہ شعور نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستانی خیالات اور ہندوستانی جذبات و احساسات کے ساتھ ہندوستانی آہنگ و ترنم کا بھی استعمال کریں۔ . . . .

یہ سب شاعر یعنی سرور، چکبست، اقبال، جوش اور عظمت اللہ خاں، پابندیوں کے ساتھ ہماری شاعری کی ہیئت میں تبدیلیاں کرتے رہے۔ انھوں نے الفاظ کے استعمال، بحروں کے انتخاب اور طرزِ ادا اور اندازِ بیان کی ندرت کو خاص طور پر اپنے پیشِ نظر رکھا لیکن نظموں کے بندوں کی ساخت وغیرہ میں ایسی کوئی خاص تبدیلی نہیں کی جو قابلِ غور ہو۔ ان سب میں سے اگر کوئی بہت آگے بڑھا تو مسدس، مخمس اور مثلث وغیرہ کو اس نے استعمال کر لیا۔ اور بس!

لیکن ان کے فوراً ہی بعد اردو شاعروں کا جو ایک گروپ آیا، اس نے ہماری شاعری کی ہیئت میں کچھ ایسی تبدیلیاں کیں، جو فنی اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ ان سب نے خیال و ہیئت کی ہم آہنگی کے پیشِ نظر بندوں کی ساخت کو خاص طور پر بدلا۔ جن میں کہیں مصرعوں کے ارکان کو گھٹا بڑھا کر ایک خاص قسم کا اثر ڈالنے کی کوشش تھی اور کہیں گیتوں میں ہندی بحروں کے ساتھ ساتھ نئی شکلیں پیدا کرنے کا خیال! اور یہ تبدیلیاں نتیجہ تھیں ہمارے ان شاعروں کے اندر ایک بڑھتے ہوئے فنکارانہ شعور کا!

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مروّجہ شاعری کے سارے سانچے بدل گئے۔ ایسے شاعروں میں حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، میرٹھی اختر شیرانی، ساغر نظامی، احسان بن دانش، روش صدیقی، اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ہاتھوں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں ہوئیں :-

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پُرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گلشن کی گل پوش اداؤں موسم کی خاموش فضائیں
کوئل کی مدہوش صدائیں
بن میں بول رہے ہیں مور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

اندھی جوانی
(حفیظ جالندھری)

آئینۂ آب پر، موجۂ شاداب پر، چادرِ سیماب پر
سایۂ مہتاب پر، منظرِ شب تاب پر، جیسے لبِ خواب پر
ہے مری کشتی رواں
اور ہوں میں نغمہ بار
اور ہوں میں نغمہ بار، پردۂ ہر ساز سے
وجد میں ہے جوئبار، مستیٔ آواز سے
جذبۂ مے ہوش میں، ذرہ سکوں کوش میں، سیل دو ابوس میں
کیف میں اور جوش میں، موج کی آغوش میں، رہ گزر دوش میں
ہے مری کشتی رواں
اور میں ہوں نغمہ بار

(موجوں کے ساز پر ملاح کا گیت)
(ساغر نظامی)

یہ کیف گہ دشت، یہ برسات کا موسم یہ وجد کا عالم
ہے رقص میں طاؤس کہ اک رنگ مجسم رقاصۂ پیہم
سینائے کلیمی ہے کہ ہے سینۂ زریں یا چشمۂ سیمیں
جنبش میں ہے اعجازِ رہِ آزادیٔ رنگیں یا گردنِ پرخم
نیلوفری ہے دم پہ یہ پاشیدہ جواہر یا چرخ پہ اختر
یا نیند سے جاگے ہوئے سبزے کی جبیں پر ہے رقص میں شبنم

طاؤس
(روش صدیقی)

پھر طوفاں کا پُرجوش سماں بن بن کر گھوما
ذرّوں نے گردوں چوما
پھر اسرافیل نے کروٹ کا، پھر سینہ دھڑکا
پھر دور کے ایوانوں میں جھانجن کی جھن جھن گونجی
جھانجن کی جھن جھن گونجی

دھڑکن
(احمد ندیم قاسمی)

جبیں پہ ایک موج رنگ و نور سی لئے ہوئے
نظر میں شوخیاں لئے ہوئے
ردا [illegible] انگلیوں میں دابے ہوئے
مرے خدا یہ کون ہے؟

قدم قدم پہ ایک نغمہ سا جگا رہی ہے وہ
کچھ ایسے آ رہی ہے وہ
بلند و پست راستوں [illegible] جھک رہی ہے وہ
مرے خدا یہ کون ہے؟

شکاری
(احمد ندیم قاسمی)

اے عشق کہیں لے چل، اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہ عالم سے، لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

(اختر شیرانی)

ان سب میں ہیئت مواد و ہیئت کی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی مخصوص قطع سطراں کی صورت ہی پڑھنے والے پر ایک خاص قسم کا اثر ڈالتی ہے۔

ہیئت کا یہ تدریجی ارتقا اس حقیقت کا غماز ہے کہ ہماری شاعری ہمیشہ کسی "نئے افق" کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ چنانچہ وہ اس منزل پر اس وقت پہونچی جب ۱۹۳۰ء کے بعد راشد آیا اور جس نے ہماری شاعری کو بالکل ایک نئی ٹکنیک اور ایک نئے آہنگ ترنم سے روشناس کیا۔ یہ آزاد نظم کی ابتدا تھی۔

آزاد نظم کا چراغ یوں تو شرر کے ہاتھوں روشن ہو چکا تھا لیکن شرر اپنے وقت سے کچھ پہلے پیدا ہو گیا وہ زمانہ آزاد نظم کی ترویج و اشاعت کے لئے سازگار نہ تھا۔ ابھی لوگوں کے اذہان اتنے بلند نہیں ہوئے تھے ان میں کسی قسم کی جدت کو قبول کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ان کو مروّجہ چیزوں ہی میں زیادہ لطف آتا تھا۔ زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت انقلاب کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ اس زمانے کے سماج کے افراد معمولی تبدیلیوں کے خواہشمند تھے چنانچہ سیاسی میدان میں بھی ان کو زیادہ آگے بڑھنا پسند نہ تھا۔ لیکن راشد کے وقت تک آتے آتے حالات سب کچھ بدل چکے تھے۔ مختلف ممالک کے اندر زندگی کے ہر شعبے میں ایک انقلابی کیفیت کارفرما تھی جس نے ہندوستانیوں کو بھی غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا تھا ان لوگوں کے پاس سوچنے کے لئے بہت سی نئی باتیں تھیں

سلجھانے کے لئے سینکڑوں پیچیدہ مسائل تھے۔ حل کرنے کے لئے ہزاروں مشکل سوالات تھے۔ چنانچہ ان تمام حالات نے مجبور کر دیا شاعروں کو یہ سوچنے کے لئے کہ وہ ان تمام پیچیدہ اور گہرے خیالات کو پیش کرتے وقت پابندیوں کے بندھنوں کو کچھ ڈھیلا ضرور کر دیں۔ کانگریس کے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دینے کے بعد آزادی کا تصور زندگی کے ہر شعبے میں عام ہوتا جا رہا تھا اس کے علاوہ شاعر ہیئت کی اہمیت کو اب محسوس کرنے لگے تھے اور ان میں یہ شعور کافی پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے خیالات اور ہیئت میں ایک تام ہم آہنگی پیدا کریں۔ ہر ملک کے اندر زندگی کے ہر شعبے میں انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ اور ان میں جو چلتی ہوئی اس قسم کی تحریکات کے اثرات ہندوستان بھی قبول کر رہا تھا۔ کیونکہ دنیا آج رسل و رسائل کی برق رفتاری کے باعث ہر دو ممالک ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ ادب میں بھی جو نئے رجحانات مختلف ممالک میں پیدا ہوئے، جو نئی نئی تحریکیں چلیں، جس تجربات کا چراغ روشن ہوا، ان کے اثرات ایک دوسرے پر برابر پڑتے رہے۔ ہندوستان بھی ان سے بچ نہ سکا۔ اُردو پھر بھلا ان اثرات سے کس طرح دامن بچاتی۔

۔۔۔۔۔۔ تو اردو کی آزاد نظم کو صرف مغرب کی تقلید اور نقالی ہی نے پیدا نہیں کیا، بلکہ حالات و واقعات اور وقت و ماحول کے تقاضوں نے۔ وہ بالکل فطری طور پر پیدا ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں لائی جو ہماری روایات، افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات کے مطابق نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں مروجہ ہیئت سے پوری طرح انحراف ہے، لیکن عروض وہی ہے، بحریں وہی ہیں، آہنگ وہی ہے۔ صرف اس میں قافیے کی پابندی اور ارکان کی تعداد کا تعین ضروری نہیں۔ قافیہ اگر فطری طور پر آ جائے تو آزاد نظم لکھنے والا اس کو اس کے لئے اپنی شاعری کے دروازے بند نہیں کر دیتا۔ لیکن اس کی تو یہ تمام تر قافیہ پیمائی ہی تک محدود نہیں ہوتی۔ شاعر صرف قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ آزاد نظم لکھنے والے کے پیش نظر سب سے زیادہ جو چیز رہتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو زیادہ صفائی کے ساتھ عوام تک پہنچا دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قافیہ پیمائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا، ارکان کی تعداد کا تعین بھی اسی خیال سے پیش نظر ضروری نہیں۔ وہ بھی موقع اور محل کی مناسبت سے گھٹائے بڑھائے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ آزاد نظم کی ضرورت اور اہمیت صرف اس ایک بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس وقت کی معیاری آزاد شاعری پچھلی پابند شاعری سے خیال، اندازِ بیان، اسلوب اور طرزِ ادا کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ آزاد نظم کا شاعر اپنے ذہن پر بڑی بڑی چھائے ہوئے خیالات اور ان کے تسلسل اور روانی کو برقرار رکھنے کے لئے اس صنفِ سخن کا استعمال کر رہا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اچھی آزاد نظموں کو بھی مبہم کہہ دیتے ہیں حالانکہ ان میں ایسا زیادہ ابہام نہیں ہوتا بلکہ خیال کی گہرائی، پھیلاؤ، تسلسل اور روانی اوسط درجے کے دماغوں کو نئی چیز ہونے کی وجہ سے مبہم معلوم ہوتی ہے۔ آزاد نظم کا شاعر صرف لفظی اور ساخت کی چیزوں کو پیش نہیں کرتا۔ اس کے پاس تو خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے جس کے چشمے اس کے دماغ سے پھوٹ کر کسی معمولی ظرف میں نہیں سما سکتے ان کے لئے تو ایک ایسے ظرف کی ضرورت ہے جس میں خود سمندر اور آسمانوں کا سا پھیلاؤ ہو اور جس میں پہنچ کر وہ دریاؤں کی صورت اختیار کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص قسم کے حالات مخصوص قسم کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نظم کی ان خصوصیات کے پیش نظر ہمارے بعض پابند شاعری کرنے والے بھی آزاد نظم کی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ ایسے شاعروں میں ڈاکٹر تاثیر، احمد ندیم قاسمی، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور اسلام مچھلی شہری وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں۔ یہ لوگ عموماً پابند شاعری کرتے رہے۔ لیکن جب موقع پڑا اور انھوں نے کسی خاص خیال کو آزاد نظم کے سانچے میں اچھی طرح ڈھلتا ہوا پایا، تو اسی میں طبع آزمائی کی۔ اسی طرح آزاد شاعروں کو بھی پابند شاعری سے چڑ نہیں ہے بلکہ جب ان کا فن کارانہ شعور کسی خاص خیال کو پابند نظم کے سانچے ہی میں بخوبی ڈھلتا ہوا پاتا ہے تو وہ اس سے گریز نہیں کرتے، اور اسی میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں چنانچہ راشد اور میرا جی، جو اُردو کی آزاد شاعری کے امام ہیں، ان کے یہاں پابند نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی موجود ہے۔ اور صرف نظموں ہی پر منحصر نہیں۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں۔

شاعری میں ہیئت کا آخری تجربہ آزاد نظم ہی نہیں ہے۔ بعض شعراء نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے۔ ہیئت کی اس قسم کی تبدیلی کی مثالیں انگریزی میں مس ایڈیتھ سٹول Miss Edith Sitwell کمنگس Cummings اور ای ای کمنگس کے یہاں

نئے شاعروں کی نظمیں پیش کرتی ہیں جنہوں نے ابھی ادب میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں کی ہے بستوں قوافی بندوں کی ساخت کچھ اس طرح رکھی ہے کہ اگر ان میں سے ہو ... مصراعوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی ان کی ہیئت ہی سے ہمارے اوپر ایک خاص قسم کا اثر مرتب ہوتا ہے۔ کہیں ... ان نظموں کے اشعار اور سطریں، ... الفاظ تک کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ بعض شاعروں کی زیادتی کے باعث اس قسم کے تجربات بعض اوقات اچھے نہیں معلوم ہوتے لیکن بہرحال وہ تجربات ہیں اور تجربے ہمیشہ امید افزا بھی ہو سکتے ہیں۔

اردو میں ایسے تجربات ابھی آزاد نظم میں نہیں ہو رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بحیثیت صنف سخن ابھی بالکل نووارد ہے ابھی تو بہت سے قدامت پرست اس کو صنف سخن ہی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، اسی وجہ سے ہمارے فنکار ابھی اس کے آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پیش نظر ابھی تو اس صنف سخن کی حیثیت کو تسلیم کرانا ہے۔ پھر بھی میراجی، مختار صدیقی، دستور ... عادل وغیرہ کے تجربات اس سلسلے میں کافی اہم ہیں۔ میراجی مصرعوں کے ارکان کی اعداد کو زیادہ بڑھا کر ... ہیں۔ خاص قسم کا اثر پیدا کرنا ہے۔ اس کی نظمیں "سرسراہٹ" اور "محرومی" اسی طرح کی مثالیں ہیں۔ کیا ان مصرعوں کا مجموعی تاثر سرسراہٹ (اور ایک خاص قسم کی سرسراہٹ جو جسمی کیفیت کے خاص لمحے کی پیداوار ہو) کی کیفیت پیدا نہیں کرتا؟

یہاں ان ستونوں پہ ہاتھ رکھ دوں
یہ لہریں ہیں بہی جاتی ہیں اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موج بادہ ہیں — ساغر کی خوابیدہ فضاؤں میں
اچانک جاگ اٹھتی ہے
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں — شاید قہقہہ اٹھ کر
مرے دل کو جکڑ لے اپنے ہاتھوں سے،
مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لہریں ابھی تک ساحلی منظر سے ناواقف ہیں۔ یونہی اک بہانہ کر رہی ہیں آپ بہانہ کس کو کہتے ہیں؟
بہانے ہی بہانے ہیں! (سرسراہٹ)

مختار صدیقی "خیال درباری بلمپت" میں پھیلاؤ کو پیش کرتا ہے، تو اس کی ہیئت ہی سے ہم پھیلاؤ کی کیفیت کو محسوس کرتے ہیں:

روشنی سیر ہوئی!
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی،
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی، اور شب کی دلہن،
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی،
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن، شرمائی، لجا کر سمٹی
روشنی سیر ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی لجا کر سمٹی سمٹ کر بیٹھی،
انہیں شمعوں نے دیا چاند کا تعویذ اس کو!!
وہ جہاں مطلع انوار ہوئے دیکھو تو!
ترکماں ہجرت اکبر آیو — ہجرت اکبر آیو!! (خیال درباری بلمپت)

اور وشوامتر عادل کی نظم "راہرو" میں اس کا اُتار چڑھاؤ کسی کے چلنے کی کیفیت کو پڑھنے والے کے سامنے بے نقاب کر دیتا ہے ؎

بکھرتی ہوئی چاندنی اپنے خاموش ہونٹوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے
وہ سرگوشیاں جن کو سنتا ہوں، لیکن یہ ظاہر کئے جا رہا ہوں
نہیں میں نے ان کو سُنا ہی نہیں ہے
میرے پیچھے پھیلے ہوئے راستے پر کہانی کے ذروں کی رنگین قبریں بنی جا رہی ہیں۔ (راہرو)

لیکن ان میں سے کوئی وہاں تک نہیں پہونچا جہاں انگریزی شاعر پہونچ چکے ہیں پھر بھی یہ تجربات اُردو شاعری میں ہیئت کے اعتبار سے بالکل نئی چیزیں ہیں، اور جنہوں نے اس پر کافی اثرات چھوڑے ہیں۔

آزاد نظموں سے قطع نظر، پابند نظموں میں بھی اس قسم کے تجربات کا سلسلہ جاری ہے اور شاید آزاد نظم سے زیادہ پابند نظموں میں اس قسم کے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ فیض کی ساری شاعری اس قسم کے تجربات کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس کی ہر نظم میں ہیئت کا حیرت انگیز تغیر موجود ہے لیکن وہ ہے سب پابندیوں کے ساتھ۔ اس کے ایک ایک مصرعے اور ایک ایک نقطے کا استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خیال کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ جہاں خیال نے اس کو روکا ہے، وہ رُک گیا ہے جہاں اُس نے آگے بڑھایا ہے وہ آگے بڑھ گیا ہے۔ غرض یہ کہ وہ کہیں بھی اپنی طرف سے نظموں کی ماہیئت کو نہیں بناتا بلکہ جس طرح خیال چلتا ہے، اور جو رُخ اختیار کرتا ہے اسی طرف اس کی شاعری کی ہیئت بھی چلنے لگتی ہے۔ سلام کی بھی اکثر نظموں کا یہی حال ہے جس میں "جنگلی ناچ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں اس کی فن کاری نے مصرعوں کے اُتار چڑھاؤ سے رقص کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میراجی کی "کھلونے" بھی اپنے اندر ہیئت کے اعتبار سے ناچ کی کیفیت رکھتی ہے۔ قیوم نظر کے "آتشیں پرندے" بھی ہیئت سے آتشیں پرندے معلوم ہوتے ہیں اور یوسف ظفر کی "رقاصہ" ایک نوجوان اور چنچل کے سیماب آسا رقص کی تصویر پیش کر دیتی ہے۔ اختر الایمان اور مجیب الرحمٰن کی اکثر نظموں کی ہیئت آج کل کے نوجوانوں کے سوچنے کے طریقے کو ظاہر کرتی ہے اور جو شروع سے آخر تک اسی انداز سے ہم آہنگ ہیں۔

غرض یہ کہ شاعری میں ہیئت کے تجربات کی ندی بہہ رہی ہے۔ کون جانے کہ کل وہ کون سے مقام سے گذرے گی۔ کون سا پہلو بدلے گی اور کیا نیا رُخ اختیار کرے گی۔ جب تک زندگی میں تغیر ہوتا رہے گا۔ سوچنے کے انداز بدلتے رہیں گے مذاق میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ اُس وقت تک شاعری بھی انقلاب کے سیلاب سے بچ نہیں سکتی کیونکہ وہ بہرحال زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاعری انسانوں کی طرح زندہ ہے۔ اگر زندہ انسانوں کے عادات و اطوار، رہن سہن، اقوال و کردار، طور طریقوں اور لباس و وضع میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ فیشن بدل سکتے ہیں۔ تو شاعری کی ہیئت میں نئے نئے شگوفے کیوں نہ کھلتے رہیں، دُنیا کا قانون ہی یہی ہے، جہاں ہر لمحہ اور ہر گھڑی، وقت کی ہر کروٹ، ہر جنبش اور ہر انداز سے یہ صدا آتی رہتی ہے ؎

کیفیت باقی پُرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر (اقبال)

عبادت بریلوی؛

دو گیت

ایک ہی آس

آس ہے اس تمہیں جیون کی
تمہیں کو لاج ہے تن من دھن کی
تمہیں سے لو ہے آن
تم بھگتن کے بھگوان

روشنا کال میں جوت تمہاری
آپ ہی دلوتا آپ ہی پجاری
آپ اپنی پہچان
تم بھگتن کے بھگوان

ان داتا جگ پالنہارے
نجی کھیونہارے سہارے
مل مل جائیں پران
تم بھگتن کے بھگوان

جگ مگ ہے آکاس تمہارا
تاروں میں پرکاش تمہارا
روپ انوپ کی شان
تم بھگتن کے بھگوان

بھوکوں کے ان داتا تم ہو
سب کا رشتہ ناتا تم ہو
دھن دھن تم دھنوان
تم بھگتن کے بھگوان

گیتوں کا ملّاح

میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا
سُندر جل تھل، ہردے ہلچل
ساگر ہے بے تھاہ، چلا چل
سوچ ہے اب بیکار
میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا

دھرتی کی سُدھ ہے نہ گگن کی
جانے کیا آشا جیون کی
سوجھے آر نہ پار
میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا

یہ سارا سنسار ہے تیرا
سب اپنی اور اس بار ہی تیرا
تو ہی کھیون ہار
میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا

چاند ہے برلیا، تارے راگی
اُٹھ طوفاں مچا، سیرا گی
جھوم اُٹھے سنسار
میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا

تاروں کے اُس پار کی بستی
سُندر جگمگ ہستی ہستی
لے چل ہاں اُس پار
میرے گیتوں کے ملّاح نیّا دھیرے دھیرے کھینا

عشرت رحمانی

دُھندلکوں کے پیچھے

لیکن اچھے دن تو بہت تیزی سے گذر جاتے ہیں نا۔ پھولوں کے موسم کی رنگین سی ہوا کے ایک ہلکے جھونکے کی طرح۔ جو آلوچے کی پتلی ٹہنیوں کو لہراتا، پردوں کو ہلاتا اور بالوں کی لہریں اُلجھاتا ہوا دور سپیدے کے گھنے سایوں میں کھو جاتا ہے۔ سیب کی سفید کلیاں کھلتی ہیں اور دوپہر ڈھلتے زرد ہو کر زمین پر گر پڑتی ہیں۔ رات کی رانی مہکنا جانتی ہے لیکن صبح ہوتے ہوتے اس کی سُہانی خوشبوئیں خوابوں کے ساتھ ساتھ ناجانے کون سی انجانی بستی کو چلی جاتی ہیں۔ چاندنی کی ٹھنڈی موجیں تو صبح کا بھی انتظار نہیں کرتیں۔ بے درد اور بے حس چاند بہتے نہیں کہیں اَن دیکھی دُنیا کی وادیوں میں جا کر چھپ رہتا ہے جہاں سُنا ہے کبھی گرم اور گرد آلود ہوائیں نہیں چلتیں بگولے نہیں اُٹھتے۔ اور انوکھے سپنوں کے نقرئی پل چھوٹے چھوٹے ستاروں کی طرح نہیں ٹوٹا کرتے۔

پر زندگی کے تھکے ہارے مسافران چمکیلے اور چھُپے ہوئے راستوں کی تلاش میں بھٹکتے اندھیرے جنگلوں اور تپتے ہوئے ریتیلے میدانوں میں جا نکلتے ہیں جہاں شعلے لپکتے ہیں، مصیبتیں قہقہے لگاتی ہیں، تباہیاں مسکراتی ہیں۔ بگولوں کے گرم اور کسیلے دھوئیں کی تاریکی کے پیچھے سے کوئی مدھم سی، خنک سی روشنی جھلملاتی ہے لیکن پھر دھندلکوں میں چھُپ جاتی ہے۔

بھئی خدا کے لئے! مجھے جذباتی بن جانے کا الزام مت دو۔ میں کیا کروں۔ تمہیں سالِ نو کی وہ کہر آلود شام یاد ہے — ؟ ۳۱ دسمبر۔ آج بھی وہی تاریخ ہے۔ ہم سب اُس روز کتنی دھوم مچایا کرتے تھے۔ تحفے اور مبارکبادیں۔ جوشیاں اور قہقہے۔ ۳۱ دسمبر! بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کی ہمارے دلوں میں کیسی محبوب سی، عزیز سی اہمیت اور قدر تھی۔ تمہاری سالگرہ کی تاریخ۔ عید کا دن، نو روز کی رات، امتحان کے آخری پرچے کی شام۔ ان معمولی چیزوں کی sentimental value کی وجہ سے زندگی زیادہ دلکش اور پُر لُطف معلوم ہوتی تھی نا۔ مگر یہ کیسی پیاری سی حماقت ہے۔ پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ رونے کو دل چاہتا ہے۔ اور پھر یہ سوچ کر ہنسی بھی آجاتی ہے کہ پہلے ہم دوسروں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے — واقعات کا جوار بھاٹا بہت ہی عجیب چیز ہے ——!

—— دُنیا بہت مزیدار جگہ تھی۔ ہے نا؟ ہم اور تم۔ ہمارا گھر ہمارے عزیزوں اور دوستوں کا حلقہ۔ ہماری چھوٹی چھوٹی مصروفیتیں اور تفریحیں۔ ننھے منے غُصّے اور پیار۔ فلسفۂ حیات پر غور کرنے کی کبھی ذرا سی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ تم پینٹنگ کرتی تھیں۔ میں کارٹون بناتی تھی۔ پھر دونوں مل کر اپنے کارناموں پر تبصرہ کرتے تھے۔ ابسن کا "گڑیا کا گھر" پڑھ کے ایک دفعہ تم تقریباً رونے لگی تھیں اور میں نے تمہیں ڈانٹا تھا۔ ہم اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتے تھے لڑتے تھے اور چاکلیٹ کھاتے تھے۔ اب تم جانے کیا بن گئی ہو۔ مجھے بھی یقین نہیں کہ اب میں کیا ہوں کم از کم دوسرے تو مجھے نہ معلوم کیا سمجھنے لگے ہیں۔ مغرور، ضدی، خود پسند۔ اور جھوٹ کی شائق۔ واقعی زندگی اب جھوٹ اور دھوکے کے رنگین لبادے میں لپٹ کر رہ گئی ہے

لیکن اگر وہ گذری باتیں بے تحاشا یاد آتی ہی چلی جائیں تو میں کیا کروں۔ خدارا مجھے جذباتی مت سمجھو۔ ۳۱ دسمبر کی شام! اُف میرے اللہ۔ ! یاد ہے اُس نے کہا تھا کہ اگر جھکتے ہوئے اونچے اونچے ستاروں کا عکس پگڈنڈی کے کنارے ٹھہرے ہوئے گدلے پانی میں پڑے تو اس میں ستاروں کا کیا قصور۔ لیکن جب وہ بے حقیقت جوہڑ ان ستاروں کے خواب دیکھنے لگے تو کیا ہو —؟ وہ اونچے اونچے ستارے تو صرف گومتی کے شفاف سُنہرے پانیوں میں آنکھ مچولی کھیلیں گے۔ اس کا فلسفہ! اس کی معموں جیسی باتیں! اس کچھ پوچھیے انداز۔ مجبوریوں کا تند رو سیلاب تاش کے بنوں کے اس محل کو بہت دُور بہا لے گیا ہے جو تم نے خوشی خوشی بنایا تھا۔ وہ دن بھی ختم ہو چکے ہیں۔ آؤ ہم بھی ان کا ساتھ دیں۔ ہمارے رُخسار چڑچڑے بچوں کی گرمی اور آتشدان میں لپکتے ہوئے شعلوں کے عکس نے سرخ کر دیئے تھے۔ مٹیلی کارمن میرانڈا کی نقل کر رہی تھی۔ اسلم وائلن پر وہی نغمہ بجا رہا تھا

جس سے ہم ہر سال یہی ۳۱ دسمبر کی رات کی روایت باقاعدہ کرنے لگے مبتل اور اسلم، انور اور صبیحہ، ایڈمنڈ اور خورشید۔ ملاحتیں اور صباحتیں، ناز اور نیاز۔ قہقہوں کی پیالیوں سے ماضی کے بھیگے مٹے جیسے ٹکرا رہے تھے۔ زندگی، گرمی، خوشیاں، قہقہے۔ مجھے نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے ہم بہت کمزور ہیں، دوست کرتے ہیں۔ سینوں کے رنگین سلسلے بہت جلد بکھر جاتے ہیں نا۔

اسلم والس بجا رہا تھا۔ مبتل ان لرزتے تاروں سے اٹھتے ہوئے نغموں کے سیلاب میں بہی جا رہی تھی۔

I, I, I, I, I, I, I, like you a verry muchh'
I, I, I, I, I, I, thank you-a grand''

ہے۔ کیسا مضحکہ خیز گانا تھا۔ ہم سب ہنستے ہنستے لوٹے ہوئے جا رہے تھے کتنے بیوقوف تھے ہم لوگ ——

Why, why, why, why, why, why, when I feel your touch,
My heart begins to beat, to beat the band'

مبتل رقص کر رہی تھی خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ کچھ یاد ہے Consequences کے کھیل میں جو ہم نے ایک دوسرے کے نام تجویز کئے تھے۔ "ملم یارنگ" "ہنکی باؤ" اور جانے کیا کیا یا اللہ۔ پچھلے مہینے میں نے کسی ماؤس کا نام اسٹیٹسمین کی ہلاک شدگان کی فہرست میں دیکھا تھا۔ خیال تو کرو۔ وہ ہر وقت ہنسنے اور شور مچانے والا شخص جو صرف زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ ہم سب زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے نا۔ عمر بھر ہنستے رہنے اور میوزیکل چیئرز کھیلنے کے لئے۔

—— مبتل نے ایک اور گیت شروع کر دیا تھا۔ "آؤ رقص کریں ہم"۔ لیکن پھر ہم تینوں کمرے کی گرم و روشن فضا سے بچنے کے لئے باہر خاموش بالکونی پر نکل آئے تھے —— یہ تیزی سے پرواز کرتے ہوئے لمحات ماضی کی بوجھل یادوں کو اپنے آنچل میں سمیٹ کر بہت دور لئے جا رہے ہیں۔ یہ ماضی کی گرد ... کرنا چاہتی ہیں۔ اب پچھلی ساعتوں کا غم کرنے کا کیا فائدہ ——؟"

اس نے بالکونی کی ریلنگ پر جھکتے ہوئے ڈرامیٹک انداز سے کہا تھا۔ "بھئی ابھی شاعری اس وقت تو بھول جاؤ"۔ شاید تم بولی تھیں۔ دھیمی سی آواز میں جیسے کسی سحر کے زیر اثر تھیں اور اس سے بچنا چاہتی تھیں۔ ہماری نظروں کے سامنے درختوں کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں کہیں کہیں مدھم روشنیاں جھلملا اٹھتی تھیں۔ خوابیدہ کائنات (ناکامیوں اور مایوسیوں کے سرد دھندلکے میں لپٹی ہوئی آنے والی کل کے انتظار میں) خاموشی کی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ دور، جعفر منزل کا اداس سنہری گنبد اور یونیورسٹی کی مغرور برجیاں اسی زرد اور بھاری کہرے میں ڈوبی جا رہی تھیں۔ ہمارے محبوب لا مارٹینیر کے کنگوروں کے سیاہ کنارے دھند میں کھوئے ہوئے کیا سوچ رہے تھے۔ اس کے اونچے ہال کے روشندانوں میں سے ہلکی نیلی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ ضیافت شروع ہو چکی ہے۔ تم نے کہا تھا ہر سال ۳۱ دسمبر کی رات کو وہ ہال نیلی روشنیوں سے جگمگا اٹھتا ہے جب ہم تم وہاں تھے اور اب بھی۔ نئے سال کے استقبال کے لئے وہ شمعدان اب بھی جلائے جاتے ہیں۔ کل نیا سال ہے۔ زندگی کے غبار آلود راستے کا ایک اور نامعلوم سنگ میل۔ کل کے بعد کیا کیا ہوگا۔ تجدید حیات، اہرام نو، نیا افق، آفتاب تازہ —— ہش۔ جذباتی لغویات کی انتہا۔ دنیا نوجوں کی نواں رہتی ہے بوڑھی ہوتی جا رہی ہے بلکہ اور خستگی زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن لوگ اچھے اچھے خواب دیکھنے سے باز نہیں آتے۔

"اُف خدارا اب اندر چلو۔ مجھے تو سردی بھی لگنے لگی۔" واقعی اتنی دیر تک گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے اور شور مچاتے مچاتے زوروں کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے ساتھی ڈنر کے لئے دوسرے کمرے میں جا چکے تھے میوزک روم خاموش پڑا تھا۔

—— "سردی لگ رہی ہے؟ راحتوں اور رنگینیوں کو ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑنا نہیں چاہتیں؟ تم تو بڑی بڑی دشوار گزار پگڈنڈیوں اور ویرانوں میں سفر کرنے کے لئے تیار ہو ——؟" وہ اسی طرح ریلنگ پر جھکا ہوا تھا۔

"ہاں لیکن تمہارے ساتھ۔ تمہارے سہارے" —— پر یہ الفاظ زبان پر نہ آ سکے۔ تم بھی خاموش تھیں۔ فرازِ آسمان سے

ایک ننھا سا بیچارہ ستارہ ٹوٹ کر تاریکی کی گہرائیوں میں گم ہو گیا ہم دونوں جیسے سہم سے گئے۔

——— "آؤ رے مسخرو چلو جلدی ورنہ ہم تمہارے بغیر ہی شروع کر دیتے ہیں" اسلم نے اندر سے چلا کر آواز دی۔

پھر بارہ بجے۔ کریکرز توڑے گئے۔ کرسیاں الٹی گئیں۔ کشنوں کی لڑائی ہوئی "ہیپی نیو ایر" —— نیا سال آگیا۔ نئی خوشیاں۔ نئی امیدیں —— نئی زندگی۔ یقیناً۔ اس نئی خوش آشامیاں۔ پینے والوں کی بارہ نہیں۔ تباہ کاروں کے بدبدار نعرے۔ نیا سال!!

ہم سب پاگل تھے۔ احمق۔ تم بھی اور میں بھی۔ اور وہ بھی۔ اسلم، متیل، انور، امت سب ہم ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ محبت تھی۔ اور رفاقت کا خلوص۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ طوفانوں کے مقابلے میں ایک ہی تختے پر بہنے والے ایک ہی پگڈنڈی کے مسافر۔ کیسی کیسی چھوٹی اور سنہری غلط فہمیاں تھیں اور تمہیں چاہتا تھا کم از کم یہی ظاہر کر رہا تھا۔ جوہڑ کا پانی اوپر اور نیچے سے ستاروں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسلم متیل پر مرتا رہتا تھا۔ لیکن اب تک بالکل سلامت ہے۔ ہاں انور مر چکا ہے۔ سوچو یہ بھی الفاظ کہنے میں کتنے آسان ہیں لیکن اس کی اصلیت کتنی خوفناک، بھیانک اور ظالم —— وہ اٹلی میں اپنی پوسٹ کی حفاظت کرتے ہوئے دشمن کے ایک مورچے پر حملہ کر رہا تھا کہ اس پر مشین گن کی گولیوں کی بوچھار پڑی اور وہ مر گیا۔ نیلوفر کے ایک نازک سے پودے کی طرح گر پڑا اور ختم ہو گیا۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ ایک لمحے کے اندر اندر اس کا دنیا میں آنا اور نہ آنا برابر ہو کے رہ گیا۔ تم نے اس کی موت کی خبر سنی ہو گی تو گہری سی سانس بھر کر رہ گئی ہو گی۔ سچ سچ بیچارہ متیل اور صفیہ شاید ملکہ بھی سسکی ہوں۔ خدایا ——!

بتاؤ زبیدہ، کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ ابھی ۳۱ دسمبر کی رات کو کلاک کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ سکو۔ وہی گھڑی ہے وہی دنیا ہے۔ وہی ہم تم ہیں۔ نیا سال اپنے دامن میں نہ جانے کتنی خوشیاں اور آنسو چھپائے چلا آ رہا ہے ہنس کر اس کا استقبال کر سکو گی۔ وہ کب بھول سکی ہو جس سے پہلی جنوری کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ اسلم کے وائلن کے تاروں میں تو شاید زنگ بھی لگ گیا ہو گا وہ دن بھر راشننگ کے دفتر میں سر کھپا کر شام کو گھر جاتا ہے تو اس کی بیوی کی جھلائی ہوئی آواز اور اس کے تین چھوٹے چھوٹے بچے جو ہیں ہیں کرتے ہوئے اس کے سر کے درد کو اور بڑھا دیتے ہیں —— ہوائیں گنگناتا اور گاتے برستے ہوئے تاروں پر محبوب کے ملنے سمندروں اور بام کے درختوں پر برستی ہوئی رسیلی چاندنی کے خواب آلود نغمے راشننگ کے اعداد و شمار کی الجھنوں سے بہت دور ہیں۔ بہت ہی دور۔

پرنہ زبیدہ۔ اچھے دن کہیں پیچھے رہتے جاتے ہیں۔ مجھے خدا سے بڑی شکایت ہے۔ بہت سی شکایتیں ہیں دیکھو تو سہی۔ میں خدا سے روٹھنا بھی سیکھ گئی ہوں۔ ذرا فلسفی بنتی جا رہی ہوں۔

ہماری کیسی خوشگوار دنیا تھی۔ ہمارا سوئیٹ پی کا باغ۔ ناشپاتی کے درخت۔ باورچی خانے کی چمنی سے اٹھتا ہوا پرسکون سا دھواں۔ نوکروں کی مانوس چیخ پکار۔ امی کے احکام اور ڈانٹ ڈپٹ۔ سوئیٹ پی کی کیاریوں پر منڈلاتی ہوئی رنگین مکھیوں کی بھنبھناہٹ، دوپہر کے سناٹے میں ریلوے لائن کے اس پار سے آتی ہوئی پپیہے کی سیٹی اور رین بگی کی صدائیں۔ وہ مخصوص اور محبوب سی آوازیں، وہ عزیز فضائیں، جیسے دنیا کی ہر چیز صرف ہمارے آرام کے لئے بنائی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ ہماری اس دنیا میں داخل نہ ہو سکتا تھا تو یہ ستاروں کا قصور تھا۔ ہم نے فرصت اور بے فکری کی ایک سہ پہر ناشپاتی کے سائے میں بیٹھ کر جتنے احمقوں کی فہرست تیار کی تھی اس میں میں نے اس کا نام سب سے اوپر رکھا تھا اور تم بگڑ گئی تھیں۔ وہ تمہارا آئیڈیل تھا نا ——! یہ تخیل پرستیاں بعض مرتبہ کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں!

اس روز تم بھاگی بھاگی آئیں اور ریکٹ ایک طرف پھینک کر جلدی جلدی کہنے لگیں "آج —— آج —— اُف اللہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ اس نے —— سنو تو —— اس نے کہا" —— میں کالج کے کام میں بہت زیادہ مصروف تھی اور جانتی تھی کہ یہ عجیب عجیب باتیں عقل سے قطعی بالاتر اور بالکل فضول ہوا کرتی ہیں۔ اس وقت میں نے تمہاری داستان سننے کی ضرورت نہ سمجھی —— "مجھے پڑھنے دو بھئی —— روز ہی یہ بیوقوفیاں ہوتی رہتی ہیں تمہارے لئے"۔

"موتو والی نہیں کہتی۔ موت و زیست کا مسئلہ ہے سو تو ہی۔ اس نے کہا ___ تم بولیں۔

"___ اس نے کہا کہ تمہاری انہیں انجم رنگین کی ___" میں نے چڑ کر تمہاری بات کاٹ دی تھی۔

"اے ہے ہیں ___ اللہ مارے لو اپنی کرلیں دو گدھی کی دُم ___"

"بکواس فطنی ___ اسحاق ___ مسائے جارہے ہیں اور تم بالکل نہیں پڑھتیں۔ تمہارے دماغ میں کیا بے تکی باتیں گھُس گئیں ہیں۔ خدا را اتنی احمق ___ نہیں نصیحت کرنے چلی تھی ___ ___!

اور کیا تم مجھ سے خفا ہو گئیں ___ ہونا چاہئے تھا میں نہیں کہہ سکتی کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو کیا کرتی ___ وہ بیمار تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اگر ہو سکے اور مناسب سمجھو تو آکر مجھے دیکھ جاؤ۔ کچھ عرصے بعد وہ جانے والا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تم دہرہ دون کیوں نہیں جا رہی ہو ___ میں اب کار لوان کیوں نہیں جاتی ___ اسے رخصت کرنے تم اسٹیشن تک نہ گئیں۔ شاید نہ جا سکتی تھیں۔ تم اُمید کرتی تھیں کہ میں تمہیں مثالوں گی۔ شکر ہے اپنے آپ کو زیادہ عقلمند سمجھتی تھی۔ وہ چلا گیا یہ کوئی خاص یا اہم بات نہیں تھی۔ ڈولنسا کی ڈھلوان سے اترتے ہوئے اُس نے کہا تھا "ہم اپنے آپ کو خود ساختہ فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے رہے ___ ملن ستارے ٹکرا جائیں تو معلوم نہیں کون سا سیارہ ٹوٹے ___" اور ٹرین پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آگے نکل گئی اور پٹڑیاں چمکتی رہیں میں گھر واپس آ گئی تم بھی اسی روز دوسرے دن جا چکی تھیں۔ رات کے گہرے سناٹے میں گھڑی کی متوازن ٹک ٹک کے ساتھ وہ لحظہ بلحظہ دُور ہوتا جا رہا تھا ___ تم سے دُور ___ تم سے دُور ___

اور ۱۳ دسمبر کی رات آنے والی ہے۔ دریچے میں وہ چینی وار رکھی ہے جو اس زمانے میں ہمیشہ سفید پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ نہ معلوم ہمارے گھر کی کیا حالت ہوگی۔ سیب کی ٹہنیوں میں کلیاں کب آئیں گی۔ سوئیٹ پی کے پودے بڑے ہوں گے تو انہیں لکڑیوں کا سہارا لینے کی ضرورت پڑنے لگے گی۔ خدا کرے بہار جلد آ جائے۔ خزاں کی خشک ہوائیں اور بیت جھڑ کی ویرانیاں تم کس طرح برداشت کر سکو گی؟

دُنیا مکمل ہوتی جا رہی ہے۔ انور ختم ہو چکا ہے۔ ___ نے ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر کے اکلوتے بیٹے سے شادی رچا لی ہے دماغ کی تندرستی کی یہی علامت ہے۔ میں کیوں گذرے ہوئے دنوں کی یاد میں اپنا وقت کیوں خراب کروں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ___ (I.C.) ___ میں شامل ہو کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اسلم کے تین بچے ہو چکے ہیں اور وہ بازار میں اُن کے نئے موزے خریدتا ہوا نظر آتا ہے۔ یاد کرو۔ ہم سب اسے آپ کو آئیڈیلسٹ کہا کرتے تھے ___

کل سال نو ہے۔ آؤ اب اس افسانے کو ختم کریں۔ بقول عاؔ کہ رومان نے تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن مجبوریوں کی بھاری زنجیر نہ کھل سکی۔ چاہے اور چلے جانے کے نامعلوم راستے پر ہم نے جتنے چراغ جلائے تھے وہ کب کے بجھ چکے۔ مسرتوں کے راگ بند ہو گئے ہیں۔ اندھیرا بہت گہرا اور بہت ٹھنڈا ہو چلا ہے ___ بارہ بجنے والے ہیں آؤ نئی شمعیں روشن کر لیں ___ کیا پتہ اچھے دن اب زیادہ دُور نہ ہوں ___ ہے نا؟

قرۃ العین حیدر

جنگل

سوچنا آدمی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ بلکہ مصیبتوں کی جڑ۔ کوفت، پریشانی، اُلجھن، نیکی بدی کی ناپ تول، عمل اور مقابلہ کی تاویلیں اسی ایک سوچ سے پھوٹتی ہیں۔ دُنیا بھر کی زحمتوں کے حنظل اسی درخت میں گھونگروؤں کی طرح لگتے ہیں۔ اس شجر کا پھل کھایا اور امن چین کی جنت سے نکالے گئے۔ میں آرام و آسائش کا قائل ہوں۔ غمِ دُنیا اور فکرِ عقبیٰ کے بغیر سکون کی بھی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ مرنجان مرنج۔ نہ کبھی کسی کے پھٹے میں پاؤں ڈالوں، ورنہ دوسروں کی خدائی فوجداری کو پسند کروں۔ میری زندگی بھی کچھ اس طرح گذری کہ سکون و آرام کی عادت ہوگئی ہے۔ میں اپنے جسم، دماغ و روح کو تسکینِ مکمل کی حالت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ سوچ بچار اس مقصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سکون سوچ کی نلکیوں سے گزرتے ہی دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے۔ لہذا میں سوچنے سے سخت گھبراتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکھ چین چاہنے والے سبھی لوگ اس بلا سے دامنِ خیال کو بچا کر رکھتے ہوں گے۔

اب فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ میں سوچنے کے مرض میں خاصہ گرفتار ہوں۔ پڑوس کے ریڈیو کے شور و شر اور بانگ سے ہنگام کو آپ پسند کریں یا نہ کریں، آوازیں، چیخیں اور اعصابی دوروں کی لہریں دُنیا بھر سے سمٹ سمٹا کر چلی آئینگی اور سیدھے آپکے دماغ میں گھس کر ابتری پھیلائیں گی بالکل یہی خیالات کی 'لاسلکی' کا عالم ہے۔ لاکھ فکر کے دریچے بند کیجئے، سوچ پر پہرے بٹھائیے مگر دماغ کا ریڈیو سٹ ہر وقت جھنجھناتا ہی رہتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اسی ریڈیو سٹ کے مالک ہیں، 'سوئچ' کو بند کر دیجئے، چلو چین نصیب ہو جائیگا۔ مگر یہ سوچکر سر پھوڑ لینے کو جی چاہتا ہے کہ کھوپری کے اندر کے ریڈیو پر مالک کا کوئی قبضہ نہیں۔ اس کے "والو" ہمیشہ، ہر آن برق زدہ رہتے ہیں۔ نیند میں بھی تو نجات نہیں ملتی۔ خواب کے بہروپ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کی بجلیاں گرتی رہتی ہیں۔ جاگتے ہوئے اور کچھ نہیں تو یہی سوچتے گزرتی ہے کہ سوچ فلسفے کیسے بنیں کہ دل کو طمانیت حاصل ہو۔

میں بہت کم لوگوں سے ملتا جلتا ہوں۔ ملنے جلنے سے بھی لوگوں کے دُکھ سُکھ کا پتہ چلتا ہے، اور پھر وہی سوچ۔ ملنے ملانے اور سوچ بچار سے اتنی زیادہ نفسی قوت ہر وقت برباد ہوتی رہتی ہے کہ اس کا اندازہ کرکے سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اِن چھوٹے بڑے ذہنی و نفسی زلزلوں سے عمر کی عمارت کے گوشے منہدم ہوتے رہتے ہیں اور سکون اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کی جنت ایکانت کی زندگی میں ہے۔ اگر مجھے تہذیب و تمدّن کے جدید سامانوں کی عادت نہ ہوتی تو میں برہمنوں اور جوگیوں کی طرح کسی جنگل کے کُنج یا پہاڑ کی گپھا میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنی پسند کرتا۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ عیسائی رہبان جو صحراؤں بیابانوں میں چین کی زندگی گذار دیتے تھے!

اخبارات، رسالے اور یہ کمبخت علمی کتابیں! اِن سے پیچھا چھڑانا مشکل! مذہبی کتابوں کی بات نہیں ہے تو خدا خدا کرکے چھٹکارا ملا تھا۔ تدبّر و تفکّر کی آسمانی دعوتوں سے نجات ملی ہی تھی کہ سیاسی نعروں اور اقتصادی پکاروں نے کان کے پردے پھاڑ دئے، اور جنّت کی فکر میں ہی جنّت غارت ہوگئی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اِن واہیات شور و شر سے دامن بچایا تو پیاس کو کیا کروں کہ تفریحات میں بھی پروپیگنڈے کی ملمع تی ہوتی ہے۔ بسکٹ اور مکھن کے ٹینوں تک پر۔

"حفاظتی بچت کے سرٹیفکٹ خریدو!" کی چیخ چیاں۔ معاذ اللہ! سفر مشکل، قیام مصیبت! کھانا پینا زہر اجائے کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ دوسروں کے غم کا رس اپنے حلق سے نیچے اُتارئیے۔

خیالات کی زد اور سوچ کے بھنور کی گردش شہروں میں زیادہ بلاخیز ہوتی ہے۔ کاش کوئی شہروں سے ان لعنتوں کو سمیٹ لیتا! لپیٹ کر تہہ کرکے رکھ دیتا! نہیں۔ انہیں کفن پہناتا اور چتا بنا کر آگ لگا دیتا! تمدّن کی رحمتوں اور برکتوں میں بھی اِن کی وجہ سے کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ کسی چیز کا لُطف

باقی نہیں رہتا سیماب آسا حرکت ہوجاتا ہے۔ برف لگے ہوئے شربت گھونٹے، بانسی کے ہونٹ، فرسان ورثہ نگہ، دروغ کا پیپ اور کھن لگے ہوئے ہونٹ وس کھوہڑ اور سینچ کے راز دار ہوئے، مکروہ سینے بن جاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں دہکتی ہوئی سحر اور نرم ولطیف ن میں پیدا ہوتا ہاس کرتا سجاب! دنیا کتنی حسین ہے! یہ ارمنی حسن حباب نہیں دعوۂ فرد، ہیں! دسترس سے اندازِ عرض ورقص، خنداں دنیا! مگر سوچ کا سانپ، یہ گھناؤنا، لپلپاتا ہوا! انکا رنگ جیسے جھوٹے اگول گول بے حیا، نفرت انگیز دیدے نکالے ہوئے، سیاہ بیلا سا، پھنکتا ہوا! چور فریبی سانپ! خاموش اور پھر بھی زبان دراز! ناسور کے لجھڑ اور برچھی کی انی کی طرح روح کو کھرچنے، دماغ کو سڑانے اور دل کی حرکت روک دینے والی ظالم زبان! جنت اور سانپ کا اجتماع ——— یہی آدم کا سب سے بڑا مسئلہ، سب سے بڑی مصیبت سب سے بڑی لعنت ہے۔

میں شہر کی رہائش پسند کرتا ہوں۔ عدم اور موت کے سیاہ لامعلوم، اتھاہ، خاموش سمندروں کے درمیان حیات کے چھوٹے سے، روشن، شناسا، جو نچال جزیرے میں پیاری مطلوب، قیمتی مگر گریزاں زندگی کے نشہ، احساس، بھوکے جذبات اور ترساں خیالات کو شادکام کرنے اور تسکین پہنچانے کے لئے شہر کا رچاؤ اور سنوار، مغازِ بہار ہے۔ لیکن اس المناکی کو کیا کروں کہ بہار کی نزہتوں سے ہمزاد کی طرح لرزا دینے والی ایک تشبیہہ لپٹی ہوتی ہے۔ زندگی کی خوش آیند رنگ رلیوں کے عقب میں بے پایاں ناکامی جھانکتی رہتی ہے نغمات کی موجوں کی اوٹ میں سوچ رینگتا ہوا آتا ہے اور جام نوشیں کی رسیلی لذتوں میں خون جما دینے والا سم قاتل گھل مل کر سانس کا گلا گھونٹ ڈالتا ہے۔

کاش کوئی خدا ہوتا تو میں اُس سے رو رو کر دعائیں کرتا اُن نامراد اسرائیل کے بیٹوں کی طرح چیخ چیخ کر التجائیں کرتا جو صدیوں سے ہیکلِ سلیمان میں دیوارِ گریہ کے بے فیض سائے تلے اپنے سر پھوڑتے ہیں اور کہتا کہ اے خالق میری فطرت کے تضاد کو دور کر دے یا سوچ کے عظیم و بے درد بوجھ سے میرے زخمی و دریدہ ذہن کو نجات بخش۔

حیاتِ تمدن تجھ سے علیحدہ ہوتی جاتی تھی اور میں اُس سے۔

بے پناہ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی جدائی! جنگ و پیکار کی خبروں تک سے میں سہما ہوں۔ اُف یہ عالم! یہ قوموں کا جنگل! قانون اجنبی ایک منظم بے قانونی! مگر اس کے باوجود جنگل کے کانٹے میرے پائے حیال میں گڑے ہی رہتے تھے۔ پسپائی، زمین سوزی، اپنے سامانوں کو آپ جھلسنا، قحط اور راتب بندی، حملے اور بیماریاں، یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھے۔ سامانوں کی کمی کا گلہ اور بے بنائے سامانوں کی تباہی، خیر جو بھی ہوتا مگر میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا کہ میری جنت مجھ سے چھین لی گئی۔ مجھے شہر کی زندگی کھلنے لگی اور میں نے مجبوراً ہجرت کی۔ سکون کی تلاش میں۔ سوچ کے کچوکوں سے بچنے کے لئے۔ مگر مجھے کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑی! میں کیا چاہتا ہوں مجھے نہیں معلوم۔ سکون افزا موت یا مضطرب دھڑکتی ہوئی بنی سنوری زندگی؟ دھڑکنوں کی آواز سے سوچ جاگ ہی اُٹھتا ہے۔ سکون سوائے موت کی آغوش کے اور کہیں نہیں ملتا شاید۔ اور میں انہونی کی طلب میں، زندگی اور سکون کے اتحاد کی طلب میں گھلتا رہتا ہوں، کڑھتا رہتا ہوں اور جان سوز بے کلی کے عالم میں آرزو و یاس کی تلواریں چلتی دیکھتا رہتا ہوں، دیکھتا رہتا ہوں۔

میں شہر سے دیہات چلا، دلگیر، محزون، اُداس۔ میرے بہشت میں سانپ گھس آیا تھا۔ شہر کے گمشدہ آرام و آسائش کا تصور اُس کی گلکاریاں و دلداریاں ناکام بلا بن کر فراق کی اُداسیوں کو بے چین اور پائندہ بنا رہی تھیں۔ راہ میں بجلی کے کھمبے حسرت زدہ ٹکٹکی کے ساتھ مجھے گھورتے تھے مگر جب میں تاروں کو دیکھتا تو وہ جنجال بن کر میرے کو کسنے لگتے۔ پھول، سینٹ، کریم اور لوشن کی خوشبوئیں کراہ کراہ کر دم توڑتی جاتی تھیں اور اب کڑوا تیل اور گراسن تیل کی فکر دماغوں میں بسی ہوئی تھی۔ ہوٹلوں کی نازاں چشماؤں کی یاد کے ساتھ گیہوں کے نایاب دانوں کے بندلب کسی بیدرد و گریزاں دوشیزہ کی طرح خاموش طنز کرتے ہوئے قطار اندر قطار گزرتے جاتے تھے اور میں انہیں قطاروں کے درمیان اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ نغماتِ موسیقی کے تار جنگی نمائش کے ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ اور پھٹنے والے بموں کی سمع خراش دھماکوں سے جھنجھنا کر ٹوٹے جاتے تھے میں اسٹیشن پہنچا اور ٹرین

میں سوار ہوگیا۔ ڈبے میں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ میں اس ہجوم میں بالکل بیگانہ تھا۔ بہت سے خیالات میرے دماغ میں گڈمڈ کر رہے تھے۔ مگر اس بھیڑ بھڑکّے میں جنگی نمائش کا شور سب خیالات کو کچل کچل کر پیش منظر میں چلا آتا تھا۔ میں سوچ رہا، سوچتا ہی رہا کہ آدمی ابھی تک اپنے دانتوں اور ناخنوں کی نمائش کرتا ہے۔ ہاتھی کے دانت، گینڈے کے تھنے اور سنگین شیر کے پنجے۔ اور ان جنگلی جانوروں کی چنگھاڑیں، چیخم چاخ، دھوم، اگرچہ سب تاریک نہاں خانوں سے نکل نکل کر چلے آتے تھے۔ اندھیرے اور دھندلکے کے حاشیہ پر ایک نمائش برپا کرنے۔

شہر کب کا پیچھے چھوٹا۔ دماغ کے اندر کئی بم ازادہ کی دھماکے ہوتے۔ شہر مسمار ہوگیا۔ گرتی ہوئی دیواریں، اڑتی ہوئی جنتیں اور انسانوں کا غم انگیز سکوت میں ڈوب جانے والا ہجوم یہ سب مٹ کر اور زیادہ پائندہ ہوگئے۔ یاد کبھی سامنے کی حقیقتوں سے بڑھکر موجود، گراں، گویا اور اثر خیز ہوتی ہے۔ ذہن میں ماتمی نغموں کی ہچکی لیتی ہوئی سرسراہٹ سی ابھر گئی۔ بہت دور جب دوسرے جنکشن میں گاڑی جھٹکے کے ساتھ رکی تو ہچکیاں، سرسراہٹیں اور یادیں سب دماغ سے لڑھک کر باہر چلے گئے۔ میں خالی الذہن سا ہوگیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے بیکراں آزادی اور سبکساری کا امن پرور احساس ہوا۔ جھٹکے بھی بعض دفعہ روح کے بار کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ اسی احساس کی لامحدودیت کچھ کم ہوئی تو بھی میں بچپنے کی فراغت سی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر ایسی ساعتیں ابدی ہوسکتیں تو پھر کیا ہوتا!

میں پلیٹ فارم پر اترا۔ ہوٹل کے بیرے کو آواز دی اور غذا کے یقینی حصول کی طمانیت کا لبِ پردہ احساس ٹٹ سیٹیاں بجانے اور گنگنانے لگا۔ بڑے میں صاف خوان پوش سے ڈھکی ہوئی چپاتیاں، شامی کباب اور قورمے کی پلیٹیں لائی گئیں۔ پلیٹ فارم کے مخالف جانب دریچے سے لگ کر میں کھانا کھانے میں مشغول ہوگیا۔ مگر چند منٹ ہی گذرے تھے کہ دریچے کے نیچے ریلوے لائن کی سطروں کے درمیان کچھ الفاظ گونجے۔ یہ گونج شور میں تبدیل ہوگئی جیسے کتّے کے پلّے لڑ رہے ہوں۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ نیچے ایک دو

بھیک کے ہوئے پتلون کے گرد ایک بچہ اور چند لڑکے تھمن جھٹ اور چیخ چیخ کر رہے تھے۔ پتلون پر غذا کے کچھ اثرات باقی تھے۔ بس کسی رمزِ حیات کے نیفہ کے لئے اٹھا پٹک ہو رہی تھی، ہاتھا پائی اور گالی گلوچ۔ ایک درجن لڑکے ہونگے جو مختلف دریچوں کے نیچے بھیک مانگ رہے تھے اور بھوکے گرگ بچوں کی طرح جھوٹے ٹکڑوں پر ٹوٹے پڑنے تھے۔ اب وہ میرے ڈبے کے پاس آکر اٹھے ہوئے تھے، شور کناں تھے۔ لنگوٹی چپکائے ہوئے ننگے نحیف و زار لڑکے۔ حریص ندیدی آنکھیں، بے حیا، بے غیرت، ڈھیٹ! میرے دل میں نفرت پیدا ہوئی۔ جیسے دودھ کھانے کھاتے اس میں سے کالی سی مکھی نظر آجائے اپنا ایک سر اندر ڈالنے اور ایک باہر نکالے ہوئے، ٹانگ کراہیت خیز انداز میں ہلاتے اور گول مرچ جیسی ابھری ہوئی آنکھیں نکالے ہوئے۔ دریچے کے نیچے وہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، کلبلا رہی تھیں اور میں گھن سے آنتوں میں اینٹھن اور معدے میں ابال محسوس کر رہا تھا۔ ان بھیڑیوں نے اپنی نظر سے مجھے کھانا شروع کیا۔ میں نے گھبراہٹ، نفرت اور خوف سے آدھا پیٹ ہی کھا کر باقی چپاتیاں اور قورمہ نیچے غصہ سے پھینک دیا۔ ایک جھپٹ ہوئی۔ کالے کالے چیونٹے گتھ گئے اور اپنے ٹانگر مانگر بے صبری کے ساتھ ہلانے رہے۔ جیسے مقناطیس سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ذرّے چپک کر کئی ان قماش بنائیں۔ سوائے ایک چھوکرے کے سبھوں کو اس لوٹ کھسوٹ میں کچھ ٹکڑے مل ہی گئے۔ اور ایک پانچ سالہ بچہ دور ہی دور سے اس گھمی کے گرد منڈلا رہا تھا۔ محروم جھوکرا پیلا پیلا مگر درسا تھا۔ وہ دانت کٹکٹاتا ہوا سبھوں کو تک رہا تھا اور دوسرے لونڈے اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ تلملا اٹھا اور بڑھ کر اس نے ننھے سے بچے کو بلاوجہ ایک طمانچہ مار دیا۔ بچہ لوکھلا کر اپنے گال ملنے لگا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں منجمد آنسوؤں کے نشتر جھلک رہے تھے اور گھٹتے ہوتے درد کا دھواں مستقل بھوت کی طرح منڈلا رہا تھا۔ بے کسی اسے اپنی گود میں لئے ہوتے تھی۔

میرے دماغ کی لاسلکی کا سر دنیا کے تاروں سے مل گیا۔ میں تلاشِ سکون میں شہر چھوڑ کر دیہات جا رہا تھا مگر یہ

کاٹو کے جھونٹے اور چوٹ کھاتے ہوئے تھے۔ ایک اسٹیشن بعد میرا دیہات آنے والا تھا۔ دیہات کی مصیبت زدہ زندگی تھی۔ خیر دیکھا جائے گا۔

خیالات میرے دماغ میں بہراتے تھے ۔ اسی طرح ٹوٹ رہے تھے کہ ایک صاحب ڈبے میں وارد ہوئے۔ آپ نے لنن کلاتھ کی ٹرنک، اور آدھے درجن بوتیں، ٹوکری، ہمگیر سے ڈھولڈال بستر، ملوٹے بیٹے، چپراسی اور نوکر تو سب ہی ساتھ تھے۔ ایک نہایت ہی بانچ ٹفن کیریئر، ایک کھجینٹی ہار، بہت سے فائل، ایک درجن تلی، خربوزوں کی ٹوکری، وسط میں صد دانہ اور ہر قسم کا ایک بالیدہ سبز تربوز، بہت سے جھلے جھلے اور پس منظر میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے والے کئی تماشبیں۔ یہ ریوڑ اپنے اندر اتنی ٹھوس مادیت رکھتا تھا کہ میرے تخیلات و تفکرات نے بھی ان کا سہارا لیا جیسے فضا کے خاکی ذرات سے گرم و پریشان آبخرے ٹیک لے کر بارش کے ٹھنڈے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے تپاں دماغ کو سکون ہوا اس سرکس کی کمپنی کا رنگ ماسٹر بہت دبلا پتلا شخص تھا۔ سونے کی نفیس عینک لگائے اور تسر کا خوش تراش سوٹ پہنے گال پچکے ہوئے اور آواز میں افسرانہ پندار۔ آپ اسٹیشن سے ملحق علاقے کے سب سے بڑے آڑھتوں کے کنٹرول شاپ اور دوسری بیوپار کے لائسنسوں کے اجرا کی تحقیقات میں ہفتوں سے وہاں ڈاک بنگلہ میں جہاں متی کا کھمبہ جوڑے فروکش تھے۔ چور بازار کے متعلق رپورٹوں پر بھی آپ کو فیصلہ صادر کرنا تھا۔ چاول پیدا کرنے والے اس زرخیز علاقہ میں یک بہ یک غلہ الوپ ہو گیا اور خلقت بھوکوں مر رہی تھی۔ ڈبہ میں داخل ہوتے ہی اس متعنی متکبر ملا کے باتونی افسر نے اہل ڈبہ سے باتیں شروع کر دیں اور خواہ مخواہ اپنے وجود اور اس کے متعلقات سے سارے لوگوں کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھا اور اس اہمیت کے ساتھ کہ آپ حیات کے محور ہیں، جنتا کے ان داتا اور آپ کا عرفان کمزور و محتاج دنیا والوں کی تنہا راہِ نجات ہے۔ آپ ڈبے میں سرگرم سخن تھے اور ڈبے کے دروازے کے قریب پلیٹ فارم پر مارواڑی اور بنیئے فربہ اندام پیش کار سے کانا پھوسی میں منہمک تھے۔ چپراسی بھی ادھر ادھر کھُسر پھُسر کرنے میں مشغول تھا۔ پہلے تو مجھے لطف آیا تھا مگر تابڑ توڑ باتوں سے میں اُکتا گیا۔ باتوں سے زیادہ اُس بے پناہ "ہم" سے چوچھیل کر بارعانہ انداز میں اور دوسرے لوگوں کے وجود کو سکڑنے پر مجبور کر رہا تھا میری ہستی بھی چپک کر تنگی محسوس کرنے لگی۔ "ہم" بڑھتا گیا، ھولتا گیا، بے پروا اور "صرف ہم اور کچھ بھی نہیں" ہو کر دل دوز و جانگسل بن گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں فضا کی وسعتوں میں پناہ ڈھونڈنے دریچے سے باہر ریلوے یارڈ اور کھیتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ غیر کے "ہم" نے میرے "ہم" کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

میں نے ریلوے یارڈ کے بعید ترین حصے میں ایک ٹھہری ہوئی مال گاڑی کے نیچے چند تاریک سایوں کو رینگتا دیکھا یہ سائے باہر نکل آئے اور ابھر کر کالے کالے دیہاتی چھوکروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ یہ تیندوے کی طرح چوکنا، آہستہ خرام، سمٹے سمٹے، جھکے جھکے ایک مال ڈبے کے سامنے آئے ایک نے کسی نوکدار لانبی سی چیز کو ڈبے کے دروازے کے نچلے جوف میں ہلایا، پھر ایک ہرنچ سی دی۔ سفید دھار سی پھوٹی۔ چھوکروں نے اپنے اپنے پھٹے میلے کپڑے سامنے پھیلا دیئے اور دھار کے رُکتے ہی یہ لے وہ جا۔ مال گاڑی کے نیچے سے نکل کر یارڈ کے باہر کھیتوں میں تیز بھاگے۔ میرے ڈبے کے دوسرے مسافر بھی اس طرف دیکھنے لگے۔ سامعین کی توجہ کا ہٹنا افسر کی "ہم" کے لئے تکلیف دہ تھا مگر وہ بھی باہر دیکھنے لگا اور پھر زور کا قہقہہ لگایا۔

"ارے یہ اُچکے چور لومڑ چھوکرے گاؤں کے کنگال ہیں۔ مال ڈبوں میں لدی آٹے کی بوریوں میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ آٹا جھر جھر گرنے لگتا ہے اور یہ بدمعاش اسے لے بھاگتے ہیں۔ میں نے یہ تماشے بہت دیکھے ہیں۔ دو دن ہیں۔ مزہ اس وقت آتا ہے جب چوکیدار انہیں پکڑ پاتے ہیں۔ پھر تو یہ لونڈے ایسا ٹھکتے ہیں کہ بس۔ وہ کھال ادھڑتی ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ مگر یہ سور باز کب آتے ہیں۔ کتنا نقصان ہوتا ہے اس سے ذرا سوچئے تو۔ اگر پتہ نہ چلا تو پھٹی ہوئی بوریوں سے آٹا راستہ بھر گرتا جاتا ہے۔"

گاڑی کھل گئی۔ آٹے کی دھار اور چھپے ہوئے دامن میرے تصور میں ناچتے اور افسر کے قہقہے دماغ کو جھٹکے دیتے رہے۔ میں بہت جلد اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ہر کیف

دو گھنٹے بعد میں وہاں پہونچ ہی گیا —— ساحلِ سکون!

زندگی کی سانس دیہات میں دھیمی تھی' اس کا انگ بے رس، اس کا روپ کم رنگ اور اس کے ڈھنگ میں رچاؤ اور سنوار نایاب۔ یوں پھیکے اور چال اکھڑی۔ مگر اس خاموش ٹھہراؤ نے سوچ بچار کو بھی سکتہ میں ڈال دیا۔ وہاں فکر کے شعلے بھی بجھ گئے جیسے مریض عضو کے گرد برف لپیٹ کر جسم کے کیسوں کے ساتھ جراثیم کو بھی نڈھال کر کے فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح حیات کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ حیات کا سوچ فکر بھی گاؤں میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ سوچ کی مہم حرارت سے بچنے کے لئے مجھے کڑے دام ادا کرنے پڑتے تھے

پر تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ گاؤں زندگی کا مقبرہ نہیں۔ وہاں بھی زندگی کی نبض چلتی ہے، دل دھڑکتا ہے آہستہ مگر یقینی۔ گاؤں جون کی کوکھ ہے ہستی کا عظیم رحم۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ سوچ کا سانپ کہیں حیات کے اس گہوارے میں نہ آ جائے! مگر میرا خیال خیال ہی رہا۔ دماغ کے زخم' وہ فکر کی کھرچیں بھرنے لگی تھیں۔

ایک دن مبہم سا خوف دھوئیں کی ریکھا کی طرح رینگتا ہوا میرے ذہن کے صاف آسمان کو میلا کر گیا۔ گھر میں لپائی کا کام کرنے مسترھنیوں کو بلوا دیا گیا۔ وہ نہ آئیں۔ میرے والد صاحب کے کارندے مسٹھروں پہ بہت برسے اور ایک کی پٹائی بھی ہوئی۔ دوسرے دن صرف ایک مسترھنی آئی۔ وہ اکیلی بھلا کیا خاک لپائی کرتی۔ مسٹھر پھر پکڑ بلوائے گئے۔ مار باندھ شروع ہوئی تو ایک بوڑھے مسٹھر نے کہا کہ گھر میں صرف ایک پھٹی پرانی ساڑھی ہے' اسے ہی باری باری پہن کر مسترھنیاں گاؤں کو آتی ہیں۔ اپنی جھونپڑیوں کے اندر مسٹھر ٹولی میں سب ننگی رہتی ہیں۔ اپنے کام سے نکلتی ہیں تو اُٹنگ سی پتلی باندھ کر نکلتی ہیں۔

سوئے ہوئے سوچ کے ہیولے کھلنے لگے۔ میں نے پھر اسے تھپک تھپک کر سلانا چاہا۔ میں نے خوب سیریں شروع کیں۔ ورزش بھی کرنے لگا اور بندوق لے کر میلوں میل شکار کے لئے جنگل کی طرف نکل جاتا۔ شام شام کو تھکا ماندہ آتا اور بے ہوش ہو کر سو رہتا۔ میں خوش تھا کہ زندگی چین سے گذر رہی ہے مارے کبھی تو آرام ملا۔

ایک سہ پہر کو میں ہریل کے شکار کے لئے سرگرداں پھر رہا تھا۔ جیٹھ کے دن تھے۔ ربیع کی فصلیں کٹ چکی تھیں۔ کھیت سنسان تھے۔ دھرتی بچے جن کر ہانپ رہی تھی پیپل اور برگد کے ساور درختوں میں نئے نئے ہریالے پتے کھڑکیاں سجا سجا کر تھکی ہوئی پیاسی نگاہوں کو اپنی طرف بلا رہے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں نہال ہو رہی تھیں۔ میں ایک پیپل کے پیڑ تلے دم لینے کے لئے رُکا۔ پیڑوں پر پنکھیرو خوب چہل پہل کر رہے تھے۔ کھوری مینائیں، سبز طوطے، کالے کوّے۔ کھیتوں میں اب دانہ دُنکا تک نہ رہا تھا۔ یہ پرندے برگد اور پیپل کے پکھوں پر گذارہ کر رہے تھے۔ ہرے ہرے ہریل بھی دُبکے دبکائے پکے کُتر کُتر کر کھا رہے تھے۔ میں تھکا ہوا تھا۔ آنکھ لگ گئی۔ اچانک شور وغل سُن کر میری نیند اُچاٹ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ننگ دھڑنگ بچوں، لڑکوں اور فرسودہ حال گندی عورتوں کا ٹھٹ درختوں کے نیچے لگا ہوا ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ یہ لوگ ڈھیلے مار مار کر درختوں سے پکے گراتے اور انہیں جھپٹ جھپٹ کر کھاتے جاتے تھے۔ اِن نزار و زبوں آدمیوں کے کئی گلّے اس چراگاہ کی طرف آ نکلے تھے۔ انکے بھوکے' دھنسے ہوئے پیٹ، گرسنہ نظریں، ترسے ہوئے مُنہ نارسا ہاتھ عجیب بہیمانہ انداز میں پکھوں کی طرف متوجہ تھے۔ آپس میں خوب قیل قال اور گالی گلوچ ہو رہی، پرندے اُڑ اُڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف جاتے مگر ہر پیڑ کے گرد انسانوں کا ٹڈی دَل آ دھمکا تھا۔ پنکھیرو کہاں جائیں۔ خوب خوب چیں چاں ہو رہی تھی۔ آدمیوں اور پرندوں کی جنگ! سینکڑوں آدمی اور ہزاروں پرندے تھے۔ غذا کے لئے یودھ برپا تھا۔ میں ششدر ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ تنگ آ کر پرندوں نے بہت شور مچایا۔ مینائیں تھرتھرا کر شاخوں اور پتوں میں اُلجھ اُلجھ کر ڈانواڈول ہوتی رہیں۔ طوطوں نے سُرخ سُرخ انگاروں جیسے دیدے نکالے اپنے آنکس نما چونچ کھول کر حملے کے لئے جھکے اور آدمیوں کے اُوپر منڈلا کر

رہ گئے۔ مگر شوخ کالے کوّوں نے جلتے کے کنارے کے حملہ آوروں کے سروں پر ٹھونگیں مارنی شروع کیں۔

کال منہ پھوئے کھڑا تھا۔ پورب دیس کو روندتا سسکتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اب وہ یہاں آ پہنچا تھا۔ یہ فاقہ زدہ مرد اور مزدور جیٹھ کے ہولے زمانے میں مزدوری کا کوئی کام ملتا تھا اور نہ قرض۔ غلہ سیاہ یہاں خانوں میں روپوش تھا۔ بازاروں میں صرف ۱۰ بجے تک بھی غلہ نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اوجھ رنج کے کارن جسم کے کولہو میں درد اٹھا۔ دھوکے کے پاؤں پڑے اور زندگی تلملا اٹھی۔ بھیانک خواب کی طرح حقیقت میں آدمی اور پرندے کی جنگ جاری تھی۔ میرے دماغ میں خیال کا ناوک پیوستہ ہوا۔ الٰہی پناہ! ذہن کی کالی گہرائیوں سے ایک دھندلا سا ابھرا ــــ میں بڑبڑا اٹھا ــــ جنگل! جنگل! ــــ اور میں سوچنے لگا اس جنگل سے نکلنے کا راستہ؟

اختر اورینوی!

یاد رکھیے

(۱) ساقی میں شائع ہونے کے لئے جو مسودات بھیجے جاتے ہیں انہیں حتی الوسع محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اہم ان کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ ساقی نہیں لے سکتا اسلئے آپ اپنے مضمون کی نقل اپنے پاس رکھ لیا کیجئے۔

(۲) جواب طلب امور اور واپسی مضامین کیلئے محصول ڈاک بھیجا کیجئے۔

(۳) ساقی کے نہ پہنچنے کی شکایت ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں کرنی چاہیئے اسکے بعد پرچہ قیمتاً بھیجنا بھی مشکل ہے اور آپ اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے۔

(۴) سالانہ چندہ چھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجا کیجئے۔ وی۔ پی طلب کرنے میں آپ کو چار آنے زیادہ دینے پڑیں گے۔

نمونہ کا پرچہ نو آنے کے ٹکٹ بھیجکر طلب کیجئے۔

منیجر ساقی۔ دہلی!

"جنوں"

اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیسا ہوا؟
آج اُنکے روبرو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ہو گیا میری زباں سے تلخ باتوں کا گذر
اور وہ سُنتے رہے۔ تکتے رہے باچشم تر
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا
میری باتوں سے اُڑا جاتا تھا اُس چہرہ کا رنگ
اعتمادِ حُسن پر چڑھتا چلا جاتا تھا رنگ
ہائے وہ معصوم نظریں۔ اور حیرانی سے دنگ
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا
کپکپانے ہونٹ عارض پر عرق کی سرخیاں
ہلکی ہلکی سُرخیاں اور ہلکی ہلکی زردیاں
شرم، غصہ، بےبسی، بیچارگی، بےتابیاں
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا
ہائے وہ باتوں میں رُک رُک کر ہچکیوں پہ ہچکیاں
عجز کے آغوش میں وہ حُسن کی دارائیاں
اور مُسلسل گوہرِ شہوار آنکھوں سے رواں
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا
رو کے یہ کہنا، نہ تھی تم سے ہمیں ایسی اُمید
ایسے لفظوں کو سمجھتے تھے محبت سے بعید
کیا یہی رہتی نگاہیں تھیں کہیں مشتاقِ دید
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا
دیکھتی آنکھوں سے اُنکو سرنگوں دیکھا کیا
جیتے جی میں اُنکا یہ حالِ زبوں دیکھا کیا
خود سے ہٹ کر اپنا ہی جوشِ جنوں دیکھا کیا
اے محبت کیا ہوا یہ اے جنوں یہ کیا ہوا

آغا سرخوش قزلباش!

رومانی افسردگی

یہاں تک میں جدید افسردگی کی صرف ایک شاخ کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ یہ صنف شاتوبریاں اور بائرن میں بھی اور اُن کے لاتعداد مقلدین میں بھی سطحی اور ظاہرداران معلوم ہوتی ہے۔ یہ افسردگی قدما میں بھی موجود تھی۔ ابیقوری غم سے کھلونے کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ اور عشرت غم سے لطف لیا کرتے تھے۔ شاتوبریاں کی مایوسی ادبی شہرت کا ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ جیسٹرٹن بائرن کی اداسی میں جوانی اور اعلیٰ خوشی کی معرکہ آرائی دیکھتا ہے[۱]۔ لیکن شاتوبریاں اور بائرن کے یہاں بات یہیں تک ختم نہیں ہوجاتی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ رومانی افسردگی میں کیا چیز مخصوص اور مابہ الامتیاز ہے، ہمیں اس بنیادی فرق کو اور زیادہ واضح کرنا پڑے گا جو کلاسیکوں اور روسو کے متبعین میں ہے۔ روسو پر ایمان رکھنے والے جدید نسل کی طرح اپنے انفرادی اور ذاتی وجود میں قدما کی نسبت زیادہ پھنسے ہوئے ہیں۔ زمانہ جدید کی افسردگی میں یہ احساس تنہائی تقریباً ہمیشہ رہا ہے صرف اس لئے نہیں کہ ایک خلاق ذہنیت اپنے انوکھے پن پر زیادہ نگاہ رکھتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ گروہی بندھن تجزیاتی تنقید کے ہاتھوں کمزور ہوچکے ہیں۔ جدید دور کے اس عارضے کی یقیناً سب سے اعلیٰ شکل وہ بیماری ہے جو ہمیں مذہبی اعتقادات کے زائل ہوجانے کے بعد لگی۔ یہی وہ بات ہے جو سینانکور اور آرنلڈ کے حزن و مایوسی کو گرے کی غمگینی سے ممتاز کرتی ہے۔ "گور غریباں" اپنی انسانی لے کی وجہ سے جدید تحریک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں نچلے طبقے سے ہمدردی پائی جاتی ہے۔ لیکن اپنی افسردگی کے اعتبار سے یہ زندگی کی اس لازمی غم انگیزی پر قدما کے غور و فکر سے آگے نہیں بڑھتی۔ جسے ہم اُداسی کے نام سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ "گورستانی اسکول" کی دوسری تخلیقات کی طرح یہ بھی ملٹن کی Il Penseroso ـــــ سے براہ راست تعلق رکھتی ہے یہاں یہ مناسب ہوگا کہ ہم گرے کے بیان کردہ امتیاز کو ملحوظ رکھیں "میری اُداسی سفید ہے۔ لیکن ایک اور بھی قسم ہے غم کی سیاہ۔ تاریک۔ جسے میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے"۔ یہ خط اُس نے سنہ ۱۷۴۲ء میں رچرڈ کو لکھا تھا۔

سچا طور پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بغیر اس کپکپاتی اُمید کو خیرباد کہے جو "گور غریباں" سے نمایاں ہے، گرے نے سیاہ افسردگی کا تجربہ نہیں کیا۔ کوئی تنہائی اُس آدمی کی تنہائی سے زیادہ خوفناک نہیں جسے پہلے مذہب پر اعتقاد رہا ہو اور پھر وہ زائل ہوگیا ہو۔ رینان نے کلیسا سے اپنی علیحدگی کو یوں بیان کیا ہے "کہا جاتا ہے کہ سیکال جھیل کی مچھلیاں ایک دفعہ نمکین پانی میں رہی تھیں لیکن انہیں تازہ پانی کی مچھلیاں بننے میں ہزاروں برس لگے۔ مگر مجھ میں یہ تبدیلی چند ہی ہفتوں میں ہوگئی۔ جادو کے حلقے کی طرح کیتھولک مذہب زندگی کا اس قوت سے احاطہ کرتا ہے کہ جب کوئی شخص اس سے محروم ہوجائے تو اُسے دُنیا کی ہر چیز بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میں کھویا گیا ہوں۔ اور دنیا مجھے سرد اور بنجر ریگستان کی طرح نظر آنے لگی۔ اُس لمحے جب عیسائیت میرے لئے صداقت نہ رہی۔ دُنیا غیر دلچسپ معلوم ہونے لگی۔ اور مضحکہ خیز۔ میری زندگی کی بنیادوں کے ڈھے جانے کا یہ سانحہ مجھ میں خلا کی سی کیفیت پیدا کرگیا۔ ایسے خلا کی جو بخار کے بعد یا غم انجام محبت کے بعد پیدا ہوجاتے"۔

مذہب پر سے ایمان اُٹھ جانے کے بعد کی تنہائی بہت سے رومان پرستوں میں ایک عجیب طریقے سے بغاوت کے جذبے سے ملی جُلی ہوتی ہے۔ اس قماش کے رومان پسند ایک ایسے خدا کے خلاف طعن و تشنیع کی بھرمار کردیتے ہیں جس کے وجود پر وہ کوئی ایمان ہی نہیں رکھتے۔ مثلاً لیکونت دَ لیل کی "قابیل" جو بائرن کے ڈرامہ "قابیل" سے ملتی جلتی ہے۔ وہ خالی آسمان کو مکّا دکھاتا ہے۔ یا الفرڈ دے وگنی کی طرح اس خلا کی طرف پُرغرور حقارت کا رویّہ اختیار

---

[۱] یہ اجتماع ضدین جیسٹرٹن سے پہلے وارڈسورتھ کے یہاں بھی ملتا ہے "جوانی میں ہم اندھیرے میدان پسند کرتے ہیں۔ جہاں اُلّوؤں کے بسیرے ہیں۔ شام کو صبح صادق سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور خزاں کو بہار سے۔ توہمات سے ہم عموماً اتنے خوش ہوتے ہیں اور ہماری خوشی اتنی حد سے بڑھ جاتی ہے کہ ان سے تھک کر ہم غمناک تصورات میں لذت لینے لگتے ہیں"۔

کرتا ہے۔ وہ خدا سے اس لعادت کو چھوڑنے پر اس لئے راضی نہیں ہوتا
کہ یہ بغاوت اُسے عامیانہ سطح پر اُتر آنے سے بچاتی ہے ایک بالکل
ایسا ہی جذبہ ان شیطانی کیتھولک لوگوں میں ملتا ہے جو مذہب سے محض
اس لئے چپٹے رہتے ہیں کہ گناہ کرنے میں زیادہ مزا آئے۔ بار سے
دور نے دے لی۔ کلیسا کے مجاہد اندر باہر کے دیوتاؤں کو ملا دینے
میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن عام طور پر روحانی پرستیں دوسروں کے
ساتھ عقائد میں شامل نہیں ہوتا۔ خواہ وہ عیسوی ہوں خواہ کلاسکی۔
جہاں تک روایتی اداروں یا عقائد کا تعلق ہے روحانیت پرست
تنہائی مرکز گریز ہوتا ہے۔ مگر ماضی کے عظیم بردہ انسانی برادری
کے ایک ہی مذہب کی بنیاد رکھنے کی اُمید رکھتے ہیں
کہ اب تک اس تحریک کا اصول ہمدردی رہا ہے۔ اگر
ہمدردی کا اصول ایسے لوگوں کو جو انفرادیت کو آخری حدود
تک لیجانا چاہتے ہیں واقعہً یکجا کر سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ
روحانیت کو محبت لطیفہ زندگی قبول نہ کر لیا جائے۔

لیکن لطیفہ اور روحانیت کا اصادم اس قدر شدید ہے کہ زیادہ نہیں
شاید نہیں۔ کوئی تحریک ایسی نہیں جو دوسروں کے وجود سے اس قدر
لبریز ہونے کے باوجود دل ہلا دینے والی تنہائی لے۔ اس کی احساس ہے
"مجھی کو دیکھو جو اس کرۂ ارض پر تنہا ہے" اس جملے سے روسو کی
آخری کتاب شروع ہوتی ہے اور آخر میں اسے اس بات پر حیرت
ہوتی ہے کہ "وہ جو دنیا میں انسانوں سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے
اُسی کو سب سے زیادہ تنہا رہنا پڑا" میں اس دنیا میں اس طرح ہوں
جیسے کسی اور سیارے سے اس اجنبی سیارے میں آپڑا ہوں۔ جب
کی ذات سے کوئی بڑی سے بڑی شے انہیں قابو میں رکھنے کے لئے موجود نہیں رہتی
تو قلب و دماغ دونوں روحانی مفہوم کے اعتبار سے، نہ صرف یہ کہ
ایک دوسرے کے خلاف سمت میں جاتے ہیں بلکہ ایسے طور پر ہر ایک
دوسرے سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف آرنلڈ نے بلکہ روحانی
افسردگی کے دوسرے مریضوں نے بھی Empedocles
کو ذہنی تنہائی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ تنہائی اور آدمی
پر غالب آجانے والی قوتِ فکر میں ڈوب کر رہ گیا تھا[1] اور اس لئے
اُسے دوسرے انسانوں سے کوئی ہمدردی باقی نہیں رہی تھی۔

کے لئے Empedocles تو اب ایک زندہ آدمی نہیں ہے
تو دنیا اس کا شعلہ ہے جو ہر چیز کو بھسم کر دیتا ہے۔
بلکہ یہ محض فکر اور دائمی طور پر بے چین دماغ۔
اس کا آتش فشاں میں کود پڑنا فطرت میں
مدغم ہو کر اپنی تنہائی سے رہائی پانے کی کوشش ہے
مذہب کی رو سے انسان کو کسی ایسی طاقت سے ہم آہنگ
ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جو فطرت اور انسان دونوں سے بالا
ہے خواہ علماء کی طرح ہم اسے خدا کہیں یا مشرقِ بعید کے بعض
فلسفیوں کی طرح محض قانون سمجھیں۔ سخت عذاب جو اس قانون کو
توڑنے سے عاید ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ آدمی اس یکجہتی سے دور ہو جاتا
ہے "محض بدمعاش آدمی ہی تنہا ہوتا ہے۔" Diderot نے
کہا۔ جملے میں جسے روسو نے اپنے اوپر طعنہ سمجھا سچائی کا یہی عنصر
ملتا ہے۔ روسو نے جواباً کہا کہ برخلاف اس کے محض اچھا آدمی تنہا
ہوتا ہے۔ اس طرح روسو کی بات صحیح ہے۔ اور جیسا کہ یونان کے
سات دانشوروں میں سے ایک کا قول ہے "زیادہ تر آدمی بُرے ہوتے
ہیں اگر کوئی ایسا نیک کام کرنا چاہے جو دشوار بھی ہو تو بہت
کم آدمی اُس کا ساتھ دیں گے۔" روسو کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ بدمعاش
آدمی کو سوسائٹی کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی بدمعاشیاں عمل میں
لا سکے لیکن ... روسو کی نگاہ نہیں پہنچی۔ تنہائی سب سے
زیادہ ایک ... ہو سکتا ہے کہ لوگوں سے بہت ملنے جلنے
کے باوجود بھی ایک آدمی خوفناک تنہائی کا شکار ہو جیسے کہ ...
... لیکن برخلاف اس کے اس قدیم
شخص کی طرح بھی ہو سکتا ہے جو کہتا تھا کہ تنہائی کے باوجود بھی وہ
کبھی تنہا نہیں رہا۔ ہاتھورن نے جو خود بھی تنہائی کا شکار تھا۔ اس
مسئلہ پر بہت کچھ سوچا ہے۔ اور خاص طور سے اس حقیقت پر کہ گناہ
کا نتیجہ ہمیشہ تنہائی ہوتا ہے۔ اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اس مسئلہ کا تعلق
نیو انگلینڈ کی مذہبی زندگی کے رجحان سے کیا ہے؟ ... نے
Puritans جذبات ہم آہنگی کا احساس رکھتے تھے اور انہیں
کسی دوسرے ساتھی کی تمنا نہ تھی۔ ایمان کے کمزور پڑنے ہی کے بعد
Puritans خدا کی رفاقت کے احساس سے محروم ہو گئے۔ لیکن

[1] تنہائی کے متعلق منوشاستر میں ایک بہت قابلِ ذکر ٹکڑا ملتا ہے "آدمی تنہا ہی پیدا ہوتا ہے اور تنہا ہی مرتا ہے۔ اُس کے رشتہ دار اُسے قبر تک لاکر چھوڑ دیتے ہیں
اسکے بعد اُسکی اکیلی اُمید صرف دھرم ہی ہے۔ دھرم کی مدد سے وہ اس تاریکی کو عبور کر لیتا ہے جسے پار کرنا نہایت مشکل ہے"
[2] مارک ٹوئین نے کہا ہے "اگر تم نیک ہو تو تنہا رہو گے۔"

انسانوں سے انکی علیحدگی برقرار رہی۔ Hawthorne مسئلۂ تنہائی کا اگر کوئی حل پیش کرتا ہے تو وہ انسانیت پرستانہ ہے۔ "اپنی ہمدردیوں میں وسعت پیدا کرو اور اس شخص کو جس نے ایسا مقصد اعلیٰ وارفع بنا قرار دیا ہے، متنبہ کرو کہ علم یا قوت کی اونچائیوں پر اُسے وہ اطمینان نہ مل سکے گا جو وادیوں میں چلنے پھرنے والوں کے ساتھ تعلقات رکھنے پر حاصل ہوتا ہے۔" فاؤسٹ جو علم کی تنہائی کی علامت ہے، از سرِ نو تعلقات پیدا کرکے اس تنہائی سے نکل بھاگنا چاہتا ہے۔ اور اب اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ قوت کی لگن بھی تنہائی پیدا کرتی ہے۔ نپولین بھی جو فوق الانسان کا نمونہ ہے فطرتاً تنہا رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ خواہ نیطشے نے ایک دن لکھا کہ "میں اپنی عمر کے تینتالیس[۳] سال گذار چکنے کے بعد بھی اس طرح تنہا ہوں جیسے کہ ایک بچہ۔" کارلائل جس کا "ہیرو" اٹھارہویں صدی کی منفرد ذہانت[۴] سے متاثر ہے اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "میری تنہائی، میرا احساسِ بےکسی، میری لاہمدردیت (اس سے بہت کچھ مراد ہے) کون سی زبان ہے جو اس کا اظہار کر سکے؟ تنہا! تنہا!!"

جیسا کہ روسو کا مقلّد اس لفظ کا مفہوم لیتا ہے، یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی محبت کے ذریعہ اس تنہائی سے بچ نکلے جو علم یا قوت کی لگن سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک محبت ہی لامحدود ہے خواہ اس محبت سے مراد نفسانی جذبہ ہو یا وسیع پیمانے پر انسانیت سے اسکی ہمدردی۔ ابھی ژد ریبساں کے ساتھ اس کا معاشقہ ختم ہی ہوا تھا کہ "وہ چیخ اٹھا۔ "یہ انسان جسم نہیں بلکہ تنہائیاں ہیں!" ورڈسورتھ تو نچلے طبقے کے لئے ایک ایسی ہمدردی رکھتا تھا، جس کی اجازت نئی کلاسیکیت نہیں دیتی تھی۔ یہ مشہور بات ہے کہ نچلے طبقے کے لوگوں نے اس ہمدردی کا پوری طرح جواب نہیں دیا۔ اس کے علاقہ کے ایک سرائے والے نے کینن رانزلے سے کہا۔ "وہ کچھ الیلا اکیلا سا آدمی ہے یہ سب شاعری کا کرم ہے۔" اگر ورڈسورتھ اس کے بارے میں اس قدر دردناک انداز سے لکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اُسے بھگت چکا تھا[۵]۔ انسانیت پرست رسکن بھی اتنا ہی تنہا تھا جتنا انسانیت پرستی کو گالیاں دینے والا کارلائل۔

میں بتا چکا ہوں کہ گناہ کا نتیجہ تنہائی ہوتا ہے لیکن بیشتر رومانیوں کے باب میں لفظ گناہ مشکل ہی سے صحیح لفظ ثابت ہوگا۔ اس تنہائی میں جس کی ان میں سے اکثر شکایت کیا کرتے ہیں، روحانی جمود کا کافی حصّہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہیں کہہ چکا ہوں۔ روحانی انفعال کے معنی ہیں اپنے مزاج پر سے پابندیاں ہٹا لینا، اور کسی ایسے مرکز یا اصول کا لحاظ نہ رکھنا جو انسان چاہتا پر قابو پا سکے اور آدمی کی اپنی ہستی سے بالاتر ہو۔ علم یا احساسات یا قوت کی ہوس کرنا۔ ایسا شخص جو اپنے مزاج کو آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے، اور خالص مادّی سطح کے علاوہ کسی اور سطح پر اپنے تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے، وہ ایسی چیزوں کی خواہش کرتا ہے جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں کیونکہ مزاج ہی وہ شے ہے جو انسانوں کو جُدا کرتی ہے۔ لامحدود ہونے کا احساس رجعت پسند کارلائل بہت کچھ مراد ہے، اور تنہائی وہ تقریریں جو انفرادیت پرست کو کھلتی بڑتی ہیں۔ اگر ہم دوسرے انسانوں سے کسی اونچی سطح پر ملنا چاہتے ہیں تو ہمیں مزاج کو پوری طرح آزاد چھوڑ دینے کی بجائے کوئی اور تدبیر عمل میں لانی پڑے گی۔ اور ہمیں مذہبی یا انسانیت پرستانہ اصطلاح کے بموجب اپنے عقائد تبدیل کرنا پڑیں گے۔ ارسطو نے کہا ہے کہ ایک آدمی اپنی مڑی ہوئی چھڑی کو کھینچ کر سیدھا کر سکتا ہے۔ ہمیں بھی اسی طرح اپنے مزاج کو اس شخص کی طرح مبدّل کر لینا چاہیئے جس کی ہم نقل کر رہے ہیں۔ عام طور پر مزاج پر پابندی قائم کرنے والی چیز اخلاقی نظام اور کسی ملک یا زمانے کی روایات ہیں۔ میں اوپر کہیں یہ دکھانے کی کوشش کر چکا ہوں کہ انفرادیت پسند انسان روایات سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے، اور اپنے مزاج

---

[۵] جو ہر فرد بشر کی تنہائی کا احساس بلیک میں بھی پایا جاتا ہے" خدا نے مجھے مختلف چہرہ کیوں دیا ہیں دوسرے انسانوں کی طرح کیوں نہ ہوا جب میں کسی کو دیکھتا ہوں تو وہ چونک پڑتا ہے جب میں بولتا ہوں تو دوسروں کو ناگوار ہوتا ہے پھر میں خاموش اور مجہول ہو جاتا ہوں۔ اور میرا کوئی دوست نہیں رہتا۔" [۵] انگریزی میں تنہائی کے متعلق ورڈسورتھ کی ان لائنوں سے بہتر شعر نہیں مل سکتے۔ اُس نے بیان کیا ہے کہ اس کے کمرے میں سے نیوٹن کا مجسمہ نظر آتا تھا جس کا چہرہ خاموش تھا۔ یہ مجسمہ ایک ایسے دماغ کی علامت تھا جو خیالات کے عجیب و غریب سمندر میں اکیلے سفر کر رہا ہو۔" اسی طرح ملٹن کے متعلق سانیٹ میں لکھتا ہے "اُس کی روح ایک ستارے کی طرح تھی۔ اور الگ تھلگ۔"

کے لئے کوئی ضابطہ اور اصول بھی بنا نہیں جا سکتا۔ ایسے لوگوں کی منطق یہ ہے کہ کسی مربوط نظم کو ماننا اور کسی مرکز کو تسلیم کرنا اپنی انفرادیت کو کھو دینا ہے لیکن کیا مزاج پرستی بالآخر انسان کی ذات کے لئے اتنی خطرناک نہیں؟ اس کا جواب شخصیت کی تعریف پر منحصر ہے چونکہ انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اگر ایک آدمی تنہائی سے بچ نکلنا چاہتا ہے تو اُسے اپنی عام شخصیت سے بلند تر کسی مقصد کو اختیار کرنا پڑیگا اور یہی اُس کی منفرد شخصیت ہوگی لیکن چونکہ اُس کا مقصد اُس کی عام شخصیت سے بالا ہے اس لئے یہ لازم نہیں کہ یہ مقصد اس کی پوری شخصیت سے بھی بالا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ حدود جو وہ اپنی عام شخصیت پر عائد کرتا ہے، اُس کی اخلاقی شخصیت کو حاصل کرنے کے لئے لازمی ہوں۔ اور اخلاقی شخصیت ایک ایسی شخصیت ہے جو اُس کے اور دیگر آدمیوں کے درمیان مشترک ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے اپنا عاشق صادق ہونا چاہیئے۔ اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی کہ اسکا مطلب اخلاقی شخصیت سے ہے۔ ابسن پر ایک جدید کتاب کا مصنف کہتا ہے کہ ابسن کے پیغام کا خلاصہ یہ لائن ہے۔

"سب سے بڑھ کر یہ کہ ـــــ تو اپنی خودی کے ساتھ وفادار رہے"

یہ بہت ہی صاف سی بات ہے کہ پولونیس ابسن کا مبلغ نہیں ہے بلکہ ایک انحطاط پذیر ارسطاطالیسی ہے۔ وہ شخصیت جو ارسطاطالیس کا منتہا ہے اُس ذات سے قطعاً مختلف ہے جس کے اظہار کے لئے ابسن اور دوسرے منفرد ذہین لوگ بیتاب ہیں۔ اپنے مزاج پر اپنی انسانی شخصیت کی پابندیاں عائد کرنا ارسطو کے خیال میں عمل کے مترادف ہے۔ ارسطو مسرت کو مجہول کیفیت نہیں بلکہ عمل تصور کرتا ہے۔

برخلاف اس کے انسانی نقطۂ نظر سے ہر قسم کے مزاج پرست مجہول ہیں۔ وہ مسرت جس کی انہیں تمنا ہے انفعالی مسرت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص نپولین کی سی توانائی سے قوت کا تعاقب کرے اور پھر بھی اخلاقی طور پر مجہول رہے۔ وہ سب علوم گھول کر پی جائے اور پھر بھی اخلاقاً مجہول رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شلر کی طرح وہ اپنی ہمدردیوں کا دائرہ اتنا وسیع کر دے کہ "ساری دنیا کا بوسہ" لینے پر تیار ہو لیکن اخلاقی اعتبار سے مجہول ہی رہے۔ اخلاقی مجہولیت تبھی ختم ہوتی ہے جب ارسطو کے خیال کے مطابق آدمی عمل شروع کردے۔ یعنی جب وہ خواہشات اور مزاج پر قابو پانا شروع کردے۔ یہ قابو جتنا بڑھے گا اتنا ہی اخلاقی اعتبار سے آدمی بہتر ہوگا۔ روسو کو روح کے دو پہلوؤں سے انکار تھا۔ اس لئے اُس کے نزدیک اس اندرونی عمل کا بھی وجود نہیں ہے اور اس لئے داخلیت موضوعیت کی ہم معنی ٹھہری۔ لیکن داخلی ہونا روسو کے فلسفے کی رو سے انتشار پسند ہونا ہے۔ بے مقصد و بے مرکز ہونا۔ خواب کو خیال کے ناپید کنار سمندر میں چھوڑ دینا۔

افادی اس جگہ مداخلت کرتا ہے۔ اور رومان پرست سے کہتا ہے کہ جب وہ داخلی اعتبار سے کام نہیں کرتا تو خارجی طور پر ہی کچھ کرے۔ اخلاقی صلاحیت کی مسرت کھو دینے کے بعد اس طرح وہ مادی صلاحیت کی مسرت ہی حاصل کرے۔ اور دنیا کی خدمت کرے۔ یہ ہے مسئلہ مسرت کا وہ حل جو گیٹے فاؤسٹ کے دوسرے حصے کے اختتام پر پیش کرتا ہے۔ اور ہم بغیر کسی جھجک کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حل جعلی ہے۔ افادی اعتبار سے خارجی طور پر عمل کرنا، بغیر اُس داخلی عمل کے جو اخلاقی مزاجیت سے بچانے کا واحد ذریعہ ہے قوت کی ہوس کو جو سب سے بڑی ہوس ہے دبا نہیں سکتا ہے۔ گیٹے کے نزدیک فاؤسٹ کے افادی عمل کی تکمیل یہ ہوگی کہ اُسے خدمت خلق میں لطف آئے۔ اور بغیر کسی امتیاز کے ہر ایک سے ہمدردی کرے لیکن صرف اس چیز سے قوت کی ہوس نہیں مٹ سکتی۔ ورنہ ہمیں روسو کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ ہمیشہ وسیع ہونے والی خواہشات کو ایک دوسرے کے خلاف رکھ کر قابو میں لایا جا سکتا ہے۔

اس طرح ایک خوفناک خطرہ تمام جدید ذہنی رجحان میں چھپا ہوا ملتا ہے۔ یہ رجحان صرف ایک خوفناک میکانی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور ایسے آدمیوں کو مادی اعتبار سے قریب تر لا رہا ہے، جو اخلاقی اعتبار سے مرکز گریز ہیں۔ انسانیت نواز اور دیگر ان تمام تحریکات کے ناکامیاب ہونے کا سبب جو پچھلی صدی میں وجود میں آئیں، یہ ہے کہ یہ رومانی تحریکوں کی طرح وسعت پسندی کو روکنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ "تبدیلی عقائد" سرزد ہونے نہیں دیتیں۔ اور پس یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں اگر اس دور کی افسردگی کا امتیازی نشان احساس خلا، لامحدودیت اور تنہائی ہوں۔ رینٹ اپنی "اخلاقی تنہائی" کی شکایت کرتا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اُس کی تنہائی اخلاقی نہیں ہے بلکہ اپنی انسانی شخصیت کو برقی دینے سے اور اسی سلسلے میں استہلاک کو کوشش کرتے رہنے سے تنہائی کے مرض سے نجات مل سکتی ہے اور کسی حد تک مسرّت کا حصول ممکن ہے لیکن وہ مسرّت جس کا خواب بھی دیکھتا ہے غیر اخلاقی ہے ـــــ ذاتی ہے۔ اور خود غرضانہ رہنے سے بادلیر تک اور اُس کے بعد کے انحطاط پرستوں کا سلسلہ قائم کرنے سے زیادہ آسان کوئی کام نہیں ہے۔ مثلاً او۔ ای ماں۔ کے ناول "آر بورز" کا ہیرو دے۔ اسے سینٹ جو اس تحریک کے آخری زمانے کی مبالغہ آرائیوں کا نمونہ ہے۔ دے۔ اسے سینٹ مکمل طور پر دوسرے انسانوں سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور اپنے اختراع کی ہوئی مصنوعی جنّت میں عجیب اور شدید احساسات کی تلاش میں مشغول ہو جاتا ہے۔ لیکن خود پرستی کی آمیزش کی وجہ سے مسرّت کا خواب ڈراؤنا بن جاتا ہے۔ اور اس کے رہنے کا محل ایک دوزخ بن جاتا ہے Maison de torture یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دے۔ اسے سینٹ محض در ٹرپا رینے ہی ہے مگر اسے جدید شکل میں پیش کیا گیا ہے ـــــ شکستہ اور ٹوٹا ہوا اور جس کے اعصاب کمزور ہیں اور معدہ ناکارہ۔ اور اسی سال سے اور بد سے بدتر ہوتا چلا گیا ہے۔"

عیسائی روحانیت ابتدا ہی سے دیوانے پن کی طرف جھک رہی تھی کیونکہ اخلاقی کوشش کا بدل محض جذبات اور مزاج کے دھارے پرستی سے بہتے رہنے کو قرار دیا میں بتا چکا ہوں کہ اس اخلاقی مجہولیت کو بدھ مت نے تمام برائیوں کی جڑ بتایا ہے اپنے عروج کے زمانے میں عیسائیت نے بھی اس مسئلہ پر توجہ دی تھی۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ جہاں میں نے کلاسکی اور رومانی افسردگی کے متعلق کہا وہاں زمانہ وسطیٰ کی افسردگی پر بھی کچھ لکھوں۔ سانتو بریاں نے اپنی کتاب "عیسائیت کی روح" کے ایک مشہور باب میں اپنے زمانے کی اس بیماری کا ماخذ عیسائیت اور زمانہ وسطیٰ کو قرار دیا ہے اس بہانے اُس نے اس کتاب میں جو عیسائیت کا معتقد رہتے رہنے کو داخل کر دیا۔ اور اس طرح گویا سینٹ بیود کے مقدس روٹی میں اُس نے زہر ملا کر دیا ہے۔ سانتو بریاں کہتا ہے کہ زمانہ جدید کا آدمی اس لئے افسردہ ہے کہ وہ تلخ تجربات سے نہیں گذرا۔ لیکن اس نے ایک زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کی کتابوں میں ان تجربات کا حال پڑھا ہے اور وہ ان تجربات کے بوجھ سے دب گیا ہے۔ اور اس وجہ سے وہ قبل از وقت نا اُمیدی کا شکار ہو گیا ہے۔ اور زندگی سے لُطف اُٹھانے کے بغیر ہی اُس میں زندگی کو ختم کر چکنے کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ اس نا اُمیدی کو عیسائیت کا کوئی خاص واسطہ نہیں۔ زمانہ وسطیٰ کا تو بالکل بھی نہیں۔ سانتو بریاں آگے چل کر کہتا ہے کہ مظاہر پرست دُنیا (یونان و روم) کے زوال سے اور وحشیوں کے حملے سے انسان کی روح میں اُداسی اور مردم بیزاری ایسی منقش ہے کہ نکلتی نہیں وہ لوگ جنہوں نے اس طرح زخم کھایا تھا اور اپنے ساتھیوں سے الگ ہوئے تھے پہلے خانقاہوں میں پناہ گزیں ہوئے لیکن جب یہ ذریعہ انہیں تسکین نہیں دیتا۔ اب وہ دُنیا میں رہتے ہیں لیکن وہ اس سے تعلق محسوس نہیں کرتے۔ اور ہزاروں اوہام کے شکار ہو جاتے ہیں یہیں سے اُس مجرم افسردگی کی ابتدا ہوتی نظر آتی ہے جسے بے مقصد احساسات جنم دیتے ہیں وہ ایک خالی دل میں اپنا ہی شکار کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

عطا محمد!

۱؎ جیمس ٹامسن اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ وہ بڑی خوشی سے جہنم میں داخل ہو گا۔ کیونکہ "ناقابلِ برداشت بے رنگی کی بجائے اُسے وہاں تکلیف کی ابدی جنّت مل جائے گی۔"

اندھیرا

کسی کام کرنے ہی کے لئے حادثے ۔۔۔ آیا تھا جالی سے اندر
پھر دوا پلانا اور نبض ملنا شروع کیا۔ دو سال اچھا گزرا ہمیں لگے اور اگر
دوا دارو سے آس بندھ جاتی تو پھر آپ ہی آپ بیتیاں بلائے
پیچھوں سے دوا نائے اور جسم اپنا بٹا بیٹھا سرکا ہوا۔ ویسے
تو یہ سلسلہ کالا لگنے سے رہا۔ اور کوئی ۔۔۔ کبھی تو ہو۔ پانچ سال میں
تو رتی بھر فرق آیا نہیں۔ پانچ سال سوچو، اب نکاد تو زندگی کا
آنا بھاری کمر کا حصہ ۔۔۔ اور اب تو جیسے جو داس کے حلق تک
رگڑی سسیلی دوا ہی ۔۔۔ جلی جلی ہوں ۔۔۔ جلا ہوا۔ جاڑا گرمی
برسات اور ۔۔۔ ایک مہینہ گڑ کے ۔۔۔ الٹ لیں کوئی بات
تو ہو ورنہ تو یہ جی چاہتا ہے تمام جلی پیلی شیشیاں بھر بھر اس
زور سے دے کر ماریں کہ ۔۔۔ ہو جائیں اور کلینک کے نیلے شیشے
بہن ذرے ذرے اور تیل میں چھپکے رہ جائیں۔
اور ان سے یہ ڈاکٹری کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ جیسے رستم
ڈھونڈتے ہوں۔ ڈپٹی کلکٹری کے لئے ۔۔۔ انگریز ۔۔۔
جواب۔ خفیف سی چوٹ۔ ہلکی طنز کا پہلو لئے ہوئے۔ پُرنیاز مسکراتے
مسکراتے ہوئے فرنگی انداز میں شانے اونچے نیچے کرتے ہوئے
وہ رتھ نیلس۔ اجاڑ تم رستم ہو۔ پھر میرے گدگدے جسم میں سیسہ
بھرا ہوا ہے۔ ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔ پاؤں میں فولاد اور
پھیپھڑے ربڑ کی طرح پھول پچک سکتے ہیں۔ رپورٹ تیار ہوگئی۔
سال ڈیڑھ سال گذرا اور حاکم تحصیل۔ لالہ گھر طیبر داس پی۔ سی۔
ایس مسٹر داس بڑے دیالو ہیں عادت حصلت کے نیک۔ تراجہ
غریب پرور۔ مسٹر خلیل الرحمن قریشی۔ پی۔ سی۔ ایس۔ بڑے ترقی کرتے
ذکی ہیں ذہن براق جیسا۔ نئے ہیں بالکل لڑکے جیسے۔ ایسے بھلے مانس
کہ کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ آنکھوں میں کیسی مقناطیس ہے طبیعت میں
ذرا جوش ہے۔ آخر بیا خون ہے نا!
کوئی چار کپڑے اتار کر دیکھئے ان گدّوں کو، جنکی کھال تلے
گوشت کتنا گھل چکا ہے۔ ہڈیوں کے سفید گودے میں برابر کی گھلن
ملی ہے اور ٹانگیں تو چلائی پھرائی اور دبنے کے علاوہ کسی بات کے
لائق ہی نہیں۔ مگر اس کا کسی کو کیا علم۔ اور ہو بھی کیوں۔ سرکاری کام

حیرت ہوتی ہے یا دھڑ ہے؟ موم کے کھلونے! اور کھلونے بھی کہاں
وہ سب کھیل کے کام کے تو ہیں۔ انہیں تو چھوا اور موئے۔
ریڑھ کی ہڈی ناریل کی شاخ کی طرح نہیں جیتی۔ چکنی
اور لے جوڑ جیسی رسنہ کے پھول بیچ ہے۔ یہ تو سانپ کی طرح چھوٹی
بڑی گٹھلیوں سے مل ملا کر گردن سے سیدھی نیچے کو رینگ جاتی
ہے۔ اونچی نیچی نرم۔ لچکیلی، نازک اتنی کہ چوٹ آنے پر جان پر بن آئے
اور مضبوط ایسی کہ بھاری بھاری بوجھ سنبھال لے اور اس کے
اوپر جیسے جوبن ڈور سے میں تو جیسے بران ہی لٹکے ہوں۔
لمبی لمبی پتلی انگلیاں ریڑھ کی ہڈی کے نشیب و فراز پر
ہوتے ہوئے پھسل رہی تھیں۔ پیلی پیلی جن میں کچھ یونہی سی گلابی
جھلک تھی پیچھے ہلکے نیل نے انہیں گیہواں رنگ دے دیا تھا۔
بدن کی جلد سل کو گرتے ہی پی لیتی اور پوروں تلے ایک چپچپاہٹ
سی رہ جاتی چکنی سی، سوکھی سی کسیلی کسیلی۔ قریب ہی تپائی
پر انگیٹھی میں کوئلے چیخ رہے تھے۔ روئی کا تیل لگا ٹکڑا آنچ کے
قریب آتے ہی دھواں دینے لگتا۔ کچھ کچھ نیلا کڑوا۔ تیز جو سیدھا
ناک کی راہ لے اور نشتر کا یہ جی چاہتا کہ روئی کے ٹکڑے کو آگ میں
چھوڑ دے کہ شرکتے شعلوں کا سروپ جائے۔
"بہت جل رہا ہے بیگم!" تکیہ میں سے آواز آئی۔
"ہونہہ۔ میرے تو ہاتھ بھی پھنک گئے!" اس نے سوچا اب
کون ٹین رکھوائے انگیٹھی پر۔
"ٹین لگا لو" نیچے سے جواب ملا اور گھنٹے نے دوسرے کمرے
میں ٹن ٹن گیارہ گن دئیے۔ رضیہ نے انگیٹھی پر ٹین رکھ دیا۔ سعید
بجلی بجھا کر نیلا بلب کھول دیا۔ سونے کے کمرے میں ہلکا آسمانی رنگ
کھیل گیا خفیف سا سرگیں نیلا خواب آلود جیسے کوئی پکے آنسو
سو رہے ہیں۔" مگر اس کے جسم کا بھاری پن کہتا نہیں اس کی آنکھیں
جاگنا چاہتیں۔ رات گئے تک۔ اور جسم کبھی وہ جاگتی بھی رہتی اور پھر
کبھی بھولی نظر آتیں سستائی ہوئیں اور تھکی دکھائی دیتیں۔ چمکتیں
مگر چھپی چھپی۔ اور پیاسی انگڑائی، کسلمندی سی پیچھے چھوڑ جاتی
دیر تک نیلا نیلا۔ کڑوا تیز دھواں انگیٹھی کے سرہانے لاتا رہتا

ور پھر بل کھاتا حصت چھونے لگتا۔

ایسا بھی ہوتا کہ ہیلی ہیلی ستستان چھپاتے گاڑھے سیاہی مائل تیل کی الماری میں سے غائب ہوجاتیں مگر دوسرے تیسرے دن الماری بھرا انہیں اُگل دیتی سفید خوبصورت گولیاں جو چاہے کھاجائے وہ کبھی نہ ملتیں۔ تھرمامیٹر میں پر گر پڑتا اور پارہ زمین کی درزوں میں مچل جاتا۔ اور جب کچھ ہوا ہی نہیں۔ حمیدہ نئی نئی بوتلیں ڈبیاں اور تھرمامیٹر لے آتا۔ ہوتے ہوتے یہ ٹوٹ پھوٹ۔ کھونا پانا روز انہ کی بات ہوگئی جیسے پیلی پیلی انگلیوں کا ڈھیلی سی گنہوں کھال پر رینگنا۔

مشینوں سے گرتا پانی بند کے ایک طرف جمع ہوتا پھیلتا اور گہرا ہوتا جاتا۔ میلوں تک گنگا کا ٹھیرا پانی موجیں مارتا رہتا جو ہرا بھی تھا نیلا بھی اور کالا بھی۔ کبھی کبھی ہرا رنگ نیلے پر چھا جاتا اور کبھی نیلے اور ہرے رنگ کا میل ہلکی سیاہی میں ڈوب جاتا نظر اُس پار درختوں کی قطار سے ٹکرانی جو کائی کے اونچے نیچے ٹیلوں کی طرح زمین آسمان کے بیچ کی تنگ جگہ میں چھائی ہوئی دھند میں کھوئے تھے پل کے دوسری طرف پانی کی دو بہن ہار لے چمکیلی ریت کو کاٹتیں اُفق کی سیاہی میں گر پڑتیں۔ کالے بند کے جوڑ جوڑ سے پانی رستا رہتا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے نالیاں چلتی رہتیں اور ہرا نیلا اور سیاہی مائل پانی تیس فٹ کی اونچائی سے پھسلی ہوئی چاندی بن کر گر پڑتا۔ پل کے نیچے آکر گنگا کا رکا ہوا پانی تنگ سے راستے سے دھاڑتا سفید جھاگ کے غبار کی صورت میں زور سے گہرے پانی کے سینے میں گھس جاتا اس سے بل کھاتی ہوئی بڑی سی موج کی طرح طبیعت میں ہول سی بھر دیتی اور دل پسلیوں سے ٹکرانے لگتا۔

نیّر نے جلیل سے لگتے ہوئے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اگر کوئی اس میں گر پڑے"! اُس نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا۔ جلیل نے اُس کا شانہ دباتے ہوئے اُسے پہلو سے لگا لیا۔

رام دھارا میں بادلوں کی طرح تلملا رہی تھی اور پانی کا زور جیسے دھرتی کو جھنجوڑ رہا تھا کوئی بیس قدم اُدھر پل کے دوسری طرف چار پانچ بانس گہرا پانی دور تک چپکا پڑا تھا۔ نیلا سبزی مائل۔ ہلکا سیاہ بہت دور اُس پار کالے کالے ٹیلے دھند میں سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ اور اگر کہیں ایکدم سے اس بند کے سر اُٹھ جائیں تو یہی موٹا سوتا گنگا جل سارا کا سارا تیس فٹ کی بلندی سے گر پڑے اور دھرتی کا سینہ پھٹ جائے۔ پھر نہ جانے کیا ہو۔

"گنگا مائی کی جے!" پیچھے سے لوگ چلّا اُٹھے۔

"ارے۔ ر۔ رے مچھلی تڑپ رہی ہے"۔ نیّر چلائی۔

"وہاں کیا کر رہے ہو عزیز" جلیل نے آگے کو پکارا۔

"پکڑ لی بگلے نے مچھلی"۔ عزیز پل پر جھک گیا۔

سورج کی کرمیں پانی پر ناچتی ناچتی گرم ہوگئیں۔ پانی کی دور تک پھیلی چادر شیشے کی طرح چمک اُٹھی اور پانی کا شور گرم ہوا کے ساتھ ڈاک بنگلہ میں اُن تینوں کا تعاقب کرتا رہا۔ اس کے بعد گھنٹوں تک بجلی کے پنکھے کی آواز چلتی رہا اور جیسے دل کی دھڑکن بھی سست ہوگئی۔ قہقہے۔ الفاظ۔ آوازیں ہونٹوں سے نکلتیں۔ در و دیواروں میں جذب ہو جاتیں اور کمرے کی فضا گم سم ہوجاتی۔

مغرب کے کالے درختوں میں گرد سے اٹا لال طباق سا اُلجھا تھا۔ چاروں طرف گرد و غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہوا میں سنسنی اور فضا میں گرمی تھی۔

"آپ بھی چلیے گا؟" عزیز نے کیمرہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

مصنوعی جھرنے کے خیال نے نیّر کے دل میں ہلکی سی گدگدی اور سہم بھر دی۔ جیسے اونچی پینگ دل میں ایک لہر سی اُٹھا دے۔ خوشی۔ ہراس۔ خوف اور گدگدی بھری۔

"اُٹھیے۔ اٹھیے بس جلدی کیجئے"۔ نیّر نے جلیل کو اُکسایا۔

"بیگم دیکھو نا ابھی کتنی تپش ہے .... اچھا آپ اجو کے ساتھ چلیے ہم ابھی آتے ہیں"۔

"موہنہ آپ تو چلیے عزیز صاحب۔ یہ آتے رہیں گے"۔

ہوا خاصی تیز ہوگئی تھی۔ نیّر کا دوپٹہ ہوا میں بار بار لہرا جاتا۔ جیسے کوئی آبی پرندہ مچھلی پکڑنے ہوا میں غوطہ لگاتے عزیز کی رنگین قمیص اور نیلون جسم سے چپٹی ہوئی تھیں۔

"اُفوہ۔ یہاں ہوا کس قدر تیز ہے"۔ پل کی ہوا پیر اکھاڑے دیتی تھی۔

عزیز قریب آ گیا۔ ہوا کی تیزی پانی کا شور بڑھا رہی تھی۔ مغرب کی جانب آسمان پر بھورا رنگ پھیلتا جا رہا تھا۔

"آندھی کے آثار معلوم ہوتے ہیں"۔ عزیز نے بالوں میں

انگلیاں پھیرتے ہوئے آسمان کو دیکھ کر کہا

"چلیئے لوٹ چلیں [illegible]"

"نہیں جی۔ ڈر کا ہے کا ہے چلئے ابھی دھارا کی طرف چلیں۔"

نیّر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اُس کا دوپٹہ ہوا میں لہرا گیا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ" عزیز نے جلدی سے نیّر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

گھونورا رنگ تمام آسمان پر پھیل کر پھیکا پڑ گیا تھا ہوا کا زور مدھم ہو گیا تھا۔ وہ ٹیلے کے پُل کے اُس پار بیچ بیٹھے تھے دھارا جنگھاڑتا ہوا بل کھا رہا تھا۔ ابابیلیں پانی کی سطح پر منڈلا رہی تھیں۔ پنجوں میں چونچ دبائے اُتھلے پانی میں بگلا ایک ٹانگ پر کھڑا اونگھ رہا تھا۔ کنارے سے ذرا ہٹ کر سارسوں کا ایک جوڑا فٹ بھر پانی میں ڈوبا تھا۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اگر کوئی اس میں گر جائے تو بہتر ہے عزیز کی قمیص جیسے پیچھے سے پکڑ لی

"اگر اس میں کوئی گر جائے تو بچے گا؟" جیسے وہ جواب چاہتی ہو۔

"اوں ہونہہ" اس پر عجب خاموشی طاری تھی۔

"اور اگر ایک دم سے یہ جال ٹوٹ جائے"

عزیز نے سوچا وہی جو طبیعت کے ابلتے سمندر کا رک ہٹ جانے پہ ہوتا ہے مگر اُس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔

"بہہ رکا سا گر اس دھارے کی طرح گرجتا شور مچاتا کھل جائے اور ہم تم دونوں تنکوں کی طرح بہہ جائیں۔" اُس کی آنکھوں میں موتیوں کی تابناکی ابھری تھی۔ اور نظریں کسی غیر مرئی شے پر جمی تھیں۔ ایک عجیب سی ہول نیّر کے دل میں بھر گئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اگر کوئی اُسے زور سے چمٹالے تو یہ دھڑکن دب جائے۔ ... جلیل صاحب اب تک نہیں آئے ... جانے یہاں کتنا گہرا پانی ہے" وہ سوچ رہی تھی اور یونہی آپ ہی آپ سے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی انگلیاں ڈھیلی مسکی کھال پر رینگ رہی ہوں جیسے تیل میں ڈوبی۔ ایک ہلکی گلابی لہر اُس کے رخساروں کو چھوتی آنکھوں کی نمی میں تیر گئی۔

"کراک" تیز باریک سی آواز ہوا چیرتی دھارے کی گونج میں سما گئی۔

"کراک۔ کراک" مادہ سارس نے لمبی گردن سے پانی پر عمود ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ اُن دونوں کی نگاہیں دور پانی سے سمٹ کر آمنے سامنے جھکنے لگیں اور پھر جھک گئیں ایک دقت جیسے وہ جانوروں کی بولیاں سمجھی ہوں محجوب سی کانپتی کانپتی سہمی سہمی جیسے کچھ کہہ دیا ہو جیسے کچھ سن لیا ہو جیسے کچھ دیکھ لیا ہو۔

ہلکے گیہواں رنگ میں خوب سُرخی بھر جانے سے سلگوں ہو گیا تھا جلیل کی آنکھیں یاقوتوں کی طرح چمک رہی تھیں "میری سات سال کی دوستی کا یہ صلہ" کمرے سے نکلتے نکلتے خانساماں کی رفتار میں کمی آ گئی۔

"یہ جرأت یہ ہمت آخر ہوا کیسے کی" اُسکی آنکھیں غصّہ سے اُبلی پڑتی تھیں۔

"جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں" عزیز نے سوچا۔ لیکن اگر وہ کہہ دے "جلیل کی کمزوری نے نیّر کی جرأت نے۔ اُس عورت نے جو اُسکے انگ انگ میں چھپی بیٹھی ہے عمر نے اس طوفان نے جسے وہ نہیں روک سکی اُس پیاس نے جسے جلیل الرحمٰن قریشی پی۔ سی۔ ایس نہ بجھا سکا۔ اُسکی بدعملی نے۔ اُسکی کمزوری نے ہاں اُسکی کمزوری نے" تو کائنات عالم کے ذرّے ذرّے کی حرکت اُسکے دل میں سمٹ آتی۔ ستاروں کی گردش اُسکے دماغ میں حلول کر جاتی۔

اور وہ چپ رہا۔ اور اُسکی نظریں فرش پر جمی رہیں۔ "آستین کا سانپ نیچ ذات" اُس کے لبوں کے گوشوں پر سفیدی پھیل گئی۔

"تو نے یہ نہ سوچا کہ مڈل سے بی۔ اے تک کس نے کرایا۔ پیسہ کس نے لگایا۔ نوکری کس نے دلوائی۔ کوئی بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کر سکتا ہے؟" وہ غصّے سے کانپنے لگا۔

"ہاں بول بدبخت کیا ہے؟" حاکمانہ انداز اُس کے لہجہ پر حاوی آ گیا تھا

اور جیسے موج تڑپ اُٹھے "میری بدعملی نے تمہاری آوارگی نے۔ سات سال کی کمزوری نے۔ سات سال کی آوارگی سات سال کے ساتھ نے برائی نے۔ گندگی نے۔ میری غربت نے تعلیم کے شوق نے میری صورت نے میرے جسم نے ... بھائی! سلوک!! دوستی!! ہونہہ!!!"

جلیل کے چہرے پر گھناؤنی سیاہی چھا گئی گاڑھی گاڑھی گھٹی گھٹی پیلاہٹ کی رمق لئے کمرے میں سکوت تھا اور تاریکی۔ کامل سکوت اور گہری تاریکی جیسے گھنے جنگل کی ڈراؤنی وسعتوں میں۔ جیسے قبر کے اندھیرے میں۔ جیسے دل کی گہرائیوں میں۔

سیّد مسعود زاہدی

سیاہ پوش

سڑکوں پر، پارکوں میں، سُورج کی کُندن ایسی چمکتی روشنی میں چند اُداسی کا لبادہ پہنے سیاہ پوش ہستیاں نظر آتی ہیں۔ شاید یہ پچھلے تین چار سال کی بات ہے ماضی کا سایہ پھیلتے پھیلتے اب بہت لمبا اور وسیع ہو گیا ہے۔ سیاہ پوش انسانوں کی تعداد ہر لحظ بڑھتی جا رہی ہے۔ مایوسی کے لبادوں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے پہلے اس گروہِ ماتم میں صرف چند آدمی شریک تھے آج ساری خدائی نے نا اُمیدی کی سیاہ چادر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوڑھ لیا ہے، اور قبرستانوں کے ارد گرد فاتحہ پڑھنے والوں کی گنتی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ ان تین چار سالوں میں زلیست تھک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرِ راہ سو جانا چاہتی ہے۔ قوموں کا عروج و زوال، اور آئندہ آسودگی کے خواب شرمندہ تعبیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے برباد خیاباں سے ایک آواز اُٹھتی ہے اور صفحۂ گیتی پر پھیلتی چلی جاتی ہے۔

"انسانی جہل کے آخری پندرہ ہزار سال۔ انسانی بربادی کی ایک سو پچاس صدیاں۔ اور موجودہ دور اِن جہالت بھری ان گنت صدیوں کا تو نہیں کم از کم وقت کے ایک بڑے قیمتی حصّہ کا اختتام ہے۔ تاریکی کے پندرہ ہزار سال گذر جانے کے بعد روشنی کی کرنیں پھر نئے سرے سے سطحِ گیتی پر پھیل جائیں گی۔"

پندرہ ہزار سال کی تاریخ، اُس دَور کا آغاز جس کے اختتام نے انسان کے سوکھے دُبلے بھوک سے ستانے اور گلا گھونٹ دینے والے جذبات کے نیچے دبے ہوئے کندھوں کے گرداگرد، جسم کے بہارے سہارے، مایوسی، اُمید کے فقدان اور زلیست کو دم توڑتے ہوئے دیکھنے کے باعث، ایک سیاہ لبادہ سا اوڑھا دیا ہے۔ اُس سیاہ کفن ایسے لبادہ میں سے کبھی کبھی موتی جیسے سفید دانت چمک اُٹھتے ہیں اور دھوکہ دینے والی مُسکراہٹ خواہ مخواہ ہم نفسوں کو مستقبل اور جنگ کے خاتمہ کے بعد نسبتہً زیادہ فراغت نصیب زمانہ کے بارے میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔

آغاز سے انجام تک گذرے یا جلد گذر جانے والے پندرہ ہزار سال کے وقفہ میں انسانیت نے کئی بار سیاہ پوشی اختیار کی ہے۔ لیکن نسلِ آدم نے کئی بار سیاہ لبادوں کو نوچ پھینکا ہے زندگی کئی مرتبہ معصوم بن کر کھلکھلا اُٹھی ہے۔ مُردہ جسموں میں نئے سرے سے جان آ گئی ہے اور انسان ہر بار پُرانے لہو و لعب میں مشغول ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ماضی کے وسیع اور حدِ نظر سے وسیع تر میدان پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ گذری صدیوں میں کبھی زلیست نے اتنی نا اُمیدی کا اظہار نہیں کیا جیسا کہ جہالت کے پندرہ ہزار سال کی آخری گھڑیوں میں۔ ممکن ہے کہ آغاز اندھیرے میں ہے اور انجام اپنے قدموں پر۔ اور دوری کے باعث ہم کو ہر بار سیاہ لبادہ نوچ پھینکنے کے بعد انسانی بدن کُندن کے مانند دمکتے، اُمیدیں زیادہ اور نا اُمیدیاں کم، ناممکن کم تر اور ممکن زیادہ، دکھائی پڑتا ہے اور کم از کم ذہنی زوال کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی جسموں کو بیشک گُھن لگتا ضرور نظر آتا ہے کیونکہ ذہنی زوال نزدیک کی چیز ہے اور جسمانی تجربے آغازِ دُنیا سے منسلک کی جا سکتی ہے آغاز جواب تک اندھیرے میں ہے لہٰذا معدودے چند انسانوں نے ایک محدود وقت کو مطالعہ کا تختۂ مشق بنا لیا ہے، اور وہ وقت کے تختۂ سیاہ پر مشاہدہ کا چاک گھماتے رہتے ہیں۔ سقراط سے لیکر ایچ جی ویلز تک اور ارسطو سے کر کارل مارکس ہیگل اور رادھا کرشن تک اور جو تنزل سے شروع ہوئی تھی وہ اب دماغ تک آن پہنچی ہے۔

جہالت کے پندرہ ہزار سالوں کی تاریخ رُوح کے زوال سے ذہنی پستی تک کا تذکرہ ہے، آغاز میں جسم اور دماغ اتنے مضبوط اور دیرپا نظر آتے تھے کہ ان کی جانب خیال تک کی نگاہیں نہیں اُٹھتی تھیں۔ رُوح ہی محض مطالعہ اور مشاہدہ کے تاثرات کی سطح پر تیر رہی تھی۔ ایک مضبوط جسم اور تندرست دماغ کے مالک نسلِ آدم کو اگر کوئی کمزوری نظر آتی تھی تو صرف رُوح۔ رُوح کی خفتگی کا احساس، اُس کی روز بروز گھٹتی ہوئی بلندی کا منظر۔ رُوح جو عقائد اور فطرت کے اصولوں کو کُلیتاً طور سے تسلیم کرنے کے باعث انسانیت کی پروازوں، اور رُجحانات کو ایک ایسی اُونچی سطح پر تھامے ہوئی تھی جہاں اُسے ہر لحظہ مفاد اور اجتماعیت کا احساس تھا۔ ہر شے کی فراوانی، آبادی کی کمی، اور فطرت کے بیش بہا خزانے انسان کے قدموں میں کتنی ہی لازوال نعمتیں تھیں جو انسان کو رُوح کی بلندی سے جسمانی اور

دماغی برتری کی جانب ایک نگاہ تک ڈالنے نہیں دیتی تھیں، اصل میں حرص و ہوس، کمتری اور برتری، کد، دیا اور رشک و حسد کا زمانہ ہی نہیں تھا کمتری اور برتری انسان انسان کے مابین نہیں تھی بلکہ انسان اور فطرت کے درمیان، اور فطرت نے اپنی برتری کو ایک نہایت ہی مبہم شخصیت کی قبا میں چھپا کر سل انسان کو چھرنوں دادیوں درختوں، پھلوں اور پھولوں اور خود رو دغلوں کے بیش بہا ذرائع بخش دئے تھے لہذا انسان آغاز سے ایک بھولے بھالے معصوم بچے کی مانند زندگی کے دن بتاتا، وقت کی اُس محدود سرحد کی جانب مائل تھا جہاں سے لسنکدزمانہ کا آغاز ہوتا تھا۔ جسمانی برتری کا زمانہ اور روح کی گھٹتی ہوئی اہمیت

"میرے ہاتھوں میں دم ہے میرا جسم مضبوط ہے میں زیادہ ذرائع سمیٹ سکتا ہوں۔ کیوں نا ایک وادی کے بجائے دو وادیاں اور ایک خطۂ زمین کی بجائے دو خطہ ہائے زمین کا مالک بن جاؤں"

جنگ شروع ہو چلی، انسانیت کا بچپن ختم ہو چلا۔ شروعات جسمانی برتری سے ہوئی ایک جنون سا تھا اپنی اپنی قوتوں کو دوسروں کے خلاف آزمانے کا جنون۔ وقت نے بچپن کی معصومیت کو لڑکپن کے چلبلے پن کی جانب راغب ہونا سکھا دیا تھا۔ اب انسان محض غوں غوں غوں کرنے والا بچہ نہیں رہا تھا صفحۂ گیتی ایک کشتی کا اکھاڑہ بنتا جا رہا تھا۔ Survival of the fittest کا اصول عمل میں لایا جا رہا تھا اور عادت ایک بار جب انسان کے ساتھ چمٹ جاتی ہے تو چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ انسان کو عادت پڑتی جا رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے خواہ مخواہ قوت آزمائی کرنا چاہتا تھا لیکن چند اصولوں کے ماتحت۔ تاکہ لطف زیادہ حاصل ہو سکے اُسے اب بھی قدرت سے خوف تھا وہ اب بھی مختلف قوتوں کے سامنے جھکتا تھا اور غاروں میں کندہ کی ہوئی مورتیوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ہم جنسوں سے لڑتا تھا آہستہ آہستہ قوت آزمائی کا ذوق ایک نہایت ہی مقدس آرٹ کی صورت اختیار کر گیا۔ دیوتاؤں کو خوش کرنا مقصود ہو تو اُس کا ذریعہ یہی تھا کہ مختلف عقائد کے پابند انسانوں سے نبرد آزما ہو کر نفرت کے شادیانے عبادت گاہوں میں بجائے جائیں۔ لڑائی کے کرتبوں کی نمائش ہو اور جنگی رقص کو تکمیل تک پہونچایا جائے۔ لہذا وہ دور شروع ہو چلا جو آہستہ آہستہ جسموں کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ جوں جوں قوت آزمائی کا ذوق بڑھتا گیا توں توں جنگ کے منظم طریقے استعمال ہونے لگے"

سلطنتوں کا وجود، قوت کے سر سہرا، کردی قسم کی انسانی طبقاتی تقسیم اور قوت کے خلاف دماغی ترقی کا جنون، تمام کے تمام اُس انسانی دور کی آئینہ ہیں جب عقل، فہم و فراست کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ شکست خوردہ انسانوں نے جسم کی کمتری کی مایوس کن اور عادی از زندگی کفن پوش غلاموں کو اُس حق تک پہنچانے کے لئے جو ہر ایک انسان کو قدرت اور آفریدہ سے پہونچتا تھا ایک نئی ورباحت کی طرف توجہ دینی شروع کر دی جسموں پر دماغ کی برتری کمزور جسموں نے سپاہ لبادوں کو ترک کر دیا اور وقت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نیا حبط منوار ہوتا چلا اصل میں انسان کی جہالت کی تاریخ ابھی مخبوط الحواسی سے آغاز ہوتی ہے اور ابتدا میں تو واقعی نیا دار مُولا ہی بہت ہی تیر کمس تھا۔

"حکومت طاقت سے نہیں حکمت سے چلتی ہے۔ راج نیتی ایک نہایت اہم شے ہے۔ انسانوں کو کیا جدھر کل پھیر و اُدھر کو مڑ جائیں۔ نوع انسانی میں بیشتر سوچنے کی طاقت سے قطعاً محروم ہیں اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ بھیڑوں کے مانند ہانکے جا سکتے ہیں اور حکم ملتے ہی عجیب و غریب کرتبوں کی نمائش کر سکتے ہیں۔ ہاں مرد شوریدہ سر! آ، ہماری فوجیں بہادر ہیں اگر میدان جنگ میں مر گئے تو جنت، سُرگ، بہشت، دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھل جائیں گے اور اگر فتح پائی تو دولت، ثروت، عزت، فتح و نصرت تمہارے ہاتھ ہے اور تمہارا نام صفحۂ ہستی پر ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائیگا"

جسم کی برتری پر فوقیت حاصل کر لینے کے بعد دماغ میں من بھاونے راگ گانا شروع کر دئے۔ انسان خوشامد پسند بنتا گیا وہ غلامی کے دور میں قدم رکھنے کے بعد ایک نہایت تعجب خیز خلاقی سلسلۂ عمل میں اب ایسا جکڑا کہ زنجیر زیادہ مضبوط ہوتی گئی۔ اور جسموں کے گرد بندھے رہنے اور تکلیف دہ ہونے کے باوجود انسان نے غلامی، زبردست کی محکومیت کو میرا قبضہ، میرا ملک، میرا بادشاہ، ہمارا حکمراں ایسے مفروضات غیر مادی کی بنا پر بخوشی قبول فرما لیا حاکم کی فتح رعایا کی فتح تھی۔ شکست رعایا کی شکست تھی جو نیڑوں کی تعداد کی افراط اور محلات عیش و عشرت میں کمی، مغلوبیت کے باعث سینکڑوں بدعتوں کا عروج، بھوک کا آغاز بھی انسانیت کے دماغ پر مسلط نہ پذیر، اشیائے ملکیت کے خیال کو فنا نہیں کر سکا۔ آزادی غلامی میں تبدیل ہوتی گئی۔ مصیبتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور دماغ زوال کی جانب راغب۔ انسان کوشش کرنے پر بھی

ماضی میں جھانک نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی مغلوبیت کو زیست کا راز سمجھ بیٹھا تھا۔ راج دربار میں عزت، عہدۂ سرکاری پر تعیناتی، اور غلامی کے مکروہ مظالم کا ایک سبز بیٹا روح کی کٹی ہوئی پرواز ہی تو تھا اور بھلا کیا تھا۔ شرح ذاتی آزادی، بلندی پرواز، خود داری اور شخصی ذمہ داری کے اصولوں کو توڑ کر مغلوبیت پستی اور اپنے جان و مال کی حفاظت دوسروں کے ذمہ ایسے تباہ کن عقائد پر اتر آئی تھی۔ پہلے انسانی حفاظت خود اپنی ذات سے متعلق تھی اب آہستہ آہستہ وہ دوسری ذات سے وابستہ ہوتی جا رہی تھی۔۔ دوسری ذات کی موت اپنی موت تھی۔ حاکم کی شکست اپنی سیاہ پوشی کا باعث۔ اگر حاکم غمگین ہے تو رعایا بھی مایوسی کا سیاہ لبادہ زیب تن کرے اور نئے حاکم یا پرانے حاکم کی واپس حاصل ہوئی قوت کے ساتھ ساتھ یہ لبادہ نوچ کر پھینک دیا جائے اور تعمیر غلامی کے خیالات کو سیراب کرتے نسل انسان خوشی اور مسرت کے راگ میں ڈوب جائے گھی کے چراغ جلیں اور حکومت کے جھنڈے کو کھڑکیوں کے سہارے ٹانگا جائے۔ اور فتحمندوں پر پھولوں کی بارش کی جائے۔ سیاہ پوشی کے بعد فراغت کی چند گھڑیاں، ایک لمبی ناختم ہونے والی کہانی میں مزاج کے چند ٹکڑے اور مغلوبیت کا ترقی یافتہ نمونہ۔۔۔۔

جہالت کے آغاز سے قرنِ وسطےٰ تک حکومتیں محض طاقتور حکمرانوں کی شان و شوکت اور شاہی دبدبہ تک ہی محدود تھیں، ابھی زبردست سے زبردست آسا پامال کرنا نہیں سیکھا تھا کہ اُسے خوراک اور پہننے اوڑھنے تک سے محروم کر دیا جائے۔ اپنی رعایا کو اچھا کھاتے اور پہنتے ہوئے دیکھنا حکومتوں کی شان تھی۔ اپنی رعایا کو زیادہ سے زیادہ دولت فراہم کرنا اُن کا فرض۔ لیکن قرنِ وسطےٰ کے بعد سکندر اعظم کے مانند ساری دُنیا پر قابض ہونے کے تجربہ کو دُہرانے کی سکیمیں ہوا میں معلق ہو چلیں۔ اور پھر گرد و نواح پہ مطمئن نہ ہو کر دُور دراز ملکوں تک پر قابض ہونے کا جنون سوار ہو چلا۔ مقصد وہی پرانا تھا۔ یعنی اپنی رعایا کو زیادہ مال و دولت فراہم کرنا۔ لیکن ذرائع زیادہ مُہلک اور خطرناک اور اس ہلاکت اور بربادی کے آرٹ کو بلندی پر پہونچانا ہی آہستہ آہستہ دماغ کا مطمعِ نظر بنتا گیا۔ دجوہات نہایت جاہلانہ حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ دماغی برتری جہالت کو ودیعت کرتی ہو اور صحت مندانہ عناصر کو ترقی پانے باز رکھتی ہے۔ لہذا قرنِ وسطےٰ کے بعد سے انسانی جہالت کا بدترین دَور شروع ہوتا ہے۔ سیاہ پوشی کا دور تھا لیکن آغاز میں سیاہ لبادوں کو پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ جب کبھی کبھی انسان قابلِ فراموش لمحوں کے لئے مایوسی کی گھمبیر گھٹی ندی میں ڈوب جاتا تھا اور پھر مقابلتاً فراغت کے دھندوں میں کھو جاتا تھا۔

قرنِ وسطےٰ کا آغاز اجتماعیت اور دنیایات کی ناقابلِ فہم آمیزش کا آغاز ہے۔ انسان اجتماعی طور سے انسان پر نظر ڈالنا سیکھ رہا تھا اور نزعیات اس قسم کے ہیولے اس کے گرد تنے جا رہی تھیں کہ وہ مختلف گروہوں میں سے ایک کا جز بن کر نہا نہ ہلاکت اور بربادی کی تخریبی سازشوں میں حصہ لیتا اپنی بہتری اور بہبودی کو سمجھنے لگا تھا۔ بیشتر اس سے اتنا احساس ضرور تھا کہ ہر ایک انسان کو اتنی ہی مقابلتاً فراغت نصیب ہونی چاہئے جتنی خود کو لیکن اب یہ احساس مٹتا جا رہا تھا۔ ذاتی مفاد اور پھیلاؤ کے نئے جال نے قوموں کو ودیعت کیا اور فوراً ایسے غلامی کو ترقی دی اور غلامی زیادہ ہلاکت، زیادہ تخریب، کا باعث بنتی گئی۔ اور جہادی سنگین حلقوں کی تعمیر کا آغاز ہوا جوں جوں وقت بڑھتا گیا۔ توں توں انسانی معبودوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ نت نئے دیوتا اُفق پر اُبھرنے لگے بادی النظر میں انسان قدرت اور خدا پرستی سے منحرف ہونے لگا لیکن وہ ایک عجیب سلسلۂ عمل میں گرفتار ہو چلا تھا اس لئے ہر گام پر سینکڑوں سجدے ادا کرنے کی سزا ملتی جا رہی تھی معبودِ حقیقی کی طرف راغب ہونے کا وقت کم ہوتا جا رہا تھا اور نئے خداؤں کے سامنے سر جھکانے کا وقت بڑھتا جا رہا تھا۔ قوم، اجتماعیت، حکومت، فوج، مختلف دستور ہائے اساسی، اُس کی گردن کے گرد میں بھاری زیورات کی طرح لٹکتے جا رہے تھے۔ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور انسان قطعی بے خبر تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوجھ گھٹانے کے کام کر رہا ہے۔ نئے نظاموں کا فریب بوجھ کو کم کرنے کا ہرگز ہرگز طریقہ نہ بن سکا بلکہ قرنِ وسطےٰ سے موجودہ دَور تک ایک بارگراں سنگ خارا کی چکی کے مانند لٹک سا گیا۔ سچ۔ انسان نت نئی زمین تیار کرتا ہے تاکہ اُس میں نئے نظام کے بیج بوئے۔ لیکن پودوں کا پھل پہلے ایسا کڑوا اور تخریب کُن ہوتا ہے قرنِ وسطےٰ کی فصل فرانسیسی انقلاب کی صورت میں بُری طرح پھولی پھلی نتیجہ عارضی خوشی ابدی غم میں تبدیل ہوتی گئی۔ برادری، آزادی اور امن کا پیغام اپنی دُنیا میں اپنے آپ انسان کو کچلنے کا پیغام بن گیا۔ انسان نے اتنی بیدردی سے انسان کو

قتل کیا کہ وہ حکومتیں بھی جو ظالم اور سفاک تھیں اس بیدردی کے آگے شرم سے سر جھکا دیتیں۔ خون سے ہولی کھیلنے اور بدنظمی کے دیوتاؤں کو انسانی لاشوں کی بھینٹ دینے کے بعد نئی شاہراہوں کی طرف دیکھا جانے لگا۔ قوموں کے خیال نے پھر وسعت پکڑی۔ اور موجودہ دور کی پہلی نشانی یعنی اقتصادیات نے انسانی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرنا شروع کر دیا۔ قومیں آہستہ آہستہ اقتصادی گروپ بنتی جا رہی تھیں۔ مذہب اور سیاست دو عمودی شاہراہوں پر گامزن تھے آوازیں اٹھ رہی تھیں طریقہ مختلف ہے لیکن راگ وہی پرانا ہے اگر پرانے زمانے میں جسمانی برتری، مذہبی اختلاف اور شاہی شان و شوکت کے واسطے لڑائیاں مول لی جاتی تھیں۔ اب اقتصادی نظام لڑائی کا باعث بن جائے گی۔ "دھت!" انسان نے سب کو دھتکارا اب وہ جھوٹ رستے ترقی کر رہا تھا اس زندگی کا آغاز ہو رہا تھا قدرت کے نئے نئے بھید معلوم کئے جا رہے تھے اور زیادہ آرام و آسائش اور امن کی صورتیں پیدا کی جا رہی تھیں۔ پرانے زمانے کے لوگ جاہل اور نالائق تھے وہ کیونکر ان اسباب سے واقفیت پیدا کر سکتے تھے۔ جو سائنسی دور انسان کو فراہم کر رہا تھا۔ کتنا زبردست دھوکہ۔ پندرہ ہزار سال، جہالت کے تاریک پندرہ ہزار سال کی آخری کڑیوں میں انسان سوچنے لگا تھا کہ اقتصادی نظام جو سائنس پر مبنی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنگوں کا خاتمہ کر دیگا اچھا کپڑا، اچھا رہن سہن، نئی نئی معلومات، آسانیاں۔ وہ وہ عیش کے سامان معمولی سے معمولی انسان کو مہیا جو پرانے زمانے میں بادشاہوں تک کو نہیں تھے۔ بچہ انسانی فطرت کی گود میں کھیلا ہوا معصوم بچہ اُس پر بیکس [illegible] کی پرورش کر رہا تھا جو کسی روز خود انسان کو ہڑپ کر جانے والا ہو۔ مشین کی تھکی صورت میں ایک نیا خدا ہونے جا رہی تھی آدمی لوہے، اوزاروں اور مشینی حرکتوں سے تعلق جوڑتا جا رہا تھا اور مرتب اور منظم کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ کارخانوں میں کام کرنے والے سمجھتے تھے جو مشینوں کے درمیان اپنی زندگی کو ختم کر رہے کام کرتے تھے۔ لمبے ناختم ہونے والے گھنٹے کوئلے کی کانوں میں، گھٹنے کے بل چلنے والی عورتیں، کمزور بچے [illegible] کام کرتے ہوئے آدمی، مشین چلتی کی آواز اور پہیے کی جھنکار میں مصروف کار [illegible] slums گندے مکانات نے جنم لیا، سڑاندیں [illegible] گھٹو کے جیسی

تعداد میں اضافہ ہوا لیکن تب بھی انسان یہ کہتا رہا کہ جنگ تو ختم ہوئی اب سائنس کی مدد سے سب کو کام تو ملا لیکن طفل تسلیاں کب تک، جو چیز شروع شروع میں اپنے پن کے باعث پرکشش تھی موٹے ہوتے شبہات شروع ہوتی گئی۔ لوگوں نے کام کے محدود گھنٹوں کے لئے چلانا شروع کیا۔ مزدوری بڑھانے کیلئے آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔

We want a ten hours bill
We do not want a commission,
We want a ten hours bill.

کی صدائیں گونج اٹھیں۔ پرانے زمانے میں انسانیت کو ہزاروں کی خون بہا دینے والی مصر کے ماتحت Cheops کے لئے فراعنہ کے مقبروں کے لئے پتھر ڈھوتے تھے اب وہ تہذیب کے عظیم الشان مقبرہ کے لئے مشینوں کے گلا گھونٹ دینے والے سائے تلے کام کر رہا تھا۔ مشین اس کی شکی کمر پر اقتصادی پستی لعنت، slums، دبلے پتلے مرجھائے بچوں، وٹامن کی کمی، سخت قوانین، اور ہڑتال کے دنوں میں گولی سے اڑا دینے کے کارہائے نمایاں کی صورتیں ایسی ضربیں لگا رہی تھی کہ سوائے سسک سسک کر مرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ سسک سسک کر کام کرو اور مر جاؤ پیسکو اور جیو، جیو اور پیسکو۔ یہ بھی نہایت ہی خطرناک صورت کا حامل تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مفکروں کو نئے دور میں پرانے جاگیردارانہ نظام کی بو آنے لگی۔ جاگیردارانہ نظام سرمایہ دارانہ نظام کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ لوہا انسان کا مذاق اڑا رہا تھا۔ زندگی کی مسرتیں [illegible] بنی جا رہی تھی اور تھکے تھکے افسردہ و پژمردہ چہروں کی تعداد میں روز بروز، دن دگنی رات چوگنی ترقی۔ سیاہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ۔ الغرض زندگی ایک غیر منتہی راگ کے سوائے اور کچھ نہ رہ سکی۔

[illegible] اب ایک بہت بڑی فیکٹری ہے جس کا دروازہ ہر لمحہ انسانوں کو کارخانہ میں داخل ہونے کا منتظر ہے۔ دروازہ ہر وقت اپنے چوڑے منہ کو پھاڑے انسانی خوراک کی تلاش میں رہتا تھا۔ ہر ایک عام انسان ایک نہ ایک روز اس دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اُس دروازے کی طرف جو زندگی کی منبت صنعتی میں تبدیل کر ڈالتا ہے۔ جاؤ فیکٹریاں تمہیں پکار رہی ہیں، گندے مکانات تمہیں دعوت دے رہے ہیں۔ پتلے دبلے مرجھائے ہوئے پیلے پیلے بچے تمہاری راہ تک

رہے ہیں جہالت کے بارہ ہزار سال کی آخری گھڑیوں میں انسان نے خود کو برباد کرنا سیکھ لیا ہے۔"

امن کی زیادتی بیسیوں بیماریوں کا باعث بن گئی۔ امن جنگ سے بھی زیادہ خوفناک بنتا جا رہا تھا۔ اقتصادی نظام کے من بھاؤنے سہانے نتیجے سے جو امیدیں وابستہ تھیں آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگیں۔ لوگ یا گو سچ جو ادھر ادھر ہم وطن راستے سوچا تھا کہ انسان کس طرف اس حالت میں چل سکتا ہے جب اقتصادی نظام مشترکہ جائداد کے خیال پر مبنی ہو۔ سب برابر کے حصہ دار۔ مالک اور نوکر کی تفریق ختم۔ پیداوار، تیار شدہ مال، حکومت تمام کی تمام مشترک اور قوم کی تمام قوت، قوم کی برتری کے لئے وقف۔ اگر کسی کو گردن میں پھندا ڈال کر گھسیٹنا نہ آتا ہو تو اس اجتماعی نظام کو قبول کرے جسمانی حرکت ایک خاص نظام کے پابند احساسات اور جذبات تک پابند۔ عمر اور جوتی تک پابند۔ اپنی حکومت، اپنی ہی غلامی، اور اپنا ہی سکون۔

شو سلزم اور نہ جانے کیا کیا ازم، لوہے کا راج اور فوجوں کی سلطنت، ہتھیار بناؤ فوجیں بناؤ ہو جاؤ تیار۔ امن کیلئے ہتھیار ضروری ہیں۔ مستقل امن کے لئے آلات حرب کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ ہم کو مکھن اور دودھ نہیں چاہیئے بلکہ بندوقیں، توپیں اور ٹینک چاہئیں!!! لمحات فرصت غائب، آپس کا میل جول عنقا، انسان انسان سے ہراساں اور سہما سہما بغیر حفاظت و حفظ ما تقدم زندگی کٹھن۔ آج کی خوشی کل پر چھوڑ دو کل کی پرسوں پر۔ بیٹھے بیٹھے آنے والی مصیبتوں پر ماتم مناؤ۔ سنگین قلعہ بندی کرو۔ دُبکے چھپکے ہوائی جہاز تیار کرو۔ تاکہ امن عامہ قائم رہ سکے۔

اقتصادی نظام نے آہستہ آہستہ انسان کو زندگی سے منحرف کر دیا۔ دنیا ایک ایسی بھٹی بن گئی جس میں ہر دم لڑائی کی آگ کے سوا کوئی چیز سلگ ہی نہ سکے۔ وہم، اعصاب کی کمزوری، بھروسہ کی کمی، ریاکاری اور عیاری کے دیوتاؤں کی حکومت قائم ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم آئی۔ انسان خوب ہی خون سے کھیلا اس کے بعد دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد اور کتنی ہی جنگ عظیم۔ ملکی انسانی مصیبتوں کا انبار بڑھیگا حتیٰ کہ دماغ آہستہ آہستہ سرد پڑ جائے گا۔ روح کی پستی کے بعد ذہنی کمزوریوں کا راج ہوگا۔ اور دماغ کے خاتمہ کے بعد زیست ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منجمد ہو کر رہ جائے گی۔ اور یہ آواز کہ موجودہ دور دماغی عروج کا زمانہ ہے محض ایک صدا بصحرا بن کر رہ جائے گا۔

انسان ایک غیر معیّن عرصہ کے لئے سیاہ پوشی کا لبادہ اوڑھ لے گی اور حرکت جب تک شروع ہونے کا نام نہیں لے سکے گی جب تک روح بیدار نہ ہو۔ اصل زندگی کی علامتیں نمودار ہوں اور ہونوں تقاعت کا باعث بن جائے۔

پرتھوی ناتھ شرما

ٹیلیفون پر

"ہیلو۔ آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"
"میں فرید صاحب کے مکان سے بول رہا ہوں۔"
"مسٹر جاوید کو بلا دیجے۔"
"جاوید بول رہا ہے۔"
"آہا! آداب عرض ہے مسٹر جاوید۔"
"آداب عرض۔ آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟"
"میں ثریا ہوں۔"
"کون؟"
"ثریا۔ ثریا۔ ثریا افتخار احمد۔"
"معاف کیجئے۔ میں نے نہیں پہچانا۔"
"آپ مجھے نہیں پہچانتے مگر میں آپکو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔"
"جی۔"
"واللہ! مسٹر جاوید کیا ایسے موقع پر فقط جی کہتے ہیں؟ میں سمجھتی تھی، آپ کہیں گے، مجھے آپ سے ٹیلیفون پر مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"
"مجھے آپ سے ٹیلیفون پر ——— خیر کہئے آپ کو کیا کہنا ہے؟"
"میں کئی دن سے کہنا چاہتی تھی۔ آپ کسی دن ہمارے ہاں آئیں، کہئے آپ کب آئیں گے؟"
"مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم۔"
تفصیلی پتہ بتایا گیا پھر پوچھا گیا۔ "آپ آج شام آئیں گے؟"
"مجھے فرصت نہیں ہے۔"
"یہ کوئی عذر نہیں۔ فرصت نکل سکتی ہے۔"
"دیکھوں گا۔"
"جی نہیں وعدہ کیجئے۔"
"وعدہ تو نہیں کرتا کوشش کروں گا۔ آداب عرض۔"

دوسرے روز۔

"ہیلو ہیلو جاوید صاحب ہیں؟"
"جاوید میاں اندر ہیں۔ ابھی بلاتا ہوں۔" (وقفہ)
"ہیلو کون؟"
"ثریا۔ جاوید صاحب ہیں؟ واہ صاحب کل خوب آئے۔ انتظار میں آپ نہیں جانتے مجھے کسی تکلیف ہوئی۔ ارے واہ! کیا مردوں کا شیوہ یہی ہے؟"
"مجھے فرصت نہیں تھی میں نے کہہ دیا تھا۔"
"آج وعدہ کیجئے۔"
"وعدہ تو میں کبھی نہیں کیا کرتا۔"
"اچھا تو بغیر وعدے کے چپکے آجیئے۔"
"آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے؟"
"واللہ! مسٹر جاوید۔ کیا آپ نہیں سمجھ سکتے؟ جب سے آپ کو دیکھا ہے ——"
"خیر خیر ایسی باتیں نہ کیجئے۔ دیوار ہم گوش دارد۔"
"خوب! خوب! اچھا پاکیزہ مذاق! —— اچھا تو آج انتظار کروں گی۔"
"البتہ سنئے جب موقع ملے گا آجاؤں گا۔ آداب عرض۔"
"ہیلو۔ ہیلو —— سنئے ——"
اسی دن سے ملازم کو حکم مل گیا کہ افتخار صاحب کے بنگلہ سے ثریا بیگم کا ٹیلیفون آئے تو بلاتامل کہہ دینا۔ "جاوید میاں نہیں ہیں۔"

دو دن کے بعد۔

"بھائی جان آپ کے لئے ٹیلیفون آیا ہے۔"
"کون ہے قیصر؟"
"کالج سے کوئی بول رہا ہے۔"
"ہیلو۔"
"جاوید صاحب ہیں؟"
"اوہ! آپ ہیں"
"جی ہاں۔ صاحب یہ کیا طریقہ ہے۔ جب ٹیلیفون کیا، جواب ملا نہیں ہیں۔ واللہ آپ بڑے وہ ہیں۔"
"دیکھئے مجھے اس طرح پریشان نہ کیجئے۔"
"خوب! پریشان تو آپ مجھے کر رہے ہیں وعدہ کرتے ہیں مگر

نہیں آتے واللہ! کیا آپ پیدل ہیں؟
"جی نہیں میں پیدل نہیں، میرے پاس موٹر ہے۔"
"واللہ! سوال کچھ جواب کچھ۔ سادگی انتہا ہو گئی۔ آپ خاموش ہیں۔ ہیلو ہیلو۔ اوہ!"

تین روز بعد ایک خط آیا۔ لفافہ کھولا تو ایک فوٹو نکلا ایک محبت نامہ بھی تھا، بڑا ہی پر اثر۔ آخر میں التجا کی تھی "نہیں آتے تو نہ آیئے۔ کم از کم اپنا فوٹو تو بھیجئے۔" یہ جواب آیا اور نہ فوٹو ہی ٹیلیفون آتے رہے۔ دوسروں کے ٹیلیفون بھی آئے۔ مگر غلطی سے اُن کو بھی جواب دیا گیا "نہیں ہیں!"

ہمارا ہیرو سوچتا تھا۔ دھارا احباب کہتے تھے کہ آج کل بعض "زندہ دل" لڑکیاں ٹیلیفون کر کے ان کا ناک میں دم کیا کرتی ہیں میرا خیال تھا کہ یہ لوگ شیخی بگھارنے کے لئے ایسا کہا کرتے ہیں۔ مگر اب پتہ چلا۔ اس میں اصلیت ضرور ہے اچھا شغل ہے! ––– اب تو اس کا یہ حال تھا۔ ٹیلیفون کھڑکا، بندہ کھڑکا۔

ہمارا ہیرو بیحد خوبرو تھا ساڑھے تین سو کے عہدہ پر فائز تھا۔ کئی جگہ سے لڑکیوں کے پیام آرہے تھے ایک پیام تو خود اسکی بہن مہر سلطانہ لائی تھی اس کے کالج میں ایک بڑے گھر کی خوبصورت لڑکی پڑھتی تھی۔ مہر اس کو بھابی بنانے کی فکر میں تھی یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ نسوانی تعلیمی اداروں کی تاریخیں ایسی کئی مثالیں پیش کر سکتی ہیں جہاں کئی لڑکیاں کئی دوسری لڑکیوں کی سعی سفارش سے ان کی بھابیاں بن گئی تھیں۔ اور یہ دوسری لڑکیاں بھی اپنی باری پر دوسروں کے بھائی بندوں کے عقد نکاح میں آئی تھیں۔ غرض یہ ایک خوشگوار چکر تھا۔ نیکی کا بدلہ نیکی یہ اصول کارفرما تھا۔ عورت فطرتاً "نسبت ساز" ہوتی ہے اور نسوانی مدرسوں اور کالجوں میں اگر نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس فطری جذبہ کی تربیت بھی خود بخود ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے، یہ بھی قوم کا ایک زبردست فائدہ ہے۔

مہر کی پسند کی لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی کا پیام آیا تھا۔ موخر الذکر لڑکی کو اوّل الذکر سے زیادہ زر زیور دیا جا رہا تھا اسی لئے جاوید کے والدین اس دوسری لڑکی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اور خود جاوید۔ وہ اپنی بہن کو بے انتہا چاہتا تھا۔ مہر اس لڑکی اور اس کے خاندان کی قصیدہ خوانی اس زور شور کے ساتھ کرنے لگی تھی کہ جاوید کو اپنی بہن کی خواہش رد کرنا مشکل نظر آتا تھا لیکن دوسری طرف والدین تھے۔ ان کی دل شکنی بھی اسے منظور نہ تھی۔ وہ گومگو کے عالم میں تھا لیکن ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کرتا تھا "مجھے شادی کی جلدی نہیں ہے۔"

مگر لڑکی نمبر ایک اور لڑکی نمبر دو، دونوں کے والدین کو جلدی تھی اچھے لڑکے آج کل کمیاب ہیں جاوید قسمت سے مل گیا تھا دونوں لڑکی والے اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ لڑکی نمبر ایک والوں نے پندرہ ہزار روپے کا جہیز اور جوڑے پیش کئے تو لڑکی نمبر دو والوں نے بیس ہزار کی پیشکش کی گویا کہ لڑکے کا ہراج (نیلام) ہو رہا تھا۔

جاوید سوچتا تھا۔ اگر یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جبکہ عام طور سے لڑکے باقاعدہ نیلام چڑھنے لگیں گے۔ اس کی چشم تصور نے دیکھا، شہر میں مخصوص آکشن ہال کھلے ہوئے ہیں جہاں لڑکوں کا ہراج ہوا کرتا ہے۔ ایک دن ملاحظہ احباب کے لئے مقرر ہے جب لڑکی والے آتے ہیں لڑکوں کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں اور اپنی پسند کے لڑکوں کے نمبر نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ دوسرے دن نیلام ہوتا ہے آکشن ہال میں بھیڑ بھاڑ ہے ہراجی ایک ایک لڑکے کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا ہے "دیکھئے حضرات یہ لاجواب مال ہے۔ خوش رو، خوش اخلاق، لائق فائق، روشن خیال، مالدار، دیکھئے ایسی چیز مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے دس ہزار تو لیجئے حضرات بولئے!" اور خواہشمند ایسی ایسی بولیاں بولتے ہیں اور پھر "ون، ٹو، تھری" "مس" یہ مال فروخت ہو جاتا ہے

جاوید کے ساتھ عملاً یہی واقعہ پیش آرہا تھا۔ دونوں لڑکی والے ابھی اپنی بولیاں بول ہی رہے تھے کہ ایک تیسری لڑکی والے ٹپک پڑے ان کی بولی تھی پچیس ہزار کہ جس کے نصف میں ساڑھے بارہ ہزار۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ لڑکی کا نام ثریا تھا۔

جاوید نے کان کھڑے کئے۔ ایں گلے دیگر شگفت۔ دو محاذوں سے عہدہ برآ ہونا دشوار تھا اب تیسرا محاذ بھی کھل گیا۔

اس اثنا میں ٹیلیفون آتے رہے ایک روز کا واقعہ ہے جاوید کسی کو ٹیلیفون کرنے کے ارادے سے آلہ کے پاس گیا ہی تھا کہ گھنٹی بجی، خطرہ کی گھنٹی۔

"ہیلو"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جاوید!" بے خیالی تیرا بُرا ہو!

"آہ! جاوید! آخر کب تک یہ بے رُخی، یہ سرد مہری آخر کب تک؟ نہ خود آئے نہ جواب ہی دیا۔ نہ فوٹو ہی بھیجا!"

"محترمہ ـــــ دیکھئے آجکل ٹیلیفوں کم استعمال کرنے کا سرکاری حکم ہے محترمہ صاحبہ"

"نہیں مجھے تڑپا رہے ہو۔"

"محترمہ۔ خدا کے لئے مجھے بخش دیجئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ پیٹ مدے ہیں مجھے دُور کا ڈھول سمجھیئے۔"

"نہیں نہیں۔ نظروں سے دُور ہو مگر کان اور دل سے قریب ہو۔ واللہ! دل کی دھڑکن تمہیں ٹیلیفوں پر سُنائی نہیں دیتی؟ میری سنو جو گوش حقیقت ہوش ہو پھر دھیمے سروں آ تو کونسی بدلی میں مرے چاند ہے آجا۔ تو کونسی ـــــ"

"دیکھئے آپ ایسی باتیں کریں گی تو میں آبا سے کہدونگا۔"

"میرے آبا آپ سے مل کر خوش ہوں گے!"

"آپ کے آبا نہیں میرے آبا!"

"نہیں نہیں۔ ایسی دھمکیاں نہ دو جاوید واللہ! میری سرد آہیں تمہیں سُنائی نہیں دیتیں؟ آخر تمہیں میرا موم کا دل توڑنے میں کیا لُطف آتا ہے؟"

"دیکھئے مجھے نزلہ ہے متعدی بیماری ہے۔ ٹیلیفون پر کہیں آپ کو بھی ـــــ اچھا خدا حافظ!"

تیسرے روز پھر حسبِ معمول گھنٹی بجی جاوید کے والد ٹیلیفون کے پاس تھے۔

"ہیلو!"

"کون صاحب ہیں؟"

"میں فرید ہوں!"

"جی؟"

"فرید۔ فرید!"

"اوہ! معاف کیجئے نمبر غلط مل گیا ہے!"

چند روز بعد جاوید اسکرین پکچر دیکھنے گیا وہ دیر سے پہنچا تھا۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا ایک کرسی پر جا بیٹھا وقفہ ہوا روشنی ہوئی تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "مسٹر جاوید" گردن موڑ کر دیکھا ایک لڑکی نے کہا:

"آداب عرض!" جاوید نے دبی زبان سے جواب دیا۔ اس لڑکی کے ساتھ دو اور لڑکیاں تھیں۔ تینوں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔

جاوید سوچ رہا تھا یہ کون لڑکی ہے؟ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

جاوید فوراً پہچان گیا وہاں سے اُٹھ کر جو بھاگا ہے تو سیدھا گھر آ کر دم لیا۔

دوسرے روز اُس نے اعلان کیا کہ لڑکی نمبر تین کا پیام نامنظور! والدین کو حیرت ہوئی۔ مالیاتی نقطۂ نظر سے یہ پیام اُن کی توجہ جذب کر چکا تھا اور پہلے دو پیاموں کی اہمیت ان کی نظروں میں گھٹ گئی تھی اس انکار کی وجہ بار بار پوچھی گئی۔ جاوید بس اتنا کہتا تھا "میں وہاں نہیں کرنا چاہتا!"

اس ہٹ کا کوئی علاج نہ تھا۔ چار و ناچار لڑکی نمبر تین کا نام فہرست سے خارج کر دینا پڑا۔ مشاطہ کو انکاری جواب دیدیا گیا۔

اور جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو جاوید نے دوسرا اعلان کیا "مجھے شادی کی جلدی ہے!"

عجیب لڑکا ہے! ابھی کل تک کہتا تھا جلدی نہیں ہے اب کہتا ہے، فوری ضرورت ہے۔

مہر سلطانہ کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ لڑکی نمبر ایک کا پروپگنڈا دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ بھائی کے دل کے قلعے پر ہر زاویہ سے حملے کرنے لگی۔ والدین کو ہم نوا بنانے کے لئے اُس نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا

بالآخر مہر کی محبت نے اثر کیا۔ باوجودیکہ لڑکی نمبر ایک نمبر دو کے مقابلہ میں زر زیور کم پا رہی تھی لیکن قرعہ اسی کے نام پڑا۔ مہر کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس کا خلوص اُس کے چہرے پر رنگ لایا تھا۔

والدین پہلے منگنی کر کے چند ماہ بعد شادی کرنا چاہتے تھے لیکن خدا جانے کیوں لڑکے کو جلدی تھی۔ اِس لئے منگنی کا خیال ترک کر دیا گیا۔ دوسرے مہینے شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

اس واقعہ کے دو روز بعد۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ ثریا بیگم کو بُلانا کہنا کالج سے ٹیلیفون آیا ہے!" (وقفہ)

"ہیلو کون ہے؟"

"جاوید!"

"جی؟ زور سے بولئے۔"

"جاوید۔جاوید!"

"اوہ! آپ ہیں۔کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں نے کہا ایک خوشخبری سنئے!"

"جی!"

"اس خاکسار کی شادی جناب عنایت الرحمٰن کی لڑکی کنیز فاطمہ سے اگلے مہینے مقرر ہوگئی ہے!"

"میں جانتی ہوں!"

"پھر آپ مجھے مبارکباد نہیں دیتیں؟"

"دیکھئے آجکل ٹلسعوں کم استعمال کرنے کا سرکاری حکم ہے!"

"اوہو! ــــ تو آپ شادی میں آئیں گی نا؟"

"میں ایسے عبروں کی شادی میں بہت کم جایا کرتی!"

"مگر میں سمجھتا تھا، آپ مجھے اپنا ــــ!"

"میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔آپ ہیں کس خیال میں؟ آخر آپ کو اتنا دماغ کیوں ہے؟ کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟ آپ ــــ آپ ــــ آپ کس کھیت کی مولی ہیں؟ ــــ"

"مولی مونث ہے میں گاجر ہوں۔ اہاہاہا!"

"آپ ــــ آپ۔کتنا بھونڈا مذاق اــــ ٹیلیفون رکھدیجئے"

"اہاہاہا!"

اور کوئی پندرہ روز بعد ہمارے ہیرو نے ایک خبر غیر معمولی دلچسپی سے سُنی اُس کے دوست احسان نے کہا "جاوید کیا بتاؤں چند روز سے ایک لڑکی ٹیلیفون پر مجھے بیحد پریشان کر رہی ہے ثریا ہے اُس کا نام۔۔۔۔"

ناکارہ حیدرآبادی!

غزل

دیں وہ چُھپ چُھپ کر محبّت کا صلہ
چاہنے والے کا دل پائے جلا

زلزلے آئے قیامت کے بہت
مُنتظر اُن کا جگہ سے کب ہلا

حُسن چھا جائے جہانِ عشق پر
ہے یہی تاثیرِ صہبائے وِلا

وہ چُھپے دل کی کلی مُرجھا گئی
اُن کو دیکھا غنچۂ خاطر کِھلا

زیبِ رُخ کب تک نقابِ غیریت
بر ملا مجھ سے کریں میرا گِلا

لذّتِ خود رفتگیِ ذوقِ سجود
مجھکو خلوت میں ملا جو کچھ ملا

حُسنِ لافانی خدا میرے لئے
عشقِ صادق میرا شیخِ سِلسلہ

خاک و زر یکساں ہیں محوِ دوست ہوں
زر دمٹی کو بھی میں سمجھا طِلا

بن گیا عین الیقیں حق الیقیں
اُٹھ گیا یوں اعتباری فاصلہ

عشرت افزائے نگاہِ نکتہ رس
رُوح پرورِ حسرتوں کا قافلہ

ساقیا! منظور پر چشمِ کرم
ہاں، یہیں جامِ مئے اطہر پِلا

علی منظور!

ٹنّاں پہلوان

آج سے کوئی چالیس پینتالیس بلکہ پچاس برس پہلے لال کنوئیں کے بازار میں، قاسم جان کی گلی کے نکڑ پر چوکی بچھائے سینی آگے رکھے ایک پستہ قد، کان ٹوٹے، سر منڈائے، چیچک مُنہ داغ میلا سا تہمد باندھے عمر سے اُترے ہوئے مکڑا کی صورت اکڑوں بیٹھے آواز لگایا کرتے "مال کھاؤ تو آؤ۔ کھیر ہے ربڑی ربڑی ربڑی!" یہ آواز کچھ ایسا سارے جسم کا زور لگا کر نکالتے کہ زمین سے بالشت بالشت بھر اونچے ہو ہو جاتے۔ ان کا نام ٹنّاں پہلوان تھا۔

اُن دنوں شیخو والوں، نہر والوں، حوجی والوں وغیرہ کے نام سے کئی مشہور پُرانے اکھاڑوں کے علاوہ دو نئے اکھاڑے بھی کھل گئے تھے۔ اُس وقت دلی کے بعض رؤسا میں کسرت کا شوق باقی تھا۔ کشمیری دروازے نواب سلطان مرزا کے ہاں کسرت اور لڑنت ہوتی۔ نواب صاحب خود بھی اپنے لڑکوں سمیت لنگر لنگوٹا باندھ کے لڑنت کیا کرتے۔ اِدھر حکیم عبدالمجید خاں اور لہارو والے نواب احمد سعید خاں نے بلیماروں اور قاسم جان کی گلی میں دو اکھاڑے کھول رکھے تھے۔ ایک میں اُستاد انچھو لڑنت کراتے اور دوسرے میں اُستاد شہباز بیگ۔

دلی میں صدیقی، غلام، کیکر سنگھ جیسے پہلوان تو کبھی پیدا ہوئے نہیں، البتہ پھرتی اور پور پور ریاض کرنے والے اس وقت کچھ اکثر تھے۔ پُرانے پٹھوں میں تخولی نے توند نکال لی تھی۔ کلن کت جھول گیا تھا۔ موسی والے اور شدن کی بھی دونوں دنگلی نہیں رہے تھے۔ صرف انچھو اور شہباز بیگ نے حکیم اور نواب کے سہارے اپنی اپنی اُستادی کو سنبھال رکھا تھا۔ یا ایک آغا تو بڑے کو جو اس نے بعض کشتیاں مار کر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ اسے اپنی کھسوٹ پر بڑا ناز تھا اور واقعی اس کی پہلی جھپٹ شیر کی جھپٹ ہوتی۔ کھڑے ہوتے ہی اگر اس کا داؤں چل گیا تو اپنے سے دُگنے کو نیچے لے آتا۔ ورنہ سارے اکھاڑے میں ناچتا رہتا۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ غلام پہلوان دلی میں آیا ہے اور دنگل میں اُتر کر خم ٹھونکے ہیں تو آغا تو بڑا ہی تھا جس نے سامنے آکر کہا ہے کہ پہلوان! دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ غلام اُس کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا کیونکہ قد و قامت میں خاص تھا مگر توند نکلی ہوئی اور جسم تھل تھل۔ آغا بولا "پہلوان دیکھتے کیا ہو! ایک دفعہ تو میں تمہیں نیچے لے آؤں گا۔ اس کے بعد اگر تم چت نہ ہوئے تو میں جانتا ہوں کہ تم میری ہڈی پسلی ایک کر دو گے۔ خیر جو کچھ بھی ہو نام تو رہ جائے گا!" غلام بڑا سمجھدار تھا۔ خیال کیا ہو گا کہ کہیں مرد کی موت نامرد کے ہاتھ نہ آجائے۔ اگر واقعی اس نے گرا لیا تو ساری شہرت خاک میں مل جائے گی۔ ہنس کر آغا کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا "پہلوان تم ایسے ہی ہو۔ مگر میں فی الحال کشتی لڑنے نہیں آیا ہوں۔"

اس زمانے میں سال کے سال یہاں صرف دنگل بندھا کرتا تھا۔ تھولی مل کامدانی کا ایک کارخانہ دار یہ دنگل باندھا کرتا تھا۔ زینت محل کے دروازے میں دو سہ دریاں تھیں۔ دروازے کے اندر گھستے ہوئے بائیں ہاتھ کی سہ دری میں تھولی مل کی بیٹھک تھی اور وہیں کارچوبی کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ آغا تو بڑے کا گھر چونکہ سامنے ہی چابک سواروں کی گلی میں تھا اس لئے دنگل کے سلسلے میں وہ اسی تھولی مل کے پاس آ بیٹھا کرتا۔

آغا چابک سواروں میں سے تھا۔ شاہزادوں کے مشہور اُستاد شہسوار خاں کو لوگ اس کا پردادا بتلاتے تھے۔ کالے خاں ملے خاں کے دیکھنے والے تو اس وقت بھی ہوں گے۔ قلعہ کی بربادی کے بعد مہاراجہ شیو دان سنگھ نے انہیں الور بلا لیا تھا۔ شیو دان سنگھ کے بعد پٹیالے چلے گئے تھے۔ وہیں اُستادوں کی طرح رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

آغا کے بڑے بھائی پہلوان بھی تھے اور چابک بھی ہمیشہ اُن کی بغل یا ہاتھ میں رہتا۔ لیکن اب شہر میں ایسا کوئی رئیس تو رہا تھا نہیں جس کے ہاں ریس سواری کے گھوڑے ہوتے اور انہیں اپنے لڑکوں کو شہسواری سکھوانے کی ضرورت پڑتی۔ اب آخری دور میں تین شخص گھوڑوں پر نکلتے تھے۔ حکیم محمود خاں۔ نواب احمد سعید خاں یا حکیم بدرالدین خاں۔ ان کے بعد حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں کو بگھی ہانکنے کا شوق ہو گیا تھا۔ اچھا تو آغا کا بھائی نہ کبھی دنگل میں اُترا نہ اُس نے غالباً کبھی چابک سواری کی۔

جوکوئی لو تھنا کہ بڑے آغا گھوڑا لو ہی مہار دل رات کسے ہے دیکھا
نہیں جا سکتا کیوں نہ کہ وہ ہو کہ بدے کا اسباب جا بلند سوار دل
بابت دادا بہ ختم ہوگئی اب تو جا کہ ... جو اس طول ... دل گرمے کا جا
میں کامدانی بنایا کرتے ... نکل کے موقع ... منظم ہو جاتے۔

دلّی والے اس وقت ... کے ٹھاٹھ نے کو عیب سمجھتے۔ اس لئے
جب کبھی کسی دلی والے نامی ... لوگوں کی کشتی ہوتی اکثر طے ہوتی ہوتی
یعنی یا تو باہر والا پچھڑ جاتا یا برابر چھڑا دی جاتی۔ آغا تھوبڑے
کی گزر اوقات یہی رہ گئی تھی۔ پہلے تو وہ ... کا مدانی کا کام کیا کرتا
تھا لیکن اب کچھ مدت سے ... اور کچھ ... ڈھ ہو
جانے سے کشتی کی آمدنی ہی پر گزارہ تھا اور اس لئے ضرورتا
تھی کہ تھوبڑی ... سے سار ... ہے۔

ٹھناں پہلوان ... اور بڑے کا چھوٹا بھائی تھا لیکن
ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول ... دونوں ایک ہی ... کے بیٹے ہی ...
معلوم ہوتے تھے ... کا فرق کچھ
دن تو ... بادشاہ ... عاشق ... کبھی کبھی
پہلوان بننے کی ... جھڑکی بھائی ... آخر کھوکا
شاگرد ہو کر حکیم جی کے اکھاڑے میں ... اس لئے ...
سیر بھر دودھ بھی روز ... ۔

اکھاڑوں کی آپس میں حسد تو ہوا ہی کرتی ہے ہر استاد
دوسرے استاد کو نیچا دکھانا چاہتا ہے برسوں سے آرزو دل میں تھا۔
حیدا جانے کیا موقع ... آیا کہ استاد شہباز بیگ سے استاد
انچھو کو دیکھ کر خم ٹھونک ... نواب احمد سعید خاں اور حکیم
عبدالمجید خاں بھی ... کرسیوں پر بیٹھے تھے ... کشتی
ٹھہر گئی ہاتھ ملنے لگے دونوں استاد ... دونوں شہرہ ... ایک
خوب خوب استاد داؤں دکھا رہے ہیں ... داؤں پیچ ہوتے ہوئے آخر کار
شہباز بیگ نے ٹھوکی دے کر انچھو کی اکھنی میں ... لیا
آغا تو بڑے پاس کھڑے ہی تھے ... ہمیں معلوم ہے کہہ دیا
کہ شہباز بیگ کا داؤں نہ چلا بلکہ انچھو نے کاٹ ... شہباز
بیگ پر سواری گانٹھ لی۔ نواب صاحب بگڑ کر ... ہوئے حکیم
جی کے لحاظ سے انچھو کو تو کچھ کہہ نہیں سکتے ... پر برس
پڑے۔ آغا تو آخر ایک منہ زور اور شہزادہ ... دو گرے کو ہوا کہ
لوگ بیچ میں آگئے بڑی مشکل سے نواب صاحب ...
کیا۔ آغا کو ہٹا کر دنگل سے باہر لیا۔ لیکن ...

جی خاموش رہے تھے اس لئے نواب صاحب نے دو چار لفظ ایسے
بھی کہے جو ... رخصت ہوتے ہی ... دلوں میں چشمک ہوگئی۔
کچھ دن ... شہباز بیگ کا ایک بیٹھا تیار ہوگیا اور
ایک روز حکیم جی کے اکھاڑے میں نکل آیا۔ انچھو اپنے پٹھوں کو لڑنت
کرا رہے تھے۔ شہباز کے بیٹھے کو دیکھ کر کہیں انہوں نے کہہ دیا کہ اب
خدا نے چاہا تو شہباز کے مقابلہ میں ٹھناں کو لاؤں گا۔ شہباز
بیگ کے بیٹھے کو یہ سننے کی کہاں تاب تھی فوراً اکھاڑے میں کود
پڑا اور بولا۔ "استاد آپ سے لوگ ... کہتا میں حاضر
ہوں پہلے مجھ سے ... ہو کر یہ دیکھ لو۔" اتنے میں حکیم جی داخل
... آگئے ٹھناں ان کی مالش کیا کرتا تھا۔ صورت
دیکھتے ہی یہ کہتا ہوا کہ آ بار کی۔ بہت دن سے مجھے بھی آرزو تھی
کہ میاں کے سامنے زور ہو جائیں" اکھاڑے میں کود خم ٹھونکنے
لگا۔ لیکن حکیم جی کو کچھ خیال آگیا۔ کہنے لگے کبھی آج مناسب
نہیں بھائی صاحب ... اجازت کے بغیر میری مرضی نہیں کہ یہ
کشتی ہو ... بھائی صاحب ... استاد انچھو بھی نواب
صاحب کی اجازت لے لیں پھر ہو اکھاڑہ تجویز ہو۔ نواب صاحب
کا یا ہمارا وہاں زور کیا جائے ... گیا ٹھناں ذرا اکڑا
تو حکیم صاحب نے ڈانٹ دیا۔ اور ... کم از کم دونوں
استادوں کی موجودگی میں یہ دونوں پٹھے لڑیں۔

انچھو کے دل میں لگ تھا دوسرے ہی دن شہباز بیگ
سے ٹھناں اور گھی کی کشتی کا فیصلہ کرایا۔ نواب صاحب سے
اجازت مانگی تو ... کہا ہمارے اکھاڑے میں ہوگی۔
میرے پہلوان کو ... دکھانا کہ حکیموں کی گھی ہیں
جاتے۔

مختصر یہ کہ کشتی ٹھہر گئی اور دوسرے دن دونوں اکھاڑوں
کے استاد اور شاگرد مرغ ... کی طرح آگئے۔ حکیم صاحب
بھی آ پہنچے اور نواب صاحب۔ ان کے پاس آ بیٹھے دونوں پٹھوں
نے لنگر لنگوٹ کسے اور "یا علی" کا نعرہ لگاتے ہوئے خم ٹھونکتے
رانوں پر ہاتھ مارتے اکھاڑے میں اتر آئے۔ ادھر ٹھناں نے
انچھو سے کہا استاد اجازت ہے ادھر گھی نے شہباز بیگ سے پوچھا
اور ہاتھ ملا کر ... دی۔ کئی ہاتھ ... دل میں الٹ پلٹ
ٹھناں کی ... تھی ... جوڑ ...
جوڑوں کی طرح ... کر ...

انہیں تو جتنی جلد ہوسکے وار پار کی فکر ہوتی ہے۔ کچے پکے جتنے داؤں پیچ یاد ہوتے ہیں کوئی باقی نہیں رکھتے۔ چنانچہ یہ کشتی بھی اسی قسم کی تھی۔ دونوں اپنے اپنے اُستاد کا نام روشن کرنا چاہتے تھے۔ پور بور ریر داؤں کرنے لگے۔ ادھر سے ایک دستی ہوتی اُدھر سے دو دستی۔ ایک اَنٹی مارتا تو دوسرا اکھیر میں بیٹھ جاتا۔ کسی نے قینچی باندھی تو کسی نے نیچی۔ ایک طرف سے ہتکوڑا ہوا تو دوسری طرف سے ٹال۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے میں بیسیوں جوڑ توڑ ہو گئے آخر ایک دفعہ ہی ٹنّاں کی جو آنکھ جھپکی تو بغلی میں گھُس گئی لے بیٹھا۔ ٹنّاں نے قلعہ جنگ پر گرانا چاہا گُلّی نے قینچی ڈال دی اور سانڈی چڑھنے لگا۔

سانڈی میں شانہ اُتر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لوگ ہاں ہاں کرنے لگے۔ اتنے میں کہیں ٹنّاں کے مُنہ میں گُلّی کی انگلیاں آ گئیں اور نواب صاحب کے منع کرتے کرتے اُس نے چبا ڈالیں۔ نواب صاحب آئیں تو جائیں کہاں۔ غصّہ کے مارے لال ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں بید تھی ٹنّاں کو سونت ڈالا۔ اکھاڑے میں اودھم مچ گئی۔ وہ تو حکیم صاحب بغیر نواب صاحب سے رخصت ہوئے کھسک گئے اور چلتے چلتے انچھو سی اشارہ کر دیا کہ دیدہ مچانے کی ضرورت نہیں اپنے اکھاڑے والوں کو لے کر خاموشی کے ساتھ چلے آؤ ورنہ خدا جانے اُس روز کتنے سر پھوٹتے یا کیا ہوتا۔

اب ٹنّاں پہلوان کی سُنو وہ جو بھرے اکھاڑے میں نواب صاحب کے ہاتھوں پٹا تو ایسا مُنہ چھپایا کہ پہلے کئی مہینے تک گھر سے نہ نکلا۔ پھر جو نکلا بھی تو لنگر کھول کر۔ اس کے بعد کشتی لڑنا تو ایک طرف عمر بھر کسی اکھاڑے کا رُخ نہیں کیا۔ تھوڑی مل اور بڑے بھائی نے ہر چند سمجھایا اپنے ساتھ دنگل کے انتظام میں لگانا چاہا اس نے حامی نہیں بھری بلکہ پہلوانوں کی صحبت میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کامدانی کا کام بھی نہیں کیا۔ اور تھوڑے دن کے بعد جب اس واقعہ کے چرچے کم ہو گئے تو کھیر بیچنے لگا۔ کوئی پُرانا یار دوست مذاق مذاق میں پہلوان کہہ کر ذکر چھیڑ دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے زخم پر مرچیں چھڑک دیں۔ تیوری چڑھا کر کہتا "میاں کھیر بھی بیچنے دو گے یا نہیں۔ کیوں جی جلاتے ہو۔ رات گئی بات گئی۔ اب کے پہلوان کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اللہ میاں نے پہلوانی سے ہمارا مُنہ کالا کر کے کھیر والا بننا لکھا تھا۔"

بادشاہی دیگوں کی کھُرچن بھی ایسی ہوتی تھی۔ کہنے کو یہ لوگ بازاری شہدے کہلاتے تھے مگر ان میں بھی وہ آن بان تھی کہ آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ باتیں۔ دلّی کا پانی سڑ گیا۔ جمنا میں جب سے گندے نالے ملا دئے گئے ہیں ہر چیز بدمزہ۔ بے روپ اور گندی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اُس کا اثر کیوں نہ ہو۔

اشرف صبوحی!

گرنتھی

"ست نام"! یہ الفاظ حسبِ معمول گرنتھی جی کے مُنہ سے نکلے اور اُن کے قدم رُک گئے۔ لیکن ان کے گھیرے کا لٹکتا ہوا ازاربند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔

"گرنتھی جی! تم کو سو مرتبہ کہا ہے کہ یوں دندناتے ہوئے اندر نہ بڑھے آیا کرو۔ ذرا پرے کھڑے رہا کرو۔ کسی وقت آدمی نامعلوم کیسی حالت میں ہوتا ہے" نل کے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی پنڈلی شلوار کا پائنچا کھسکا کر ڈھانپ لی۔ اور ایڑیاں رگڑنے لگی۔ گرنتھی کب کا پیچھے ہٹ چکا تھا۔ عورت نے مفت میں رامائن چھیڑ دی۔ اس کا منہ اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ منہ اوپر اُٹھائے رکھنے کی بھی اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کی داڑھی بہت گھنی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے گردن کے قریب بال پسینہ سے تر رہتے۔ گردن کا وہ حصہ اس کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ غیر شعوری طور پر مُنہ اوپر اُٹھائے رکھنے سے ہوا کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا اور اسکو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔

وہ بیوقوفی کی حد تک سیدھا سادا ضرور تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل اُلّو کا پٹھا ہی تھا۔ ....وہ جانتا تھا آج اس عورت نے وہ بات کیوں کہی۔ پنڈلی، آخر پنڈلی میں کیا رکھا ہے اگر کوئی دیکھ بھی لے تو۔ "یہ سو مرتبہ" کی بھی خوب رہی۔ حالانکہ یہ بات اسکو پہلی مرتبہ کہی گئی تھی۔ وہ ہرگز اس طرح دندناتا ہوا اندر داخل نہ ہوا اگر باہر کھڑا رہنے پر اس کی مدھم آواز سُن لی جاتی۔ اس کی آواز اچھی خاصی تھی لیکن زور سے آواز دینے پر اسکو ٹوکا گیا تھا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے اس قدر حلق پھاڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے"۔ اگر وہ باہر کھڑا ان کی من پسند آواز میں بڑے ترنم کے ساتھ صبح سے شام تک ست ست نام ست نام کہتا رہے تو کوئی اُس کی آواز نہ سُن پائے اور نہ اُس کو روٹی دے۔ گوردوارے کے مسافر بھی ایک مصیبت تھے۔ نہ وہ روز روز آئیں نہ اس کو روٹیاں مانگنی پڑیں۔ اپنے واسطے تو وہ کبھی بھی روٹیاں مانگنے نہ آتے ... ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے والی کی صورت تو دیکھو یہ تو خیر! اس آفت کی پرکالہ صورت بھی قابلِ دید تھی جس نے اس پر بدنیتی کا الزام تھوپ رکھا تھا۔ سب سے احمقانہ بات جو اس کی بابت کہی جا سکتی تھی یہ تھی کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بُری نیت سے دیکھا لیکن بالکل وہی الزام اس پر لگا کر وہ طومار باندھا گیا تھا کہ توبہ ہی بھلی۔

عورت نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "آپھتیا! کیا بات ہے" چوکیدار تھینے نے گرنتھی کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "وہ سودرجی گھر پر نہیں؟ وہ آئیں تو کہنا کہ رات کو کنویں پر آ جائیں" بستی کا کٹور اہیش کئے جانے پر وہ اسے ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ گرنتھی کے کندھے سے کندھا کھڑا کر باہر نکل گیا۔ عورت کی پیشانی ناہموار ہو گئی۔

گرنتھی ان سب باتوں کا مطلب سمجھتا تھا.... آج اس کو اسکے ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی تھی۔

اس رات گاؤں کے بڑے کنویں پر گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے گرنتھی پر جرح کی گئی اور اگر کوئی بات اسکے حق میں نکل آتی تو جھٹلا دی جاتی۔ سب لوگ اس سے خفا تھے۔ کسی کی اصلی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کے گھر والوں کو پرشاد ہمیشہ کم دیا کرتا تھا۔ کسی کے بچوں کو اس نے گوردوارے کی پھلواڑی اجاڑنے سے منع کیا تھا۔ کسی کے گھر میں جا کر کچھ کام کرنے سے اس کی بیوی نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس پر الزام یہ تھا کہ لاجو ایک دن گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لئے گئی تو اُس نے بیچاری کا ہاتھ پکڑ لیا ____ لاجو کو گاؤں کے تین سگے بھائی کہیں سے بھگا لائے تھے۔ وہ برائے نام پردہ داری کے ساتھ تینوں کی بیوی تھی۔ وہ تینوں بیکار تھے۔ جو داؤں لگا کر گذر تے ایک بھائی نے پنساری کی دکان کھول رکھی تھی۔ کبھی جلیبیاں نکال لیتے۔ کبھی ایک تانگہ تیار کر لیتے۔ موقع پڑنے پر اچھے پیمانے پر چوریاں بھی کرتے۔ کبھی کسی راہگیر کی گھوڑی چھین لاتے ____

"کیوں لاجو! کیا یہ بات درست ہے کہ گرنتھی نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟"

لاجو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ سوہن گرنتھی نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو گلے لگانے کی کوشش کی۔

"گرنتھی جی یہ جو کہتی ہے؟"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

لاجو نے کہا۔ گرنتھی کچھ کہنے کو تھی لیکن اُس کو روک دیا گیا۔ "تو گرنتھی جی آج تم نے لاجو کا ہاتھ پکڑا کل کسی اور کا۔ آج کل تھوڑے گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں۔"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

"تم نے کام ہی وہ کیا ہے کہ ذرا [illegible] کل سے [illegible] کا کام بھگتا کر پرسوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

گرنتھی واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نہ آتی تھی۔

ایک عرصہ تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارہ میں گرنتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایکطرف تو اونچی عمارت دوسری طرف نئی عمارت بن رہی تھی۔ چک ۳۵ اور چک ۲۶ میں یہ تیسرا گوردوارہ تھا۔ یہ گاؤں چونکہ ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے اس لئے علیحدہ علیحدہ گوردوارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چڑھاوا بھی زیادہ چڑھتا تھا۔

تھوڑی دیر تک اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ وہ اداس تھی لیکن اس کو اپنے خاوند پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسکے خاوند پر جو الزام دھرا گیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا۔ وہ دونوں اس آفت کا اصل سبب بھی جانتے تھے لیکن لاچار تھے۔ اگر اس جگہ رہتے کا مطلب یہ تھا کہ بات بات میں بے عزتی برداشت کی جائے اس کی بیوی دوسروں کے گھروں میں جا کر نہ صرف کام کرے بلکہ اُن کی خوشامد بھی کرے تو اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ اس غلامی کو خیرباد کہہ کر اپنے گاؤں کو چلے جائیں لیکن آئندہ وہ کیا کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

گرمیوں کی چاندنی رات میں وہ کھلے آسمان تلے چارپائی پر لیٹا صحیح معنوں میں تارے گن رہا تھا۔ اس نے تاروں کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ورنہ تاروں کی دنیا بھی کس قدر خوبصورت اور انوکھی تھی کتنی دور تک پھیلے ہوئے بے شمار تارے اور بادلوں کی صورت کے وہ سائے جن کی بابت کہا جاتا تھا کہ مرنے کے بعد انسانوں کی روح اسی راستہ سے ہو کر جاتی تھی۔ نامعلوم وہ راستہ کتنا لمبا ہوگا؟ کیسی جگہ ہوگی؟ درخت ہونگے یا ریت کے ٹیلے۔ جب روح تھک جاتی ہوگی تو اس کو دم لینے کی اجازت ملتی ہوگی یا نہیں۔ یہ راستہ آخر جا کر کہاں ختم ہوتا ہوگا؟

اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی بج رہی تھی۔ گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی۔ دہی بلونے کی آواز اس بات کا ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔

وہ اُٹھا کلہاڑی پکڑ کر [illegible] کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ ایک بار کسی [illegible] کاٹ کر اس نے [illegible] بنائیں اپنے لئے ابھی [illegible] اور ابھی تو سالہ کے لئے ایک جھاڑن کا [illegible] ڈالے وہ [illegible] ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں سے گوبر ملی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی۔ چبوترے کے دونوں طرف کا رستہ [illegible] ڈھلوان سی ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ اس درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چرخڑی کی لکڑی کسی ہوئی تھی۔ پاس ہی دوسری چرخڑی اس میں دانے بنائے کھڑی تھی۔ پہلی چرخڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کو پیچھے کی جانب سے گھومنے سے روکتا ہوا۔ جب بیل کو جوت دیا گیا اور چرخڑیاں گھومنے لگیں تو کتا کٹ کٹ [illegible] والا چرخ [illegible] گھوما۔ رسیوں سے بندھی ہوئی ٹنڈیں[1] پانی کی طرف لپکیں جو ٹنڈیں رات کی بھری ہوئی تھیں انہوں نے پانی [illegible] جھال میں سے پانی کی دھار [illegible] نکلی [illegible] ٹنڈوں میں رُوں رُوں کی آواز نکالنے لگی جیسے گا رہا ہو کبھی رونے لگتی [illegible] دلسوز چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی [illegible] تاریکی میں [illegible] قریب آوازیں۔ چھوٹی بڑی گھومتی ہوئی چرخڑیاں [illegible] دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی عجیب [illegible] جانور [illegible] ہو۔

---

[1] ٹنڈ مٹی کا برتن

شور و غل سے فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ادھر اُدھر سے دو چار گیتے بھی گونجنے لگے۔

گرمی نے جھال کی طرف تختہ لگا کر پانی روک لیا تاکہ ٹینڈوں کی طرف چلا جائے۔ جب کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تو پانی کا رُخ جھال کی طرف اور ٹینڈوں کی طرف کر دیا جاتا۔ چاردیواری پر بیٹھ کر اس نے داتون کی دانتوں کی کونچی سے دانت اور جڑ صاف کئے پھر داتون چیر کر اس سے زبان کی صورت کھایا اور زبان پر رگڑا۔ منہ میں انگلی ڈال کر وہ کھانستا اور تھوکتا رہا۔

کنویں پر جھکے ہوئے شہتوت کے پیڑ پر پرندے پر پھڑپھڑانے لگے۔

داتون پھینک کر اس نے کپڑے اتارے لنگوٹی کے سوا سب لکڑی ہٹا دی۔ منہ اور ڈاڑھی دھو کر واہگورو واہگورو کا ورد کرتا پانی کی دھار کے نیچے بیٹھ گیا ـــــ یہ روز کا معمول تھا کل وہ اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا اس وقت یہ بات کس قدر ناقابلِ یقین تھی۔

کچھا نچوڑ کر اس نے بغل میں دبا لیا پانی سے لبریز بالٹی اُٹھا کر وہ گوردوارے کے اندر چلا گیا بڑے صحن میں اس کی بیوی جھاڑو دے رہی تھی کچھا جھٹک کر رسی پر ڈالنے کے بعد اس نے فرش پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

آج سنگرانت تھی

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھا دیا گیا گرنتھ صاحب پر ریشم کے رنگ برنگے رومال ڈال دیے گئے چوکی[1] بھی صاف کر کے درست کر دی گئی۔ پھر وہ اندر سے باجے، ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے سارے سامان اٹھا لایا اس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو ان کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گورو گھر کا کام تھا یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی کسی پر کیا احسان تھا یہ تو ان کی آخرت کا سوال تھا اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ان کا جانا ملتوی ہو جائے۔

لڑکی آج اپنے اچھے اچھے کپڑے پہنے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی

دھوپ نکل آئی اُگتی ہوئی چڑھتے سورج کی جھلملا[2] کر گھڑی کی گھڑی دھوپ میں جب مٹی کی گرمی نے بڑے بڑے مٹکوں میں پانی بھرنا شروع کیا تاکہ سنگت کو پیاس لگے تو پانی کی دقت نہ ہو گوردوارے کا بوڑھا سیل مزدور چلا گیا تھا۔ کام کم کرتا اور آرام زیادہ یہ تو ہو نہ سکتا تھا کہ سنگت کو پانی پلانے کے لیے وہ بیلوں کو شام تک کنویں کے آگے جوتے رکھے۔

سنکھ ہاتھ میں لئے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چاردیواری سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھرکم تنا پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا ارد گرد گوردوارے کے وہ کھیت تھے جن میں اس نے خود ہل چلایا تھا بیج بویا تھا چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا۔ نلائی کی تھی ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا قریب ہی بڑ کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی۔ گوروؤں کے زمانے میں ایک نہایت باکمال شخص اس گوردوارے میں سیوا کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گوروؤں کے چرنوں میں بتا دی ــ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا لیکن اس کی محنت میں فرق نہ آیا اس کا دل اسی جوش اور خلوص سے لبریز تھا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں وہ کھیتوں کی نلائی کر رہا تھا اس کی پگڑی کے اندر سے اُلجھے ہوئے بال پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ اسے پیاس محسوس ہوئی اس نے ٹینڈ میں پانی بھر کر رسی کا لگا باندھ کر اُسے بڑ کے درخت کی ٹہنی سے لٹکا رکھا تھا جب اس نے ٹینڈ کو چھوا تو وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے برف۔ کس قدر ٹھنڈا پانی ہے اس نے دل میں کہا گورو صاحب کے بادشاہ اسی طرف کو آنے والے ہیں کیوں نہ پانی انہیں کے لئے رہنے دوں وہ اس میں سے

---

[1] کھتیاں جھلنے کے استعمال میں آتی ہے لٹھیا چھوکرے میں چھانے کے بعد جو ملجھٹ سی رہ جاتی ہے اُسکو چھوڑی کہتے ہیں۔

پانی پی لیں گے تو باقی پانی سے میں اپنی پیاس بجھا لوں گا۔ بیشک گورو صاحب دورہ کرتے ہوئے اس طرف کو آنے والے تھے لیکن ان کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس وقت وہ اطمینان سے دربار میں بیٹھے سنگتوں کو درشن دے رہے تھے۔ یکایک گورو صاحب اُٹھ بیٹھے۔ اور فی الفور کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ سب حیران کہ آخر اس میں بھید کیا ہے۔ یہ بیٹھے بٹھائے ایکدم اتنی عجلت کیوں؟ گورو صاحب سچے بادشاہ نے فرمایا۔ میرا ایک سکھ میرا منتظر ہے۔ وہ پیاسا ہے جب تک میں وہاں جا کر پانی نہ پیوں گا وہ پیاسا ہی رہے گا۔ گورو صاحب گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچے جا ہے ہی پانی مانگا بوڑھے سکھ نے وہ ٹنڈ آگے بڑھا دی۔ وہ کس قدر خوش تھا اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گرنتھی درخت کے تنے پر کھڑا ہو گیا جب اُس نے سنکھ مُنہ سے لگایا تو دل میں سوچنے لگا۔ گورو صاحب دلوں کا حال جانتے ہیں۔ وہ میری بے گناہی سے واقف ہیں وہ یہاں سے نہیں جائے گا اُس کو یقین تھا کہ ضرور کوئی ایسی صورت نکل آئے گی۔

سنکھ پورنے کے بعد وہ دیر تک گاؤں کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ بھی کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ کتنی تیز دھوپ ہو گئی تھی اور لوگ ابھی گھر سے بھی نہ نکلے تھے۔ مٹیالے مٹیالے مکان۔ مکانوں کے بیچ میں سے سر اُٹھائے ہوئے سرسبز درخت... کچی سڑک سے آگے ڈھلوان پر بھنگیوں کے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ دو تین بچھڑے اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتے پھر تے تھے۔

وہ گوردوارے کے چھوٹے سے باغ میں گیا۔ انگور کی بیلیں آڑی ترچھی لکڑیوں پر سے گری پڑتی تھیں۔ ایک کونے میں سے اس نے اُلجھی ہوئی رسیاں اُٹھائیں، بیلوں کو لکڑیوں کے ساتھ لگا لگا کر رسیوں کے ٹکڑوں سے، کچھ ڈھیل دے دیکر باندھنے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں اپنے کام میں ماہر تھیں۔ قریب ہی ہرے دھنیئے اور مرچوں کی کیاری تھی۔ وہ اُس کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیچ بیچ میں کھٹ مٹھی بُوٹی کے چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے۔ اُس نے احتیاط سے ان کو اُکھاڑنا شروع کیا۔ بچے ان بُوٹیوں کو شوق سے کھاتے تھے۔

انار کے پیڑ خاموش سمادھی میں بیٹھے ہوئے، درویشوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ہوا بند تھی۔ پیڑوں کی پتیاں تک نہ ہلتی تھیں معلوم ہوتا تھا، جیسے پرماتما سے ان کی لَو لگی ہوئی ہو۔ باغ کا کتنا حصّہ بیکار پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ جھاڑیوں اور مدار کے خود رَو پیڑوں سے وہ حصّہ صاف کر کے وہاں سبزیاں لگائے مٹر، ٹماٹر، گوبھی ...

ہر پیڑ اور پودے کو دیکھتا ہوا وہ باہر نکلا پھر اسی تنے پر کھڑے ہو کر اس نے دوسری مرتبہ سنکھ بجایا۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مرد تو جو کھیتوں پر کام کر رہے تھے لیکن عورتیں گھروں میں گھسی پڑی تھیں۔ بیوی سے کہنے لگا۔ "دو مرتبہ سنکھ پور چکا ہوں۔ کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ کم از کم عورتوں کو آ جانا چاہیئے"۔

اُس کی بیوی چُپ رہی عورتوں کی بابت وہ جانتی تھی اوّل تو ہر عورت کے چار چار پانچ پانچ بچے تھے۔ ان کو نہلانا دُھلانا۔ پھر ہر عورت کو بناؤ سنگھار بھی کرنا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اپنے گہنوں اور کپڑوں کی نمائش کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دُنیا بھر کی باتیں یہیں کی جاتی تھیں کئی پیچیدہ مسائل یہیں بیٹھ کر سُلجھائے جاتے تھے۔

چھوٹی بچّی نے خوشی میں ڈھولکی دھپ دھپانی شروع کی۔ گرنتھی چمبیلی کے پودوں کے گرد اینٹوں کے اکھڑے ہوئے جنگلوں کی مرمت کرنے لگا۔ کہیں کوئی اینٹ گری پڑی تھی۔ کہیں کوئی ٹہنی اینٹوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ کسی جگہ پودے اس قدر پھیل گئے تھے کہ جنگلے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

لوہے کے ڈول بھر بھر کر اُس نے پھولوں کو پانی دینا شروع کیا۔ بیچارے گیندے کے پھول تو نرے یتیم ہی تھے کوئی ان کی خبر گیری نہ کرتا تھا۔ بیچارے خشک اور سخت زمین میں ہی نشوونما پاتے۔ کوڑا کرکٹ بھی انہیں پر پھینک دیا جاتا۔ اس کے باوجود جب پھول آتے تو ہر طرف پیلا ہی پیلا نظر آتا پھولوں کے ہار گوندھے جاتے، بچے جھولیاں بھر بھر کر گھروں کو لے جاتے۔ کچھ گرنتھ صاحب کے سامنے چڑھا دیئے جاتے، بری درگت ہوتی بیچاروں کی۔ وہ جب کبھی گیندے کے کسی کھلے ہوئے پھول کی طرف دیکھتا تو اس کو اس کے یتیم ہونے کا خیال آنے لگتا۔ جیسے کہ وہ خود یتیم تھا۔ وہ پودے کے قریب بیٹھ جاتا۔ پھول

ہَوا میں اِدھر اُدھر جھومنے لگتا۔ وہ پھول کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے لیتا جیسے وہ کسی بچّے کا چہرہ ہو۔ اس کو ایک بات یاد آجاتی۔ ایک مرتبہ (غالباً) گوروارجن دیوجی کے بادہ کی جھپٹ میں آکر پھول کی ایک پنکھڑی خاک پر گر پڑی تو گورو صاحب کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ـــــــ یہ سوچتے سوچتے نامعلوم جذبے کے زیرِ اثر گرنتھی پر رقّت سی طاری ہوجاتی۔ وہ کتنی کتنی دیر تک دم سادھے بیٹھا رہتا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی عقل موٹی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابلِ فہم کیفیت میں ڈوب جاتا۔

ٹیکی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کردیا۔ لکڑیاں اور موٹے موٹے اُپلے بھی ایک طرف ڈھیر کردئیے۔ اور سنکھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ دھوپ پھیل رہی تھی۔ آنکھیں دھوپ میں بنی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کرسکتی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جمادی۔ شاید کوئی صورت نظر آجائے۔ اس کو فکر تھی کام ختم کرنیکی۔

چند ایک نیلے پیلے دوپٹے ہوا میں لہرائے کچھ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دینے لگے۔ رنگ برنگ کے رومالوں سے ڈھکی ہوئی تھالیاں ہتھیلیوں پر رکھے زاہد صورت بوڑھی عورتیں پیچھے پیچھے چلی آتی تھیں رفتہ رفتہ دونوں گاؤں کے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلے۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گوردوارے کی طرف بڑھے۔

گرنتھی نے ہاتھ پاؤں دھوکر پگڑی کو درست کیا۔ گلے میں نیلے رنگ کا طویل سا کپڑا ڈالے واہگورو واہگورو کہتا گورو گرنتھ صاحب کے پاس جا بیٹھا۔ اس کی لانبی گھنی ڈاڑھی گرنتھ صاحب کی جلد کو چھو رہی تھی سر جھکا کر اس نے گرنتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چاردیواری کے اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں جنہوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھڑی سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پیسے، بتاشے، پھول، تھالیوں میں دالیں چاول آٹا وغیرہ رکھ وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں۔ لڑکوں میں بعض نے ہارمونیم پکڑ لیا۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا۔ دوسرا اپنی انگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ و سپید پردوں کو بے تحاشہ دبانے لگا۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی، دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے۔ چمٹے بھی چھنا چھن بولنے لگے ادھر عورتیں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔ ان کی آوازیں ہر باسدی سے آنا دُور تک سُنی جاسکتی تھیں۔ کچھ لڑکوں نے ادھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ نئی عمارت کے اینٹوں کے چٹّے لگے ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اینٹوں کی ریل گاڑی بنائی۔ ایک لمبی قطار میں اینٹ کے پیچھے اینٹ کچھ کچھ فاصلے پر رکھدی گئی پھر ایک کو جو ٹھوکر لگائی تو ساری اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ لڑکے اُچھل اُچھل کر شور مچانے لگے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں کھُل گئیں۔ انہوں نے از سرِ نو باندھنے کی بجائے پگڑیوں کو بغلوں میں دبایا اور باغ کے دوارے پر نکل گئے۔ آج وہ نڈر ہو رہے تھے وہ اپنی ماؤں کے ہمراہ تھے۔ گرنتھی کا اوّل تو آج کچھ خوف بھی نہ تھا۔ دوسرے وہ اس وقت آنکھیں بند کئے گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

اب مردوں کی آمد شروع ہوئی۔ موٹے کھدر کے تہبند باندھے گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے، سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پیتل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی ڈاڑھیوں کو خوب چکنا کئے ہوئے آئے اور ماتھا ٹیک ٹیک کر وہ اِدھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے۔ جن کے تہبند رنگدار تھے۔ تہبند کے پچھلے حصّے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے بعض جو شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ پگڑیوں کے شملے خوب اکڑے ہوئے۔ ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنہوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا۔ یہ کھلے ہوئے پھول کی طرح ان سروں پر ایسے لہراتا تھا جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اُس کی شاندار کلغی۔

مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوئی۔ چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے ایک ایک الاپچی اور لونگ

منہ میں ڈال کر بار بار چکھے، سرخ رنگ کے بار ہوتے۔ ساتھ ساتھ بڑا ڈھولکی بجنے لگی۔ چھوٹے دانت سے گھوم گھوم کر چٹا کی نا۔ شروع کیا اور پھر جیسے ہی چکر لئے بار ہو ہم دانے سے منہ کھول کر اس طویل ہو کی آواز نکالنے کے بعد کہا ۔

" اسے سچے گرو جی ، مہاراج ۔ واہگورو "

یہ کہہ کر وہ پیتل منہ ہلانے لگا ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ۔

جب ایک شبد کی روانی ختم ہو گئی تو سر کرکے واہگورو اصحاب نے آس میں کا نا کیونکہ شروع کر دی ۔ سب اس پر محو ہو گئے تھے ۔

شبد کیرتن کے بعد سری گورو گرنتھ صاحب کی پونی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی اس کے بعد گرنتھی جی نیچے اترا اور ارداس (دعا) کے لئے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی سب لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے گرنتھی نے اونچی آواز میں اور ارداس شروع کر دی۔

" سری بھگوتی سمر کے گورو نانک سی دھیائے پھر انگد گورو تے امر داس رام داسے ہو سہائے "

اس طرح دسوں گوروؤں کے نام دہرائے اور پھر

" پنج پیارے ، چار صاحبزادے ، چالیس مکتے ، ہٹھیوں ، جپیوں ، تپیوں (صاحب جھجھار سنگھ جی ، صاحب جوراور سنگھ جی ، فتح سنگھ جی) چالیس مکتے ، شہیدوں ، مریدوں ، صدق رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان دھر کے خالصہ جی بولو جی واہگورو "

گرنتھی کے واہگورو کہنے پر حاضرین اتنے بلند " واہگورو واہگورو " کہتے ادھر حاضرین کی آواز گونجتی ادھر ایک بڑے طبل پر چوب پڑتی اور طبل کی آواز حاضرین کی آواز سے مل کر دیر تک لرزتی رہتی اور دلوں پر ایک عجیب سی طاری ہو جاتی ۔

" جن لوگوں نے دھرم کے لئے جانیں قربان کیں ، بند بند کٹوائے ، چرخیوں پر چڑھے ۔ (بدن کے) جوڑ جوڑ جدا کروائے ، جن کی کھالیں کھینچی گئیں جنہوں نے کھوپریاں اتروائیں ، لیکن اپنا دھرم نہیں چھوڑا ۔ جنہوں نے سکھی صدق اپنے سر کے بالوں (یا لوں) اور اپنے آخری سانسوں تک نبھایا ان سنگھوں (سکھوں) اور سنگھنیوں (سکھنیوں) کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولو جی واہگورو "

" واہگورو واہگورو "

جن گورسکھوں نے گوردواروں کے سدھار کی خاطر سری ننکانہ صاحب جی میں اور سری ترن تارن صاحب کے سلسلے میں اپنے جسموں پر گولیاں کھائیں ، جنہیں جیتے جی آگ میں ڈال کر جلا دیا گیا ، دیگچیوں میں جھونک دیئے گئے ، اور وہ اس طرح شہید ہو گئے ، ان گورو کی صورت رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولو جی واہگورو "

" واہگورو واہگورو ! "

" جن ماؤں بہنوں نے اپنے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر اپنی جھولیوں میں ڈلوا لئے ان کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولو جی واہگورو "

" واہگورو ، واہگورو !! "

طویل دعا کے آخر میں (اے گورو صاحب) ہم کو نفس کی خواہشات ، غصہ ، لالچ ، محبت اور غرور سے بچا ہیے ۔ آپ کے حضور ارداس صاحب جی کی ارداس ۔ اگر بھول چوک میں کوئی لفظ کم و بیش ہو گیا ہو تو اس کے لئے ہم معافی کے خواستگار ہیں سب کے کام سنوار دے ۔ گورو نانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سب کا بھلا ۔

سب نے جھک کر ماتھا فرش پر ٹیک دیا ۔ گرنتھی نے دل ہی دل میں کہا " واہگورو ۔ سچے بادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں " پھر کھڑے ہو کر جو بولے سو نہال ست سری اکال " کے تین نعرے لگائے گئے اس کے بعد کڑاہ پرشاد (حلوا) بانٹا گیا ۔ رفتہ رفتہ لوگ پرشاد ہاتھوں میں چھپائے یا کٹوریوں میں لئے رخصت ہو گئے ۔ چند سر برآوردہ اشخاص بیٹھے رہے جب تنہائی ہو گئی تو انہوں نے گرنتھی سے کہا کہ اگر پرشاد باقی ہو تو لا یا جائے گرنتھی نے پرشاد ان کو بانٹ دیا جسے ان کو اپنے چکنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے انہوں نے بھی کہا ۔ اللہ سبحان اللہ ۔ ایک گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد سب حساب صاف ہوا ۔ گرنتھی سے کہہ دیا گیا کہ دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے

ٹھ دنیا کا یہ مسئلہ عارضی ہے ۔ کوئی شخص بھی یہاں دائمی طور پر بیٹھا نہ رہے گا ۔

وہ چابیاں سردار لکّا سنگھ نمبردار کو دے جائے۔

ان کے چلے جانے کے بعد گرنتھی کی سب اُمیدیں ختم ہوگئیں۔ اس کی بیوی نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ گرنتھی کے دل میں اب تک کچھ خلش سی تھی۔ وہ اضطراب میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

اپنے دونوں ہاتھ پُشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑا ہوکر اُس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ ایک دو جگہ سے سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اُکھڑ گئی تھیں۔ کائی جمی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں کوئی نہ نہاتا تھا۔ نامعلوم اس میں کب سے برسات کا پانی جمع تھا جس کے پیلے پیلے پھولوں کی تہ سی جمی ہوئی۔ برگد کے بڑے بڑے زرد رنگ کے پتے پاش پاش ہوجانے والے جہاز کے شکستہ تختوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اس کے قریب پُرانی سمادھ تھی جس کی دیواروں پر کچا سچا چونا اُکھڑا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر پُرانے زمانے کی رنگدار تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ سے رنگ اُکھڑے ہوئے ضرور تھے لیکن جہاں کہیں بھی موجود تھے کس قدر چمکدار اور دل کش نظر آتے تھے، خاص کر گورو نانک صاحب کی تصویر۔ درخت کی چھاؤں تلے بابا نانک جی بیٹھے تھے۔ ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانا۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا جس میں ایک سُرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی حجرے میں ساتویں گورو صاحب پرماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ تین چار برس پہلے کی بات تھی کہ ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلاناغہ بھگتی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت یکایک حجرہ منوّر ہوگیا، ذرّہ ذرّہ دکھائی دینے لگا۔ اتنے میں ایک نورانی صورت نظر آئی۔ لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لاسکا وہ بھاگ کر باہر نکل آیا اور فی الفور گونگا ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے اس کو بولتے نہیں سُنا۔ گرنتھی نے حجرے کا دروازہ کھولکر اس کے نمدار فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا۔ اور چُپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں اس کی بیوی وہاں آئی اور اس کی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی۔ وہ اُسکو اپنے ساتھ لے گئی۔

صحن میں دستی چرکھڑی والے چھوٹے سے کنویں کے گرد اگرد بیٹھے ہوئے جوڑے جبوترے پر نیلے رنگ کی ململ کی پگڑیاں باندھے نہنگ سکھ تیمر کے بڑے کونڈے میں سردائی گھوٹ رہے تھے۔ پگڑیوں پر لوہے کے چکر، گلے میں آہنی منکوں کی مالا لمبے لمبے چغے وہ لوگ باری باری باد م چاروں مغز اکالی مرچیں اور قدرے بھنگ والی سردائی کی گھوٹائی کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کونڈے کو دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا اور دوسرا گھوٹنے کا ایک لمبا چوڑا ڈنڈا، جو نیچے سے کم موٹا اور اوپر سے بہت زیادہ موٹا تھا، ہاتھوں میں لئے گھما رہا تھا۔ ڈنڈے کے اوپر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے جو چھنا چھن بول رہے تھے گرنتھی کچھ دیر تک ان کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

سورج غروب ہوچکا تھا ہوا بند تھی جب اُس کی بیوی دودھ دوہ کر گھر کے اندر جا رہی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول اپنی چارپائی باڑے کے قریب ڈال دی جوتے اُتار دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیک چارپائی پر ہو بیٹھا۔

کوّوں کے جھنڈ کے جھنڈ کائیں کائیں کرتے گاؤں کے چکر لگا رہے تھے۔ چھوٹی سی نہر کی اونچی منڈیر چکر کھاتی اُفق میں گم ہو رہی تھی۔ دُور چند اونٹ بے مہار اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

گرنتھی کھوئی کھوئی نظروں سے اُس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو جیسے آسمان سے کوئی نورانی صورت نمودار ہوگی۔ تاریکی بڑھ رہی تھی پورا چاند بلند ہو رہا تھا۔ اتنے میں بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آ نکلا بنتا سنگھ کسی عورت کو اغوا کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس قید بامشقت بھگت کر کل ہی اپنے گاؤں میں واپس آیا تھا، جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا، وہ بدستور ہٹا کٹا تھا۔ جب اسکو سزا ہوئی تھی اس وقت گرنتھی گوردوارے میں آیا ہی تھا۔ قریب پہنچ کر بنتا سنگھ نے بلند آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پھاوڑے سے گاڑھا گاڑھا کیچڑ ٹپک رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے پوچھا "گرنتھی جی! سُنا ہے کچھ آپ کے خلاف جھگڑا کھڑا کیا گیا ہے۔ میں تو کل رات واپس آیا تھا آج صبح سے میں چک ۱۵۶ میں ماموں سے ملنے چلا گیا تھا۔ اب میں سیدھا کھیتوں کی طرف چلا آیا۔ آخر ماجرا کیا ہے؟"

بنتا سنگھ کا نہ صرف اپنے گاؤں میں دبدبہ تھا بلکہ علاقہ بھر میں لوگ اس سے خم کھاتے تھے جب گرنتھی نے اس کو بتایا کہ

اُس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو گا تو وہ جملا کر اُٹھ کھڑا ہوا "کس کی مجال ہے کہ تم کو یہاں سے نکالے گرنتھی جی! تم اسی جگہ رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ رہو گے۔ میں دیکھوں گا کون مائی کا لال تم کو یہاں سے نکالنے کے لئے آتا ہے"!

یہ سُن کر گرنتھی نے جواب تک بے حس سا بیٹھا تھا آنکھیں جھپکائیں۔ اُس کی بھووں کو حرکت ہوئی وہ سسکی آواز میں بولا "اور سردار بنتا سنگھ واہگورو جانتا ہے میں نے لاجو کو چھُوا تک نہیں"!

سردار بگا سنگھ کے دو آدمی ادھر سے گذرتے ہوئے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ بنتا سنگھ ان کو سُنا کر بلند آواز میں للکار کر بولا "گرنتھی جی! تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ تم ہزار مرتبہ لاجو کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو۔ میں بگا سنگھ کو بھی دیکھ لوں گا۔ بڑا سردار بنا پھرتا ہے اور جن لوگوں نے تمہارے خلاف پنچایت میں حصّہ لیا تھا اُن میں سے ایک ایک سے نپٹ لوں گا"۔

ابھی بھرپور آوازیں اُس سے یہ موٹی موٹی گالیاں بھی سُنائیں

یہ خبر دو نوں گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب لوگ لاجو کو گالیاں دینے لگے حرامزادی! مفت میں بیچارے گرنتھی پر الزام دھر دیا۔

بلونت سنگھ

تجربہ

پرفشاں نالہ زناں ہیں خس و خاشاک تمام
اُڑتے اُڑتے یہ کہے جاتے ہیں ایسا انجام
تمہیں آغاز کی منزل سے نظر آتا ہے؟

خس و خاشاک بنیں گے جو یہ ہوتا معلوم
ہم یہ کہہ سکتے تھے آغاز ہے اپنا مقسوم
اسی آغاز کو انجام سمجھ سکتے ہیں،

اور آغاز کی منزل سے اُبھرنے والے
کوئی بھی بات ہو اُس سے نہیں ڈرنے والے
وہ سمجھتے ہیں زمانہ ہمیں بہکاتا ہے،

جب وہ بڑھتے ہیں تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
بارہا راہ میں انجانے مقام آتے ہیں
بڑھنے والے کے جو رستے میں اُلجھ سکتے ہیں

اور جب حد سے گذرتے ہیں گذرنے والے
اور بن جاتی ہے اُمید فریبِ معدوم
پرفشاں نالہ زناں کہتے ہیں دیکھو انجام
قہقہے اشکوں میں اس طرح بدل جاتے ہیں

میراجی

"شکست"

"شکست" کی تمہید اس کا پس منظر ہے اور قاری کو آئندہ حالات سمجھنے میں مدد پہنچاتی ہے۔ اور اگر اس کی روشنی میں وہ ناول پڑھے تو ان تمام خوبیوں کا ادراک کر سکتا ہے جو کرشن چندر نے ناول لکھتے وقت اپنے دماغ میں محفوظ رکھی تھیں۔

"شکست" کی تکنیک ابتدا میں ظاہرا وہی ایک پرانا استعارہ ہے جو فرسودگی کی وجہ سے اپنی تمام رعنائی کھو چکا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے یہاں اس کا استعمال ایک اپنے مخصوص طریقہ کار کا مظہر ہے۔ "وہ سورج کے مانند ست ماہی گیر" کی طرح کائناتِ عالم کی تمام روح اپنے جال میں سمیٹ لیتا ہے اور جدھر چاہتا ہے کھینچے لئے جاتا ہے۔ کہیں یہ جال ہمیں مطالب کے ان بلند و بالا سلسلہ ہائے کوہ کی طرف لیجاتا ہے جہاں سے نیچے کی دنیا ایک چیونٹی کی طرح نظر آتی ہے اور کہیں وہ ہمیں تخیلات کے غبار ہی میں گم چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے الفاظ کے اتار چڑھاؤ کا مدہم سانس ہمیں کرشن چندر کے اندر ایک نئی قوت کا احساس کراتا ہے۔ اس کی فنکاری کا جادو اور زندگی کی قوت بار بار ہم آہنگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس کے یہاں واقعات کا تسلسل اور رنگ آمیزی کچھ اس انداز سے ہے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مصنف اسے کہیں لئے بھی جا رہا ہے۔ وہ تسلسل کی رو میں بڑھا چلا جاتا ہے اور جہاں کہیں گریز آتا ہے — "اور چڑھائی ختم ہوگئی"۔ —— ایک جھٹکے کے ساتھ، جیسے چلتی ہوئی گاڑی رک جائے، قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کہیں دور چلا گیا تھا!

ناول کے شروع میں آفتاب یکایک غروب ہو جاتا ہے یہ آفتاب ذہنی، سماجی، اور ملکی آزادی کا آفتاب ہے۔ اسکے غروب ہو جانے کے بعد ساری وادی میں تاریکی پھیلنا یقینی تھی۔ لیکن کرشن چندر حدِ نظر تک آنکھوں کے سامنے ایک "خوبصورت وادی" پھیلا دیتا ہے۔ یہ خوبصورتی غروبِ آفتاب کا ایک سنبھالا ہے "سورج کا ماہی گیر" ہمارا سامراجی نظام حکومت ہے جو قانون اور سماجی پابندیوں کے جال لوگوں پر پھینکتا ہے۔ یہ اس کا آخری ہتھکنڈا ہے کائنات کی ہر چیز اس میں مقید ہے۔ یہ جال قفس کی طرح زریں ضرور ہے کیونکہ اس میں رہنے والوں کو حکومت اور سماج طرح طرح کے فائدے پہنچانے کے وعدے کرتے ہیں اس جال کا احساس تو ہر شخص کو ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے چمکیلے اور رنگین تانے بانے کی ملائمت ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ قید صرف جسمانی اور مادی ہی نہیں، ہوا کے لطیف جھونکے بھی رک رک کر آتے ہیں۔ انسان اپنی معاشی اور اقتصادی ضروریات کی حد تک ہی سوسائٹی کا غلام نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات بھی آزادی سے ادا نہیں کر سکتا۔

جدلی عمل (dialectical process) کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی نظام مستحکم ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں (forces of production) ابھرنے لگتی ہیں اور پیدائش دولت کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اب حالاتِ پیداوار اور پیداواری قوتوں کے مابین وہ مطابقت اور ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پرانا معاشی نظام مستحکم بنیادوں پر قائم تھا۔ بلکہ حالاتِ پیداوار اور پیداواری قوتوں کے درمیان ایک تصادم ہوتا ہے۔ یہی وہ جدلی عمل ہے جس کے ذریعہ پرانا معاشی نظام برباد ہو جاتا ہے اور اسکی جگہ نیا نظام لے لیتا ہے۔ ناجائز منتفعین — (exploiters) کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ یہ تصادم نہ ہونے دیں اور اس لئے وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمام آلاتِ پیداوار اور سرمایہ سمٹ کر ایک مختصر گروہ کے پاس آ جائے تاکہ پرانے معاشی نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ شام کا تخیل آزاد ہے وہ پیداواری قوتوں کی اجارہ داری اور سرمایہ کی ترکز بندی (Concentration of capital) کے خلاف ہے۔ "حکومت کے پرفن اور چابکدست ماہی گیر" نے ملک کے سارے وسائل (resources) اپنے قبضے میں کر لئے ہیں۔ "شام نے سوچا کہ کسی فرد واحد کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ وہ اس طرح سارے خطے کی خوبصورتی پر قبضہ کرلے اور اس وادی سے رخصت ہوتے وقت اسے بھی اپنے ساتھ

بستا جائے اس کا حق جا یا کہ مغرب میں اس افق کے کنارے سے اس افق کے کنارے تک ایک ایسا مدبّر پیدا ہو جائے کہ جو لوگوں کی خوبصورتی کا بہاؤ مغرب میں جانے سے رک جائے۔ یہ خواہش ہر آزادی پسند انسان کے دل میں اُٹھتی ہے لیکن سامراجیت کا ستبداد اس پر مسکراتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان باتوں کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں جب تک خود اس کے ملک کے باشندے ایک متحدہ مطالبہ نہ کریں ــــ اور پھر اس شخص کے دل میں آزادی کی خواہش کی جو ننھی سی قندیل روشن تھی وہ بھی بجھ جاتی ہے۔ دراصل وہ شکست یہ ہم ہے جو انسان اب تک کو سماج اور خود اپنی خواہشات کے ہاتھوں اٹھاتا آیا ہے۔

"شکست ہمارے دلوں کو مردہ نہیں کرتی۔ وہ ان میں گرمی پہونچاتی ہے غیظ و غضب کی آگ بھر دیتی ہے۔ بغاوت کی روح پھونک دیتی ہے وہ طبقے سر جو کوں سے ہمارے دلوں میں اس فرسودہ نظام کی شکست کی دعوت دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ "شکست" کے قصدی کرداروں میں خود اعتمادی کا جذبہ اپنی تمامیت اور تکمیل کے ساتھ موجود ہے یہاں تک کہ درگا داس بھی جس کو اپنے رائے سب اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے اپنے اندر یہ مادہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ دنیا اس کو کیا سمجھتی ہے لیکن یہی وہ مادہ ہے جو اسکو بار بار اکساتا ہے اور آخر کار ایک مجسم استفہامیہ بن کر وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے چندرا ایک ایسا کردار ہے جس میں خود اعتمادی کا جذبہ سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس کے استقلال کے آگے شیام بھی اپنے آپ کو کمزور پاتا ہے۔ "چندرا میں نے تم جیسی عورتیں کم دیکھی ہیں" لیکن چندرا کا کردار شیام کو بار بار جوش دلاتا ہے۔ چندرا کی ماں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ اور وہ سماج کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ بک جانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن چندرا کا گمان بھی ادھر نہیں آتا۔ وہ مصیبت سے گھبراتی نہیں مصیبت سے گھبرانا شاید اُس کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ وہ سمجھتی ہے کہ بغاوت کا فقدان ہی موت ہے۔ وہ اس موت سے دُور بھاگتی ہے۔

چندرا کا وجود ہماری سماجی زندگی پر گہرا طنز ہے۔ اس کا تعارف جب ناول میں ہوتا ہے۔ اس میں غرور، خود اعتمادی جیسی چیلنج پایا جاتا ہے۔ ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اُسکا کردار زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مجسم بغاوت بن جاتی ہے۔ وہ جوان ہے شاید یہی جوانی اس کے ارادہ کی جوانی کا باعث بھی ہو چندرا کی ماں بھی جب جوان تھی تو اُس کے ارادے اتنے ہی پختہ اور جذبات اتنے ہی شدید تھے، لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ صعوبتوں کی کثرت نے اُس کے بغاوت کے جذبات سرد کر دیئے۔ لیکن چندرا ایک طوفان تھی، اُس کا ارادہ پہاڑ کی چٹان تھا، اُس کے مقابل ایک دوسری چٹان تھی اور دونوں پیڑ پٹ ہو گئیں۔ وہ ہر چٹان سے ٹکرانے کو تیار تھی اور اس چٹان سے بھی ٹکرائی اور خود چکنا چور ہو گئی۔ لیکن اُس کا عزم آہنی قائم ہی رہا۔ موہن سنگھ کو موت کی آغوش نے لے لیا۔ لیکن وہ ایسی شکست کا تصور ہی نہ کر سکتی تھی، وہ کسی قیمت پر بھی سماج سے صلح کرنے کو تیار نہ تھی۔

کرشن چندر کسی کردار کی بُرائی مضحکہ خیز حد تک نہیں کرتا۔ اُسے اپنے کرداروں سے ہمدردی ہے لیکن دلچسپی نہیں۔ وہ اُنکی اچھائیوں اور بُرائیوں کا تجزیہ انتہائی غیر جانبداری سے کرتا ہے۔ دُرگا داس کی ہیبت کذائی جو اُس کو ڈارون کے مسئلہ ارتقاء کی بھولی ہوئی کڑی (*The missing link between the highest ape and the lowest man in Darwin's Theory of Evolution.* ———) بنا دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ کچھ اس قسم کا ہے کہ اُس پر ہنسنا کوئی تعجب کی بات نہیں اور آپ اس *Caliban* نما انسان یا انسان نما *Caliban* کا تمسخر اُڑانے میں بھی حق بجانب ہیں، لیکن وہی دُرگا داس آپ کے سامنے مجسم سوال بن کر آتا ہے "میں بدصورت ہوں، میں بہت بدصورت ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ اگر میں بدصورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" آپ کی تمام خندہ پیشانی اور خوش مذاقی کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور آپ ایک دم اس نشانِ استفہامیہ کو دیکھنے لگتے ہیں اور جب آپ دیکھتے ہیں کہ مصنف نے بھی یہی چیز سمجھ کر لکھی تھی تو آپ چلا اُٹھتے ہیں "میں یہ سمجھا تھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ اور یہی مصنف کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

کرشن چندر کو انتخاب الفاظ کی تکنیک پر پورا عبور ہے، وہ جانتا ہے کہ کہاں الفاظ کا تکرار روح کے سوز کا اظہار کر سکتا ہے

وہ ایک مشاق بازی گر کی طرح الفاظ سے کھیلتا ہے، وہ الفاظ سے مختلف قسم کی تصویریں بناتا ہے کہیں یہ تصویریں حقائق سے ہم آہنگ ہوتی ہیں اور کہیں اُن کے اور واقعات کے درمیان تخیل کا دھندلکا ہوتا ہے قاری جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے یہ تصویریں اُسکے دماغ پر قبضہ جماتی جاتی ہیں اُس کے سامنے ہوتے عجب سائے سطح کاغذ پر گھومتے نظر آتے ہیں اور غیظ و غضب میں نکلے ہوئے الفاظ چنگاریوں کے شعلوں کی طرح بھڑکتے ہیں۔

راستہ میں بسنت کشن سے اتفاقاً چندرا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ چندرا اکیلی ہے اور بسنت کشن کی جبلی آوارگی اس تنہائی سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے لیکن چندرا کی خودداری اس آوارگی کا جواب بھی دینا چاہتی ہے اُس نے جواب دیا بھی اور اچھی طرح، لیکن اُسے اپنی بے بسی کا احساس بھی ہے۔ مگر اس احساس پر بھی اُس کی خود اعتمادی کا جذبہ غالب ہے اُس کے احساس کی شدت کرشن چندر الفاظ کے تکرار سے ظاہر کرتا ہے۔

"وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ جب وہ گھاٹی کو پار کر چکی تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، جب وہ کچہری کے بنگلے کے قریب سے گذری تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، جب وہ شفاخانے کے دروازے کے اندر داخل ہوئی تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، جب وہ اُس وارڈ میں داخل ہوئی جہاں موہن سنگھ چارپائی پر لیٹا ہوا اُس کا انتظار کر رہا تھا تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، لیکن جب اُس نے موہن سنگھ کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے . . ."

جملہ کی تکرار چندرا کے غصہ کی بڑھتی ہوئی آگ کی آئینہ دار ہے، آخر میں یہ احساس اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ قاری کے سامنے واقعی الفاظ کانپنے لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چندرا واقعی غصہ میں بھری کانپ رہی ہے۔ وہ غصہ میں بھری ہی اور شاید اس کا غصہ اور بھی شدت اختیار کر لیتا، لیکن جب وہ اپنے محبوب کو دیکھتی ہے جو بے بس اور لاچار چارپائی پر پڑا ہوا ہے، تو غیظ و غضب کے جذبات اپنے اظہار کے لئے آنسوؤں کا ذریعہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ روتی ہے اور شاید یونہی روتی رہتی لیکن موہن کی تسلی سے اُسکے آنسو تھم گئے "اُس کا آخر ہے کون۔ وہ آج ہی تو وہ اپنی ماں سے لڑ کر آئی ہے۔ برادری نے پہلے ہی دھتکار دیا ہے۔ اُس کا تو کوئی ہے موہن۔ ہے اور جب موہن کہتا ہے "چند دنوں کی بات ہے چندرا بس چند دنوں کی بات ہے" تو اس کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اور . . . ہو جو اُسے اپنا سائے اور جس کو وہ اپنا کہہ سکے۔ وہ جانتی ہے کہ موہن اُس کا ہے اور وہ موہن کی ہے، وہ اچھی طرح جانتی ہے دل کی گہرائیوں سے اس پر یقین رکھتی ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ یہی الفاظ اپنی ماں سے بہ تکرار دہرا چکی ہے لیکن اُس کا ٹوٹا ہوا دل موہن کی زبان سے بھی یہ الفاظ سننا چاہتا ہے وہ اپنی سسکیوں کے درمیان اور اندھے ہوئے گلے سے کہہ ڈالتی ہے — "وعدہ کرو موہن کہ تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے"۔ اور موہن کا جواب اُسے مطمئن کر دیتا ہے

"اور" اور "پھر" یہ دو لفظ ایسے ہیں جو کرشن چندر کے استعمال الفاظ پر قادر ہونے کو اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں کوئی بھی شخص جس نے "شکست" کو اچھی طرح پڑھا ہے، وہ ان دونوں کا مقصدی استعمال نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کسی شخص کو ان الفاظ کا استعمال ہی بے معنی نظر آئے لیکن ذرا سا غور کرنے سے ان کی اہمیت بخوبی واضح ہو جائے گی۔

فلمی ریل ([illegible]) میں متحرک چیز کی مختلف حالتوں کے فوٹو ہوتے ہیں اور سب علیحدہ علیحدہ، لیکن جب وہ ایک مقررہ دور میں ایک تعداد سے زیادہ دکھائے جاتے ہیں تو نگاہ اُن میں امتیاز نہیں کر سکتی اور اُن کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ فلمی تصویروں میں اگر آپ کو مختلف قسم کی کیفیات بیک وقت دکھانا ہیں تو سینما فوٹوگرافی کی تکنیک کی بدولت یہ کام ہو سکتا ہے، لیکن کاغذ پر اپنی تحریر کے ذریعہ آپ قاری کے دماغ میں یہ اس طرح اُبھار سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ہی لمحہ میں ہو گیا۔ اسی مقصد کے لئے "اور" کا استعمال کیا گیا ہے۔ "اور" کے استعمال نے الفاظ میں حرکت پیدا کر دی ہے۔ ایک لفظ دوسرے لفظ میں اور ایک جملہ دوسرے جملے میں مدغم نظر آتا ہے، "اور" کا تسلسل واقعات کے تسلسل سے بھی ہم آہنگ ہے۔

"اور پھر وہ بےتکلف وہاں سے چلی گئی، اور شیام کا دل کسی نامعلوم خوشی سے معمور ہو گیا اور اُس کے مُنہ سے "سی" کی آواز نکل گئی اور اُس کا ہاتھ رُک گیا"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقتی کا چلا جانا، شیام کے دل کا کسی نامعلوم خوشی سے معمور ہو جانا، اُسکے مُنہ سے سی کی آواز کا نکل جانا

اور اُس کا ہاتھ رُک جانا سب کچھ ایک ہی لمحہ میں ہو گیا۔ اتنے غضب کا تسلسل شاید کوئی دوسری تکنیک اس خوبی سے ادا نہ کر سکتی۔

"یکا یک اُس نے سُنا ایک چھوٹا سا لڑکا دروازہ کی دہلیز پر کھڑا ہو کر چلا چلا کر اور بازو ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا" وتی مر گئی، وتی مر گئی" اور اُس پتھر کے بُت میں جان آ گئی اور اُس نے رودسی ماں کا ہاتھ جھٹک دیا، تھال ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر جا پڑا، اور شیام بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔"

"اور پھر" کو ہم سینما سلائڈ سے تشبیہ دے سکتے ہیں" اور پھر سے کرشن چندر کا مقصد تسلسل نہیں بلکہ منظر کی تبدیلی (Transformation of Scenes) ہے

"اُس کے باپ نے کہا تھا آہستہ آہستہ دراتی چلاؤ۔ یہ دراتی اُس وقت تک تجھے کاٹتی رہے گی جب تک تو اس کا صحیح استعمال نہ سیکھے گا۔ اور پھر اُس کے تخیل میں اپنے باپ کی وہ تصویر آئی جب وہ سیتا رام مہاجن کا قرض چکاتے چکاتے بوڑھا ہو گیا تھا"

انسان کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جہاں انسان صرف محسوس کر سکتا ہے "لطف" اُٹھا سکتا ہے "محظوظ ہو سکتا ہے" خوشی کی زیادتی سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو سکتی ہے اور ایک لمحے کے لئے اُس کے قلب کی حرکت بند بھی ہو سکتی ہے، لیکن اگر بعد میں وہ وہی کیفیت دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہے تو الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ نہایت آسانی سے اپنی جنسی کیفیت کا تجزیہ کر سکتا ہے، لیکن اپنے محسوسات جنسی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لئے شاید کرشن چندر جیسے مصنف کی ضرورت ہے، کرشن چندر نے کئی جگہ اس بات کی کوشش کی ہے اور وہ نہایت کامیاب ہے۔

"اور پھر شیام نے وتی کے چہرے پر گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے وہ اپنے نینوں کے رفاف پردے گرا کے چھاتیوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی جہاں اُس کے سینے کے طائر مضطرب انداز سے اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے یا شاید نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے، پکے ہوئے پھل کی طرح، اور شیام کے دل میں ان پھلوں کو توڑ لینے کی خواہش تڑپنے لگی، ایک ضدی بچے کی طرح میں چندا ماماں لونگا، میں چندا ماماں لونگا، میں وہ موٹر لونگا، مجھے وہ لال چڑیا

لادو"

وتی بدستور سرہانے پر لیٹی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں بند تھیں اور اُس کی مدھم سانس کے ساتھ اُس کی چھاتیاں ہل رہی تھیں شیام نے ساری توجہ چشمے کے کنارے کھلے ہوئے پھولوں کی طرف منعطف کر دی۔ ان پھولوں کا کیا نام تھا۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں، خوبصورت جیسے نہیں نہیں۔ اب کوئی جیسے نہیں، وہ کسی ایسی چیز کا خیال نہ کرے گا۔ یہ پھول خوبصورت تھے اور کوئی ایسے ویسے نہیں، جیسے اُس کے دل میں لاکھوں دھڑکنیں ایکدم سے پیدا ہونے لگیں اور وہ اپنے دل سے کہنے لگا مجھے کچھ اور سوچنا چاہیئے، مجھے کچھ اور سوچنا چاہیئے، ان پھولوں کا کیا نام ہے کمبخت وہ ان پھولوں کا نام ہمیشہ بھول جاتا تھا۔ اُس نے کہا "ان نیلے پھولوں کا کیا نام ہے؟" اور اسکے لاشعور میں لاکھوں نیلے نیلے پھول کھلنے لگے"

کرشن چندر نے کئی معنوں میں اُردو ناول کی روایتی تکنیک سے انحراف کیا ہے۔ وتی سے شیام کی محبت پہلی ملاقات ہی عشق کے درجہ تک نہ پہنچ گئی تھی، ایسا ہونا خواہ ناول کی شرع میں کتنا ہی محبوب کیوں نہ ہو، لیکن حقیقت کی دُنیا سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ جمال یکدم آ کے دل و دماغ پر چھا نہیں جاتا اس طرح کہ آپ کی نگاہوں کو سوائے اس کے اور کچھ نظر نہ آئے، جمال اثر پذیر ضرور ہوتا ہے اور اگر وہ متواتر اثر پذیر ہوتا رہے تو رفتہ رفتہ عشق کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، کرشن چندر کی جیسی باریک مشاہدہ کرنے والی نگاہیں ان باتوں کو نظر انداز نہ کر سکتی تھیں۔

شیام کو شروع میں وتی سے یوں ہی سا لگاؤ ہے اور ایک دو مرتبہ کی سرسری ملاقاتیں اس تعلق کو زیادہ مستحکم نہیں بنا سکی ہیں۔ اُس کے لمس سے اُس جسم میں خون کی روانی بڑھ جاتی ہے، لیکن جب وتی چلی جاتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس نے تیر کو کمان سے نکلتے دیکھا تھا، جیسے آسمان کی تاریکیوں میں اُس نے شہاب ثاقب کو نور کی لکیر کھینچے دیکھا تھا اور یہ نور کی لکیر دیر تک اُس کے سامنے کھنچی بھی رہتی ہے، اور پھر یہی لکیر معدوم بھی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک یوں ہی سا تعلق ہے، شیام وتی کا ذکر بھی کسی کے سامنے نہیں کرتا کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ اُسے وتی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ ہر شخص کی زندگی میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ شیام پہلے ہی سے ان چیزوں سے شناسا ہے۔ شیلا

باربار اُس کے دماغ میں آتی ہے لیکن دیتی نہیں۔ ابھی ونتی کو دلہا بننے کی زندگی کی شعور نہیں سمجھتا اور اسی لئے اُسے اس قسم کا خیال ظاہر کرنے میں کوئی باک بھی نہیں۔

"پرائشچت کرلے، یہاں کون پوچھتا ہے اور ونتی کی شادی بھی پنڈت مرتب کشن کے لڑکے سے کر دے، بس پھر چین ہی چین ہے۔"

ونتی سے شیام کی ملاقاتیں اور اس کے ساتھ اُس کی دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے جس کا اظہار اُس کے غیر شعوری ردِعمل سے ہو رہا ہے، اور علی جو کے سامنے ونتی کے متعلق زیادہ باتیں کرنا شاید اُس کی بڑھتی ہوئی محبت کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے جو شیام کو ونتی سے ہوتی جا رہی ہے۔

کرشن چندر سوسائٹی کے بہت سے اصولوں پر اعتراض کرتا ہے اور اس کے لئے وہ مختلف طریقے استعمال کرتا ہے، ظرافت، طنز، معقولیت۔ علی جو کے ساتھ شیام کی گفتگو میں کرشن چندر کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ جذبات کو دخل نہ دے اور اپنی بحث کو زیادہ نتیجہ خیز اور فائدہ مند بنانے کے لئے اُسے تصویر کے دونوں رخ دکھانے پڑتے ہیں اور اکثر اُسے نتیجہ بھی قاری ہی پر چھوڑ دینا پڑتا ہے لیکن پھر بھی اُس کے رجحان کا کچھ نہ کچھ پتہ چل ہی جاتا ہے، کرشن چندر ایسے موقعوں پر ہی زیادہ کامیاب ہے۔ کرشن چندر کے خیالات کردار کے اپنائے ہوئے ہوتے ہیں اور کہیں بھی اُن کی خارجیت محسوس نہیں ہوتی لیکن یہ جبر وہیں تک ہے جہاں کرشن چندر ... [illegible] نہیں ہے۔

"اُس نے سوچا اگر حکومت نہ ہو تو پھر کیا ہو، شاید انسانی سماج ایک جنگل بن جائے۔ کیا کوئی ایسی حکومت ہو سکتی ہے جو حکومت نہ ہو جو جبر پر قائم نہ ہو، جہاں دنیا کے آزاد انسان ایک دوسرے سے آزاد تعاون کر سکیں۔ جبر و استبداد کے بغیر۔ شاید یہ انسانی زندگی کی معراج ہو گی۔ شاید اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ہمیں اشتراکی رہگذر پر چلنا پڑے گا؟"

آخری جملہ کی خارجیت ظاہر ہے۔

کرشن چندر کے یہاں رومان اور واقعیت کا امتزاج ہے اور ہم پڑھتے وقت اپنے چاروں طرف ایک رومانی فضا محیط پاتے ہیں۔ ادق اور غیر دلچسپ بحث کے بعد ہم کو اُس کے یہاں بحث کا رومانی پہلو بھی ملتا ہے۔ وہ آزاد تسلسل کی رو میں ظاہرا

کبھی کبھی اس قسم کی رواجی باتیں کہہ جاتا ہے جو ایک جدت پسند مصنف کے لئے زیبا نہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو اُس کی تہ میں ہمیں کوئی خاص نکتہ پوشیدہ ملتا ہے اور اس لئے ہم اُسے [illegible] کہنے کے باوجود ناجائز قرار نہیں دے سکتے۔

آزاد تسلسل طنز اور ظرافت میں کرشن چندر نے اپنے لئے اُردو ادب میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے اور اُن کی ہر تصنیف میں یہ تمام چیزیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اُن کے اقتباسات ایک مضمون برداشت نہیں کر سکتا۔ "سکسس" اور "اَن داتا" میں اُس کا طنز سب سے زیادہ کامیاب ہے "اُردو کا نیا قاعدہ" بھی گو کہ طنز کی اچھی مثال ہے، لیکن اُس کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی عجلت میں لکھا گیا ہے کرشن چندر کا اپنا خاص طرز اُس میں زیادہ نمایاں نہیں۔

اگر ہنسنے کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسان کو ہنسی اُس وقت آتی ہے جب اُس کے احساسِ تناسب (sense of proportion) کو ٹھیس لگے مثلاً آپ ایک سات آٹھ برس کے بچے سے یہی اُمید کرتے ہیں کہ وہ اپنے قد کے مناسب لباس اور پاؤں کے لحاظ سے جوتا پہنے گا، لیکن اگر وہ اپنے باپ کے جوتے اور کپڑے پہن لے تو یقیناً آپ کے احساسِ تناسب کو ٹھیس لگے گی اور آپ ہنس دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دو اس قسم کی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں جو باوجود ایک معمولی مناسبت موجود ہونے کے ایک جگہ نہیں ہو سکتیں تو یہی اجتماع مزاح کا باعث ہوتا ہے اور اگر احساس کی شدت ہے تو مزاح و ظرافت طنز کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ظرافت اور طنز کی حدیں نہیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ طنز اور ظرافت دونوں کا مقصد اصلاح ہوتا ہے، لیکن ظرافت کسی بُری بات پر ہنس کر اس کی اصلاح کرنا چاہتی ہے اور طنز اُس چیز کے کمزور پہلوؤں پر ظرافت سے زیادہ شدید قسم کا حملہ کر کے اُس کی اصلاح کی خواہشمند ہے، مثلاً شہر میں ضروریاتِ زندگی کے ساتھ شراب اور افیون کے ٹھیکہ کا ذکر اور علی جو کی عادات بیان کرتے وقت اُس کے شراب پینے اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا یکجا ذکر ایک لطیف طنز ہے۔

"[illegible] تاکہ لوگوں کو اپنی آمد سے خبردار کر دے۔ اُس نے کانی سُن لیا تھا [illegible] میں یہ کروں گا، تم وہ کرو گی۔"

نتیجہ صاف ظاہر ہے حرامی بچے جنے گی اُلٹی کہیں کی۔"

"اور شیام رشتے میں ... اس لڑکی ہی کو لو
چمار اور برہمن کے امتزاج سے اما حسن بن گئی ہے۔ براہمنوں
کی خوبصورتی، نزاکت ... اور ... کی۔ چماری کی مضبوطی
شوخی حرارت اور عقل ... کرتی ہے سالی۔"

"سلسلے کا سب سے زیادہ دلچسپ کیریکٹر ڈاکٹر بام دیو ہے۔
ہسپتال کی سنجیدہ فضا میں اس کا وجود بہت ہی غنیمت ہے اس کا
ماں اور بہن کی گالی ("بہنچ" "مایچ") کا غیرارادی طور پر استعمال کرنا
بے اختیار ہنسا دیتا ہے۔

.... "ابھی لیجیے میں ابھی یہ سب کام ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ اس
سور کی ماں نے دودھ میں مکھن کا پیالا، کس طرح اس
کرنل جوان کا بہنچ قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے۔"

.... "اجی اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں بہنچ اس ماں یچ معاملہ
کو سلجھاتا ہوں۔ یہ لڑکی بھی ہے اور [illegible] بہنچ اس کے
رشتہ دار بھی رہیں۔ آپ بہنچ بالکل فکر نہ کریں"

شیام جس طرح اپنے دل سے آپ کو نفرت کرتا ہے وہ
اس کی تلخی اور درشت مزاجی کا اظہار کرتی ہے اور کرشن چندر
کے طنز کی اچھی مثال ہے۔

"تم نرے پاجی ہو۔ گدھے ہو، حلوائی کے کتے کی طرح بزدل
ہو تم ہمیشہ حلوائی کے کتے کی طرح اپنے خداوند کے
پیچھے بھاگتے ہوئے ٹباؤں ٹباؤں کرتے رہو گے اور تمہاری
زندگی اس کتے کی خارش زدہ کھال کی طرح ہو جائے گی۔
اس میں نہ چمک ہوگی، نہ خوبصورتی نہ بالوں کی ملائمت بلکہ
خون اور پیپ بہتی ہوئی، چچڑیاں اور مکھیاں بلبلاتی ہوئی
اور اس وقت تم ... سب سے پہلے [illegible] اور اپنی خارش زدہ
کھال کو اور بھی زخمی کر دو گے۔"

شدت احساس کس طرح طنز کا سرمایہ اخذ کر لیتا ہے ملاحظہ ہو۔

"شیام کا خون کھولنے لگا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس برہمن
کو جو اب سنسکرت کا شلوک پڑھ کر کس لیمپ کو آج سے
ہزاروں سال پہلے کی ایجاد سمجھتا تھا، گلے سے پکڑ کر اس کا
گلا اتنے زور سے گھونٹے کہ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل
آئیں اور اس کی چھوٹی زبان دانتوں سے باہر آجائے اور اس کا
سانس رکنے لگے اور وہ چلا چلا کر کہے مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔"

اور طنز کا Climax ——

"ونتی کا بیاہ ہو رہا تھا اور تحصیلدار صاحب نے مقدمہ خارج
کر دیا تھا۔ ماں باپ نے اپنے چہیتے بیٹے کو اپنی زندگی تباہ کرنے
سے بچا لیا تھا۔ سماج نے ایک اور فرد کو اپنی محفوظ چاردیواری
سے باہر بھٹکنے سے روک لیا تھا، تحصیلدار صاحب مسکرا رہے
تھے اور ان کی بیوی مسکرا رہی تھیں اور روشن مسکرا رہا تھا
اور مسٹر وپکشن مسکرا رہا تھا اور مسٹر وپکشن کی بیوی... ۔
ایک گوجر کی آغوش میں بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ الغرض
سارا سماج خوش تھا، مبارک ہیں ایسی شادیاں جن کے
ہونے سے سارے سماج پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے حتیٰ کہ
مکی کے لہلہاتے پودے بھی مسرت سے جھومنے لگتے ہیں۔"

کرشن چندر کو سماجی نکتوں کے بیان کرنے کا ملکہ ہے نفسیاتی
تحلیل میں Extrospection اور Introspection
دو طریقے ہیں جن کی رو سے ہم کسی شخص کی دماغی کیفیت کا اندازہ کر سکتے
ہیں۔ اضطراری فعل بھی انسان کی دماغی اور ذہنی کیفیت ظاہر کرنے
میں کافی اہمیت رکھتے ہیں اور کرشن چندر نے جہاں بھی اضطراری
افعال کا تذکرہ کیا ہے نفسیاتی حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔

"نہیں وہ یہاں کے تھانیدار ہیں۔ یار احمد خاں —— وہ بھی
آپ ہی کی طرح راستہ بھول کر ادھر آ نکلے تھے، جواب دیتے
دیتے اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور وہ زور زور
سے بھٹوں کو لکڑی سے پیٹنے لگی۔"

کیا جواب دیتے وقت لڑکی کے چہرے کا کانوں تک سرخ ہو جانا،
اور زور زور سے بھٹوں کو پیٹنا، نسائی شرم، اس کی ذہنی کشمکش
اور بے بسی و مجبوری کا اظہار نہیں کر رہا ہے —— ایک جگہ اور ——

"تم مجھے اپنا نام بتا دو۔ تم نہ بتاؤ گی تو میں تھانیدار
سے پوچھ لوں گا۔ "نوراں"۔ اس نے چھڑی کو ہوا میں
پھینکتے ہوئے کہا۔

کرشن چندر کشمیری زندگی سے اچھی طرح واقف ہے اور پس منظر
پیش کرنے میں اسے اپنے تجربہ کی گہرائی پر اعتماد ہے، اور یہ اعتماد
ہر موقع پر اس کی رہنمائی کرتا ہے کرداروں کی یاسیت، تمام امیدوں
کی موت اور وتی کی موت کے نغمہ کی جانگداز گونج میں شفتالو کے
درخت کی تنہائی ناول کے عروج (Climax) کو اور بھی شدید
بنا دیتی ہے۔

طاہر حسن صدیقی

حسنِ انتخاب

"صاحبزادے!" آباجان قبلہ نے اپنی پھدڑی ناک پر ٹنگی ہوئی اس عینک کو کسی قدر اونچا کرتے ہوئے کہا، جس کی ایک کمانی اپنی زندگی کی مقررہ مدت ختم کرنے کے بعد ٹوٹ چکی تھی۔ اور جسے لڑائی شروع ہو جانے کے باعث معمولی قیمت پر تبدیل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور جس کی جگہ ایک سیاہ فیتے نے لے رکھی تھی۔

"صاحبزادے!" انھوں نے اخبار پھینک کر دوبارہ مجھ مخاطب کرتے ہوئے اس طرح کہا گویا پہلی دفعہ ان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ میں نے سُنا ہی نہ تھا۔ حالانکہ میری قوتِ سماعت اس قدر سعادت مند ہے کہ وہ بلاشبہ آباجان قبلہ کی ان باتوں کو بھی سُن لیتی ہے جو دل سے لبوں تک آ کر رہ جاتی ہیں۔ اور جنھیں آباجان قبلہ کسی مصلحت کی بنا پر الفاظ کا جامہ نہیں پہناتے۔ ایسے موقعوں پر ان کے لبوں پر نمودار ہونے والی ایک قسم کی تھرتھری کو دیکھ کر عام لوگ یہ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اسے صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں گونگا یا بہرہ ہوں۔ کیونکہ عموماً ایسی صلاحیت گونگوں یا بہروں میں پائی جاتی ہے۔

"صاحبزادے! ذرا میرے قریب آ کر بیٹھو۔" آباجان قبلہ نے اسی ایک لفظ کو تیسری بار کہتے ہوئے جملہ پورا کر دیا۔ اور وہ بھی ایک ایسی ہدایت کے ساتھ جس کی تعمیل میں پہلے ہی کر چکا تھا کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ اگر اب ایمیل زولا کے ناول سے زیادہ دلچسپ آباجان قبلہ کی گفتگو نہ لی تو وہ ضرور مجھ پر برس پڑیں گے۔ اور اسی لئے میں صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے درمیان نشانی کے طور پر انگلی رکھ کر اُن کے قریب کھسک چکا تھا۔ ممکن ہے کوئی اس حقیقت کو باور نہ کرے اور مجھے جھٹلانے کے لئے کہے کہ صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے درمیان کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی جس میں اُنگلی رکھی جا سکے۔ کیونکہ وہ ایک ہی ورق کے دو رُخ ہوتے ہیں لیکن یہ حقیقت اس لئے ہے کہ کتاب محض حُسنِ اتفاق سے طاق کی بجائے جنت مہندسے سے شروع ہوئی تھی۔

"میں چند ہفتوں سے محسوس کر رہا ہوں۔" اب آباجان قبلہ نے ریڈیو کے اعلانچی کی طرح مسلسل بولنا شروع کر دیا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم جوان ہو گئے ہو۔ یا کم سے کم اپنے آپ کو جوان اور اس لائق سمجھنے لگے ہو کہ دوسری جنس کے ساتھ خوب گھُل مل کر نشست و برخاست کا سلسلہ روا رکھا جائے۔ میں ذاتی طور پر اس روش کو کتنا ہی بُرا سمجھوں لیکن تمہیں منع بھی نہیں کر سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری امی جان قبلہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور جو کام انھیں کرنا چاہئے تھا یعنی تمہارے لئے ایک شریکِ حیات کا انتخاب، وہ میرے بس کا نہیں۔ کوئی پانچ چھ ہفتے سے تمھارا میل جول کرنل صاحب کے خاندان والوں کے ساتھ، خدا کرنل صاحب کی رُوح کو نہ شرمائے، غیر معمولی طور پر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کا سبب جنسی کشش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تقاضائے عمر کے ماتحت تمہاری رگوں کا خون شراب بن چکا ہوگا اور اب اس کی، شرابِ کی کیفیتِ سکر کو، ئل بہ اعتدال رکھنے کیلئے جمالِ ہمنشیں سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کی ضرورت فطرۃً محسوس ہو رہی ہوگی۔ کرنل صاحب کی بیوہ پر، خدا کرنل صاحب کی رُوح کو نہ شرمائے، محفل میں ہر چہار جانب سے انگلیاں اٹھتی ہیں۔ حالانکہ تمہاری ذاتی رائے یہی ہوگی کہ وہ بہت ہی نیک و پارسا ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیوہ ہونے کے بعد سے انھوں نے زمانہ کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے پردہ کو خیرباد کہا۔ اور کھلے بندوں چراغِ خانہ کی بجائے شمعِ محفل بننے لگیں۔ اور عورتوں سے زیادہ غیر مردوں اور خصوصاً کرنل صاحب کے دوستوں کے ساتھ، خدا کرنل صاحب کی رُوح کو نہ شرمائے، ان کے تفریحی مشاغل بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ اب وہ صحبتِ ہم جنس سے بڑی حد تک متنفر ہیں۔ پینتیس سال کی ادھیڑ عورت ہونے کے باوجود وہ سُرخی اور غازے کے طفیل ایک جوان حسینہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے محفل میں، خدا کرنل صاحب کی رُوح کو نہ شرمائے، ہر شخص ان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ لیکن شاید وہ موردِ الزام نہیں کیونکہ تم یہی کہو گے کہ اگر تاکستان میں انگور کی

بیلوں کے پاس سے گذرنے والی ہر لومڑی اُچک اُچک کر ایک خوشہ جھپٹ لینا چاہے تو بیزیب انگوروں کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ اب رہیں کرنل صاحب کی لڑکیاں، خدا کرنل صاحب کی روح کو نہ شرمائے سو وہ تینوں تو صحیح معنوں میں حسین اور نوجوان ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم ابھی تینوں میں سے ایک کے گرویدہ ہو گئے ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ ان تینوں نے بیک وقت تمہارا دل موہ لیا ہے۔ تاہم تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تین حقیقی بہنوں میں سے شادی کیلئے ایک وقت میں صرف ایک ہی بہن کو پسند کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری اس گرویدگی کا اصل سبب میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں ممکن ہے کہ روپے پیسے کا لالچ ہو۔ کیونکہ عام طور پر سب کو یہی معلوم ہے کہ کرنل صاحب کی عظیم الشان جائداد، خدا کرنل صاحب کی روح کو نہ شرمائے، اُن کی زندگی ہی میں ایک کثیر رقم کے عوض کسی مہاجن کے پاس رہن رکھ دی گئی تھی۔ جو مول بیاج مل کر اب تک برابر ہو چکی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عظیم الشان جائداد کی کشش بھی گرویدگی کا ایک سبب بن سکتی ہے۔ اگر تم نے کرنل صاحب کی لڑکیوں کے ساتھ، خدا کرنل صاحب کی روح کو نہ شرمائے، اس قدر ربط ضبط پیدا نہ کر لیا ہوتا تو میں رائے دیتا کہ اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کرو جو تنہا ان تینوں کی مجموعی حیثیت کے مقابلہ میں بہتر رہ سکتی ہے۔ لیکن بصورت موجودہ اعتراض تو کیا معمولی مشورہ بھی نہیں دے سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ انڈے جو صحیح وقت پر مُرغی کے نیچے نہ بٹھائے جائیں عموماً گندے ہو جاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ کرنل صاحب کی بیوہ رشیدہ بیگم صاحبہ سے، خدا کرنل صاحب کی روح کو نہ شرمائے، آج ہی کسی وقت ملو اور مناسب الفاظ میں اُن کے سامنے رشتے کی تجویز پیش کر دو۔ اس سلسلے میں بات چیت کرنے کیلئے میری ضرورت ہی کیا ہے۔ تم بہت کافی ہو، تم نعیمہ، نسیمہ یا سلیمہ میں سے کسی ایک کو اپنی مرضی کے مطابق پسند کر سکتے ہو۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟"

آبا جان قبلہ کی اس تمام قیاسی گفتگو کو سُننے کے بعد میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت مجھ میں پیدا نہ ہو سکی اور صرف اس قدر کہہ سکا:

"جی ہاں ٹھیک ہے۔"

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ایمیلی زولا کے اس ناول کو جسے صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے کسی نا تمام جملہ تک پڑھ چکا تھا بغل میں دبا کر اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا۔ بشرطیکہ اسے مطالعہ کا کمرہ کہا جا سکے۔ کیونکہ پڑھنا لکھنا ہی نہیں بلکہ کھانا کھانے اور سونے کے علاوہ میں اس کمرے کی دہلیز کے نیچے چوہوں کی عنایت سے خود بخود بن جانے والی موری کے قریب گرم پانی کا تسلا رکھ کر غسل بھی کر لیتا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ایک دم آدمی سے فلسفی بن گیا۔ کیونکہ ایک ایسے مسئلے پر غور کرنا تھا جس کی اصلیت اس وقت تک کچھ نہیں تھی۔ آبا جان قبلہ کی یہ ہمیشہ سے عادت تھی کہ وہ عام واقعات پر ایک ایسے زاویے سے نظر ڈالتے جس کے دونوں بازو دائرۂ حیات کے ۳۶۰ درجوں سے بالکل الگ اپنا وجود قائم کرتے تھے۔ امکان تو بڑی چیز ہے، جہاں صرف شبہ کی گنجائش ہو سکتی، وہ یقین کا رنگ بھر لیتے۔ اور عموماً اس پر اصرار کیا کرتے تھے۔

میں بوسیدہ تو شک پر پڑی ہوئی میلی چادر کی سلوٹیں درست کرنے کے بعد ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور ایمیلی زولا کے ناول کا صفحہ ۲۸۱ یا ۲۸۲ ختم کرنے کی بجائے میری اسٹوپ کی وہ کتاب پڑھنے لگا جس میں فاضل مصنفہ نے ازدواجی زندگی کے عملی اسرار و رموز کو محض علمی طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کافی صفحے پڑھ لینے کے باوجود میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ وہ کتاب دراصل ان لوگوں کیلئے مفید ہو سکتی ہے جو شادی کر چکے ہوں۔ اور مجھے فی الوقت شادی کے اس ارادے پر غور کرنا تھا جس کی اصلیت و نوعیت مجھ سے زیادہ میرے آبا جان قبلہ سمجھ گئے تھے۔ اور میں ان کے سمجھ جانے کے بعد بھی پوری طرح نہ سمجھ سکا تھا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مجھے خاص اس لمحہ تک کرنل صاحب کی بیوہ یا اُن کی تینوں لڑکیوں سے انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ درحقیقت ان چاروں میں سے کسی کو میری ذات سے کسی قسم کی دلچسپی تھی۔ بلکہ ان کے بن بلائے میرے وہاں چلے جانے کو ایک حد تک ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب میں دہلیز لانگ کر صحن میں قدم رکھتا تو کبھی کرنل صاحب کی بیوہ بذاتِ خود اور کبھی ان کی کوئی لڑکی بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتی۔ اور پھر جلدی ہی وہ سب کی سب میرے وجود کو اپنے مکان کی چار دیواری میں بالکل بھول کر اپنے اپنے کام میں اس طرح مصروف ہو جاتیں گویا میں غیرمرئی ہو جانے کے باعث اُن کو نظر ہی نہیں آ رہا۔ لیکن ان کی یہ

وضعداری درحقیقت میرے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس طرح اُن کتابوں کو چُرا لینا میرے لئے ممکن ہو جاتا جو اُن کیلئے غیر اہم لیکن میرے لئے کارآمد تھیں۔

کرنل صاحب نے اپنی زندگی میں تین لڑکیاں پیدا کرنے کے علاوہ بہت سی کتابیں اور ڈاک کے بیشمار استعمال شدہ ٹکٹ جمع کئے تھے۔ ٹکٹ کیا ہوئے؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ البتہ کتابیں کافی عرصے تک ہزار بارہ سو سٹرانی کیڑوں کے رحم وکرم پر رہنے کے بعد صرف مجھ جیسے انسانی کیڑے کے رحم وکرم پر ایک الماری میں برائے نام بند تھیں۔ میں اچھی طرح ورق گردانی کر لینے کے بعد کسی کتاب کی بابت جب یہ رائے قائم کر لیتا کہ یہ "داشتہ آید بکار" ثابت ہو سکے گی۔ تو اسے فوراً اپنے اوورکوٹ کی جیب میں چھپا کر لے آتا۔ اس اوورکوٹ کی جیب میں جسے میں موسمی اعتبار سے ضرورت نہ ہونے کے باوجود محض مصلحتاً پہننے کا عادی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایمیل زولا کا وہ ناول جسے میں آباجان قبلہ کی گفتگو شروع ہونے سے قبل صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے درمیان کسی ناتمام جملے تک پڑھ چکا تھا اور میری اسٹوپ کی وہ کتاب جو آباجان قبلہ کی گفتگو ختم ہونے کے بعد پڑھنے کی نیت سے اٹھالی تھی، وہیں سے دستِ تصرف کے ذریعے لائی گئی تھی۔ غرض یہ کہ میں تو وہاں کتابیں چُرانے جاتا، اور آباجان قبلہ یہ سمجھ گئے کہ میں کسی سے دل لگانے جاتا ہوں۔

کرنل صاحب کی لڑکیوں میں پوری جاذبیت نہیں تھی، یا کم سے کم میرے نقطۂ نظر سے وہ معیاری نمونہ نہیں تھی۔ ایک کے خدوخال اگر اچھے تھے تو قدوقامت اور اعضا کی موزونیت میں نقص تھا۔ دوسری کے اعضا کی موزونیت اور قدوقامت میں کوئی خرابی نہیں تھی تو عادات واطوار قابل اعتراض تھے۔ تیسری کے عادات واطوار ٹھیک تھے تو وہ ہنر اور سلیقہ سے بے بہرہ تھی۔ اسی لئے شریک حیات بنانے کے خیال سے میں نے کبھی ان کی بابت غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب غور کرنا ہی پڑ گیا اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ سوچتے سوچتے شام ہو گئی۔ اور پھر بھی میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

شام کے وقت میں نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بالکل بادلِ ناخواستہ اوورکوٹ پہنا اور کرنل صاحب کی حویلی کا رُخ کیا۔ خیال کیا معنی مصمم ارادہ تھا کہ جیمز کا وہ ناول اُٹھا لاؤں گا جو ایک روز قبل اوورکوٹ کی جیبوں میں جگہ نہ ہونے کے باعث نہیں لا سکا تھا۔ لیکن جب دہلیز لانگ کر میں نے صحن میں قدم رکھا تو کرنل صاحب کی بیوہ نے بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کمرۂ ملاقات کی طرف چلنے کیلئے کہا۔ کمرۂ ملاقات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ وہاں اعلیٰ قسم کے رہن رکھے ہوئے ساز وسامان کے سوا کوئی معقول کتاب یا عمدہ رسالہ نہیں مل سکتا تھا۔

کرنل صاحب کی بیوہ رشیدہ بیگم صاحبہ صوفے پر میرے قریب ہی بیٹھ گئیں اور کسی تمہید کے بغیر بولیں:

"میں نے بہت دن سے تمہارے دل کا بھید معلوم کر رکھا ہے۔ تم کتابیں پڑھنے کیلئے یہاں آتے ہو۔ اور چھپ چھپ کر میری لڑکیوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہو۔ اتنی گہری نظر سے جو عورت کے دل میں خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ تمہارے اس رویّہ سے ان پر بھی کوئی اثر ہو گیا ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ پاس پڑوس والے محض ذاتی قیاس آرائیوں سے کام لیکر شوشے کا بھالا بناتے ہوئے کوئی افواہ پھیلائیں اور خواہ مخواہ جگ ہنسائی کی نوبت آئے۔ اس لئے وقت سے پہلے اس کا سدِّباب ضروری ہے۔ اور اس کی مناسب ترکیب یہی ہے کہ تم تینوں میں سے میری کسی ایک لڑکی کو پسند کر کے شادی کر لو۔ اگر آپس کا میل جول اتنا نہ بڑھ چکا ہوتا تو میں تم کو اپنا داماد بنانا کبھی گوارا نہ کرتی۔ کیونکہ ہم لوگ سید ہیں اور پٹھانوں کے ہاں اپنی لڑکیوں کا رشتہ پسند نہیں کرتے۔ تاہم تمہاری پُرخلوص محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ایسا کر گذروں۔ میں چاہتی ہوں کہ رسم کی ادائیگی بہت جلد ہو جائے۔ نہ تمہارے والد صاحب کسی قسم کے جھنجٹ میں پھنسیں اور نہ میں جہیز کے سلسلہ میں کوئی دردِ سری مول لوں۔ تحصیلدار صاحب سے کہہ دینا کہ جو کچھ بہو کو دینا ہو نقدی کی صورت میں دیدیں۔ میں اُس کو قبول کر لونگی۔ غالباً ان کی تمام جائداد تمہارے نام ہبہ ہو چکی ہوگی۔ اور ہاں مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لے دے کے تم ہی ان کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ظاہر ہے کہ آج نہیں تو کل یہ ضروری کارروائی ہو جائے گی۔ بس اب جاؤ اور بہت جلد اپنے والد صاحب کو یہ خوشخبری سُنا دو۔ غالباً انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ فوراً اس تجویز کو منظور کر لیں گے۔ آج جمعہ کا

مبارک دن دیکھ کر میں نے یہ گفتگو کی ہے۔ کل تمھارے والد صاحب اگر یہاں آکر صبح کی چائے پئیں اور رسمی طور پر نکاح کی تاریخ منظور کرلیں تو اچھا ہے۔ اتوار کی شام کو میں یہ رسم ادا کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری سب سے بڑی لڑکی نہایت حسین اور سمجھدار ہے اسے شریکِ حیات بنانا تمہارے لئے باعثِ فخر رہے گا۔"

میں رشیدہ صاحبہ کی تمام گفتگو سن کر نہ تو پریشان ہوا اور نہ متعجب۔ کیونکہ چند گھنٹے پیشتر میرے دماغ پر اسی قسم کا اچانک حملہ ابا جان قبلہ کی طرف سے ہوا تھا جس نے مجھے بالکل زچ کر دیا تھا۔ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ دونوں کے ہم آہنگ قیاسات نے محض چند گھنٹے کے وقفے سے ایک ہی دن الفاظ کی صورت اختیار کی اور وہ بھی مکمل یقین و اعتماد کے ساتھ۔ اس لئے وہاں بھی میرے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم میں دل ہی دل میں اس بات پر ہنسا کہ خیر میرے ابا جان قبلہ کو تو کرنل صاحب کی عظیم الشان جائداد کے رہن ہونیکا تھوڑا بہت علم ہے لیکن رشیدہ صاحبہ ہماری موروثی جاگیر کے قرق ہونے سے بالکل بے خبر ہیں۔ اگر ابا جان قبلہ حکم امتناعی نہ نکلواتے تو وارنٹ قرقی کی تعمیل بھی ہو چکی ہوتی۔ اور ہم کرایہ کے مکان میں رہتے ہوتے۔

رشیدہ صاحبہ نے جب اس معاملہ میں میری ذاتی رائے کی بابت کئی بار استفسار کیا تو مجبوراً کہنا پڑا:۔

"خالہ جان! سچ بات یہ ہے کہ ابھی شادی کرنے کا میرا ارادہ نہ تھا۔ تاہم آپ مُصر ہیں تو میں ابا جان قبلہ سے عرض کروں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ وہ صبح کی چائے آپ ہی کے دولتکدے پر آکر پئیں اور نکاح کی تاریخ مقرر کرلیں۔ مجھے آپ کی منجھلی لڑکی نسیمہ بہت پسند ہے۔ کیونکہ وہ اپنی دونوں بہنوں کے مقابلے میں زیادہ حسین ہونے کے علاوہ زیادہ سمجھدار بھی معلوم ہوتی ہے۔ نعیمہ میں بظاہر کوئی نقص نہیں ہے لیکن فی الحال میں اسے پسند نہیں کر سکتا۔"

"نہیں برخوردار!" وہ مربیانہ طور پر بولیں "تمھارا خیال بالکل غلط ہے۔ نسیمہ کی نسبت نعیمہ لاکھ درجہ بہتر ہے۔ تم اس کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت جان لوگے۔ اور یوں بھی ذرا سوچو تو سہی کہ میں بڑی لڑکی کو چھوڑ کر پہلے منجھلی کی شادی کس طرح کر سکتی ہوں۔ چھوٹی بہن کی شادی ہو جانے کے بعد بڑی بہن کے لئے رشتہ ملنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

بات بالکل معقول تھی۔ لہٰذا میں نے حامی بھر لی کہ منجھلی کی بجائے بڑی لڑکی ہی سے شادی کرلوں گا۔

جب میں گھر پہونچا تو ابا جان قبلہ ایمیل زولا کے اس ناول کا مطالعہ کر رہے تھے جسے میں صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے درمیان کسی ناتمام جملہ تک پڑھ چکا تھا۔ میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ وہ ناول اس قابل نہیں تھا کہ بزرگوار قسم کے لوگ اس کو پڑھیں۔ اس کا مطالعہ مجھ ہی جیسی نوجوان طبیعتوں کیلئے موزوں ہو سکتا تھا۔ لیکن خیر، میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔

"ابا جان قبلہ! میں آپ کے حکم کے بموجب کرنل صاحب کی بیوہ سے ملا اور شادی کی تجویز پیش کر دی۔ انھوں نے آپکی رائے کو بہت پسند کیا۔ وہ اپنی منجھلی لڑکی کی شادی ابھی کرنی نہیں چاہتیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ پھر بڑی کے لئے رشتہ ملنا دشوار ہو جائے گا۔ مجھے نسیمہ پسند تھی لیکن خیر نعیمہ بھی کچھ بُری نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ کل صبح کی چائے آپ اُن کے گھر پر پئیں اور نکاح کی تاریخ مقرر کرلیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ لین دین کی اُلجھنوں میں پھنسنا ٹھیک نہیں۔ آپ جو کچھ بہو کو دینا چاہیں نقدی کی صورت میں عطا فرما دیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کل گفتگو ہونے کے بعد پرسوں اتوار کی صبح شادی کی رسم ادا ہو جائے۔"

"تم تو نرے گاؤدی نکلے۔" ابا جان قبلہ نے اپنی پھدّی ناک پر لگی ہوئی اس عینک کو کسی قدر اونچا کرتے ہوئے کہا، جس کی ایک کمانی اپنی زندگی کی مقررہ مدّت ختم کرنے کے بعد ٹوٹ چکی تھی اور جسے لڑائی شروع ہو جانے کے باعث معقول قیمت پر تبدیل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور جس کی جگہ ایک سیاہ فیتے نے لے رکھی تھی۔ "اس کے یہ معنی ہوئے کہ تم میری گفتگو کا مطلب سمجھے ہی نہیں۔ اس میں شروع سے آخر تک زبردست طنز تھا۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ کرنل صاحب کی بیوہ، خدا کرنل صاحب کی رُوح کو نہ شرمائے، سوسائٹی میں کافی بدنام ہیں۔ لڑکیوں نے بھی ماں کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے ان میں سے ایک

بھی اچھی بیوی بننے کے لائق نہیں ہے۔ پھر تمام جائداد قرض میں برابر ہو چکی ہے۔ اب اُن کے امیرانہ ٹھاٹ خالی ڈھول کی طرح اندر سے خالی ہیں۔ لہٰذا کرنل صاحب کی بیوہ کے پاس، خدا کرنل صاحب کی روح کو نہ شرمائے، بیٹیوں کو جہیز دینے کے لئے رکھا کیا ہے۔ لیکن خیر، ہماری جائداد بھی قرق ہو جانے کے قریب ہے۔ اور اس اعتبار سے ہم اور وہ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ میں با دل ناخواستہ سہی لیکن تمہاری خاطر سے کل صبح وہاں جاؤں گا تم بھی میرے ہمراہ چلنا۔ معاملہ کی گفتگو کر لی جائے گی، کیونکہ جب تجویز پیش ہو چکی ہو تو اپنی طرف سے انکار مناسب نہیں ہو سکتا۔"

اس اثناء میں آباجان قبلہ نے ایملی زولا کا ناول میز پر رکھ کر اخبار اٹھا لیا تھا۔ لہٰذا میں اس موقع کو غنیمت جان کتاب ہاتھ میں لئے اپنے کمرے میں چلا گیا تا کہ صفحہ ۲۸۱ اور صفحہ ۲۸۲ کے درمیان نا تمام جملے کو مکمل کر کے آگے پڑھنے لگوں۔ مگر اس فکر میں ڈوبا رہا کہ آباجان قبلہ کی یہ گفتگو بھی کہیں مبہم اور ذو معنی نہ ہو۔ اور وہاں ساتھ چلنے کا مطلب یہ نہ ہو کہ میں بھی اس جگہ جا نازک کر دوں۔ چنانچہ میں اسی سوچ بچار میں نہ تو نا تمام جملے کو مکمل کر سکا اور نہ میری آسٹوپ کی وہ کتاب پڑھ سکا جس میں قابل مصنف نے ازدواجی زندگی کے اسرار و رموز کو محض علمی طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور جو میرے خیال کے مطابق صرف ان لوگوں کیلئے مفید ہو سکتی ہے جو شادی کر چکے ہوں۔

دوسرے روز علی الصبح جب آباجان قبلہ نے کرنل صاحب کے گھر چلنے کیلئے مجھ سے کہا تو شبہ کی تمام حدیں ختم ہو کر یقین کی صورت پیدا ہوئی کہ ان کی گفتگو کا مطلب وہی تھا جو اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ان کے ہمراہ چل پڑا۔

رشیدہ صاحبہ اور ان کی تینوں لڑکیاں ہم دونوں کی منتظر تھیں، لیکن انھوں نے ناشتہ کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر نہیں کیا تھا۔ بس چائے، مکھن کے معمولی توس اور قلیل مقدار میں گاجر کا حلوا۔ میرا خیال تھا کہ دو چار قسم کے پھل اور کیک وغیرہ ضرور ہونگے لیکن بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔

میز پر ہم سب لوگ اس طرح بیٹھے کہ ایک طرف مجھلی اور بڑی لڑکی کے درمیان آباجان قبلہ اور دوسری طرف میرے اور اپنی چھوٹی بیٹی کے درمیان کرنل صاحب کی بیوہ رونق افروز ہوئیں۔ میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے رشیدہ صاحبہ نے چائے بنا کر دینی شروع کی۔ اور آباجان قبلہ نظروں ہی نظروں میں تینوں لڑکیوں کا جائزہ لینے لگے۔

اس وقت پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ وہ تینوں لڑکیاں حد درجہ بھوہڑ، بدسلیقہ، بدتمیز ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں ان کی ماں کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ آباجان قبلہ کی نظریں سب سے پہلے سلیمہ یعنی چھوٹی لڑکی پر جمیں کیونکہ وہ بڑی حد تک اُن کے سامنے ہی تھی۔ پھر انھوں نے کنکھیوں سے بائیں طرف اپنی مجھلی لڑکی کو دیکھا۔ پھر ہنس کر دو چار باتیں کیں اور آخر میں نعیمہ کی طرف ڈھل گئے۔ رشیدہ صاحبہ نے مجھے باتوں میں لگا لیا تھا اس لئے میں آباجان قبلہ کی گفتگو بالکل نہ سُن سکا۔ ورنہ وہ بھی وہ بالکل رازدارانہ طور پر بات چیت کر رہے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے تک دو دو کی ٹکڑی میں تین جوڑیاں آپس میں اس طرح بات چیت کرتی رہیں جیسے ریڈیو کے تین ٹرانسمیٹر چھوٹی بڑی لہروں پر بیک وقت کام کر رہے ہوں۔ آخر کار مجھے اور تینوں لڑکیوں کو میز پر سے اُٹھا دیا گیا تا کہ دونوں ذمہ دار ہستیاں فیصلہ کُن بات چیت کر لیں۔ میں تو سیدھا کتب خانے کی طرف گیا اور وہ تینوں باغیچہ میں ٹہلنے کیلئے چل دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب ایک مہین حروف میں چھپی ہوئی کتاب کا جائزہ لینے کے لئے میں کھڑکی کے قریب صاف روشنی میں گیا تو میں نے دیکھا کہ دونوں چھوٹی بہنیں نعیمہ کو چھیڑ رہی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ آباجان قبلہ نے اس کو بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے نعیمہ کو ایک گہری نظر سے دیکھا اور سوچا کہ کل یہ میری شریک حیات بن جائیگی۔ لیکن جب اپنے گھر پہنچ کر میں نے دریافت کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آباجان قبلہ نے نعیمہ کو منتخب تو ضرور کیا لیکن میری بجائے اپنے لئے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے مخالفت کرتے ہوئے آباجان قبلہ کو اس نازک مسئلے پر بحث کی مگر وہ کسی عنوان نہ مانے۔ آخر مجھے زچ ہو کر یہ کہنا پڑا کہ اگر آپ نعیمہ سے جو تقاضائے عمر کے لحاظ سے آپ کیلئے کسی طرح موزوں نہیں ہے شادی کر لیں گے تو میں بھی اُسکی ماں رشیدہ سے شادی کر لوں گا۔

آباجان قبلہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ رشیدہ نے بھی میری تجویز فوراً قبول کر لی نتیجہ یہ کہ محض ایک ...

پسِ پردہ

رات آدھی ہونے پر راحیل نے آنکھیں کھولیں، اور تھوڑی دیر تک کمرہ کی چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد بند کرلیں۔ پھر ایک گہرا اور ٹوٹتا ہوا ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور ایسی آواز میں جس سے شدید تشنگی کا اظہار ہوتا تھا کہا۔

"صبح کی دیوی کا جلوس، وادی کے کنارے تک پہونچ گیا ہے، اب مجھے اس سے ملنے جانا چاہیئے"

یہ سُن کر پادری اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ مُردے کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا، اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ مُردے کے دل کی حرکت زمانہ کی طرح خاموش تھی۔

پادری نے اپنا سر جھکایا اور اس کے ہونٹ مُرتعش ہوئے۔ گویا اپنی زبان سے ایک مقدس کلمہ ادا کرنا چاہتا ہے جیسے رات کے سائے، اُن سنسان وادیوں میں دُہرائیں۔

اب اُس نے دونوں کلائیوں سے اپنے سینے پر صلیب بنائی اور اُس شخص کی طرف متوجہ ہوکر جو اسی کمرے کے ایک تاریک گوشے میں بیٹھا تھا، شفقت و مہربانی کے لہجے میں کہنے لگا:۔

"افسوس! تمہاری بیوی اللہ کو پیاری ہوئی، اٹھو، اور میرے ساتھ اس کی بخشش کے لئے دعا مانگو"

اس شخص نے اپنا سر اٹھایا، اُس کا چہرہ دفورِ ملال کر متغیر ہوگیا تھا۔ اور آنکھیں شدتِ الم سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور پادری کے پہلو میں بیٹھ کر مرنے والی کیلئے دعائے مغفرت کرنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ بار بار اپنے سینے اور چہرے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔

پادری اٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا:

"اب تم دوسرے کمرے میں جاؤ کیونکہ تمہیں نیند اور آرام کی سخت ضرورت ہے"

وہ بغیر کچھ کہے سُنے اٹھا۔ اور سامنے والے کمرے میں جاکر ایک چھوٹے سے صوفے پر گر گیا۔ غم، بیداری اور انتظار نے اس کے جسم کو بے جان کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ نیند اس کی آنکھوں پر غالب آگئی اور وہ سوگیا۔ جس طرح ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کے آغوش میں سوتا ہے۔

لیکن پادری ابھی تک اسی کمرے کے وسط میں رنج و ملال کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ وہ بیک وقت اشک آلود نگاہوں سے راحیل کی لاش کو بھی دیکھ رہا تھا اور اس کے شوہر کو بھی، جو سامنے والے کمرے میں غافل پڑا سو رہا تھا۔

ایک گھنٹہ گذر گیا، جو زمانہ سے زیادہ طویل اور موت سے زیادہ ہولناک تھا، مگر پادری سوئے ہوئے مرد اور سوئی ہوئی عورت کے درمیان اسی طرح کھڑا رہا۔ مرد، جو کھیت کی نیند سو رہا تھا اور بہار کی آمد آمد کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور عورت۔ جو گذرے ہوئے زمانہ کے ساتھ سو رہی تھی اور ابدیت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

اب پادری مُردہ کی چارپائی کے قریب آیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ جس طرح عبادت گذار قرباں گاہ کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ اس نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہونٹوں سے لگایا۔ اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگا جس پر موت کی نقاب پڑی تھی۔ رات کی طرح پُر سکون، سمندر کی طرح گہری اور انسانی آرزوؤں کی طرح لرزتی کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

"راحیل! میری دینی بیٹی راحیل!! میری بات سُن، کیونکہ میں اس وقت گفتگو کرنے پر قادر ہوں۔ موت نے میرے لب وا کر دیئے ہیں تاکہ میں تجھ پر وہ راز منکشف کر دوں جو خود موت سے بھی گہرا ہے۔ اور غم نے میری زبان کے تالے کھول دیئے ہیں تاکہ میں تجھ پر وہ راز ظاہر کردوں جو خود غم سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اے زمین اور لامحدود فضا کے درمیان پرواز کرنے والی روح! میری روح کی پکار سُن اور اس نوجوان

کی پکارِشن رپو کھیت سے واپس آتے ہوئے، مجھے دیکھتا تھا تو تیری خوشِ صورت سے متاثر و مرعوب ہو کر درختوں میں چھپ جاتا تھا۔ اس پادری کی پکارِشن جو اُس خدا کا عبادت گذار ہے جس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے مجھے بلالیا اور تو اس کے سایہ میں پہنچ گئی۔"

آہستہ آہستہ یہ الفاظ کہہ کر وہ لاش پر جھک گیا۔ اور اس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کے بوسے لینے لگا۔ طویل، گرم اور خاموش بوسے — وہ مقدس بوسے جو اس کی روح کے اُن تمام اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے جن کا تعلق محبت اور غم سے تھا۔

اچانک وہ پیچھے ہٹا اور خزاں زدہ پتّوں کی مانند زمین پر گر پڑا۔ گویا راحیل کے برفانی چہرے کے لمس نے، جذبہ ندامت کو، اس کے باطن میں بیدار کر دیا تھا۔

وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دوزانو بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں اس نے کہنا شروع کیا:

"یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!! کیونکہ میں آخر وقت تک ثابت قدم نہ رہا اور ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ راز جو سات برس تک زندگی نے میری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا، موت نے اُسے ایک لمحہ میں مجھ پر واضح کر دیا۔ یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!!"

وہ اسی طرح روتا پیٹتا اور دائیں بائیں سر پٹکتا رہا۔ وہ راحیل کے مُردہ جسم کی طرف جان بوجھ کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کے اسرار النفسانی اُس کی رُوح کو پامال نہ کر دیں۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس نے ان مادّی نقوش پر اپنی گلابی چادر ڈال دی۔ جنہیں محبت، مذہب، زندگی اور موت نے بنایا تھا۔

(جبران خلیل جبران) ——— حبیب اشعر

لکھنؤ اور سرشار

اقبالؔ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت وہی عظمت ہے وہی شانِ دل آویزی

شوکت و عظمت کی ان بلندیوں تک تو لکھنؤ نہیں پہونچ سکا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس کا ذکر مدتوں دہلی کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اور دنیا کی زبان پر یہ چیز ایک عرصہ تک جاری چلی آئی کہ ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک دہلی اور دوسری لکھنؤ۔

نواب شجاع الدولہ سے پہلے لکھنؤ ایک معمولی بستی کی صورت میں تھا۔ گو روایتاً یہ بات بھی کہی جاتی ہے اور شررؔ نے بھی اسے بیان کیا ہے کہ لکھنؤ رام چندر جی اور لچھمن جی کے تاریخی عہد سے آباد چلا آتا ہے اور اس طرح ایک کلاسیکل حیثیت رکھتا ہے مگر تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ روایتی داستانیں تاریخی نقطۂ نظر سے ہمیشہ صحیح نہیں ہوا کرتیں۔

لکھنؤ کی شہرت و عظمت تمامتر شاہانِ اودھ کی مرہونِ منت ہے۔ جن کے شاہانہ تزک و احتشام اور رنگین مزاجیوں نے اسے تاریخی اہمیت کے ساتھ افسانوی شہرت بھی عطا کی لیکن لکھنؤ ایک عرصے تک ہندوستان کا مرکز بن کر رہا۔ لکھنؤ کے نوابوں کی فیاضیوں نے عوام کے دلوں میں عجیب عجیب وہم و اعتقاد پیدا کر دیئے۔ اس کی افسانوی شہرت اس کی تاریخی اہمیت پر غالب آگئی۔ اور تاریخِ لکھنؤ کہانیوں کے دھوئیں میں گم ہو گیا —
نوابوں کے اس لکھنؤ کی تاریخ دو جملوں میں بیان کی جاسکتی ہے۔ شجاع الدولہ نے اس کو ایک معمولی بستی سے ترقی دیکر شہر بنایا۔ آصف الدولہ نے اس کے حسن میں نکھار پیدا کیا۔ اور واجد علی شاہ نے اس نکھار کو دو آتشہ کر دیا۔

اس رومانوی لکھنؤ کی جس سرعت کے ساتھ اس کی تکمیل ہوئی تھی اسی سرعت کے ساتھ بلکہ چشم زدن میں اس کا زوال ہو گیا۔ واجد علی شاہ کی معزولی نے بساطِ سلطنت کو الٹ دیا۔ رومانوی زندگی کی رنگینیاں آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئیں۔ اور لکھنؤ کی فضا میں افسانوی کیفیتوں کے بجائے دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ گو کچھ دنوں تک مٹیا برج کلکتہ میں اس رنگین زندگی کے آثار نظر آتے رہے۔ مگر وہ چراغِ سحری کی خفیف سی بھڑک تھی۔ ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

البتہ اس کا افسانہ بڑے بوڑھوں کی زبان پر کہانی بن کر رہ گیا اور اب تک ہے۔

نوابی لکھنؤ کا حال اس زبردست عمارت کا سا ہوا جس کا مسالہ بہت اعلیٰ درجہ کا تھا لیکن ناتجربہ کاری کے باعث سے بہت جلدی اور بے توجہی کے ساتھ بنایا گیا جس سے اس میں بنیادی خامیاں رہ گئیں۔ گو اوپری رکھ رکھاؤ کو اچھی طرح نبھا دیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس میں موسم کی تبدیلیوں کے اثر سے دراڑوں کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے جو بالکل لازمی چیز تھی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کی ساری عمارت مٹی کا تودہ بن کر رہ گئی۔

ماضی و حال

نوابی لکھنؤ کے مقابلہ میں آجکل کا لکھنؤ ایک خشک اور بے کیف سی چیز ہے۔ جہاں اگر اسی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو انسانی زندگی اپنے بھدّے نقش و نگار اور مادی کثافتوں کے بوجھ سے دب کر رہ گئی ہے۔ جہاں فضا میں رومان کی شاعرانہ کیفیتوں کے بجائے ٹریفک کی چیخ و پکار، انقلاب کے نعروں، ملوں، مشینوں اور کارخانہ کی سیٹیوں، موٹروں کے ہارن اور ریل گاڑی کے دھوئیں کے سوا کچھ بھی نہیں! وہ لکھنؤ فتنہ و فساد کے ہنگاموں سے گونجنے والا آگ اور خون کا سمندر نہیں تھا۔ اس میں نہ کونسل تھی، نہ اسمبلیاں، نہ مجالس قانون ساز تھیں نہ مختلف پارٹیوں کے ایک دوسرے سے دست و گریباں نمائندے، نہ ووٹر تھے نہ امیدوار، نہ الیکشن کے ہنگامے تھے اور نہ لاٹھی چارج، نہ مذہبی اختلافات کی زہرناکی تھی اور نہ سیاسی نظریوں کا خلفشار ۔ ۔ ۔ بلکہ وہ نوابی لکھنؤ تھا جہاں ہندو کو مسلمان اور مسلمان کو ہندو کے مذہب سے غرض نہ تھی۔ سب مل جل کر رہتے تھے جہاں لوگ بقدرِ حیثیت ہاتھی، گھوڑے، ہوادار، فنس، میانے

اور بوچے میں سوار ہو کر نکلتے تھے۔ بیل گاڑیوں اور بہلیوں میں سفر کرتے تھے۔ جہاں پتلون اور کوٹ کی کوئی قدر نہ تھی بلکہ انگا انگرکھا دارئج تھا۔ ہیٹ کی جگہ نکے دار باچوگوشیہ ٹوپی پسند کی جاتی تھی جہاں ہر طرف رنگینیاں تھیں اور دلچسپیاں۔ جہاں نوابوں کو اپنے ذوقِ عیش طلبی اور شہر کی آرائش کے سوا کوئی کام نہ تھا۔

نوابوں کی عیش پرستیوں نے رعایا کو بھی آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا تھا۔ "اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویئے سرکار میں ملازم تھے۔ اور بڑی بڑی تنخواہیں پاکر آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ رعایا خوشحال تھی اور شہری مُرفع الحال۔ سرکار کی محفلوں میں اربابِ نشاط کی گرم بازاری تھی۔ بچہ بچہ موزوں طبیعت تھا۔ شاعری کا اس قدر چرچا تھا کہ مقامی شعراء کی تعداد ہندوستان کے کُل شاعروں سے زیادہ نکلتی۔ نوابوں نے ساری دُنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی تھی۔ رعایا نے ہر قسم کی دلچسپیاں وضع کر لی تھیں۔ کوئی بیکار نہیں بیٹھتا تھا اور نہ کسی کام کی طرف خاص توجہ تھی بلکہ ہر وقت راگ رنگ، دل لگیوں، تفریحوں اور مختلف شغلوں میں دل بہلاتے تھے۔ نت نئے شوق ایجاد ہوا کرتے تھے۔ محرّم میں تمام شہر کوئی سیہ پوش، کوئی سبز پوش ہوتا اور بسنت رُت میں زرد پوش۔ ہندو اور مسلمانوں میں محض نام کا فرق تھا ورنہ رفتار گفتار، لباس، وضع قطع میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ لوگ وضعداری پر جان دیتے تھے۔ عیش باغ کے میلے زوروں پر تھے۔ قیصر باغ کی ہولیوں کا زمانہ تھا۔ جانِ عالم کی رنگین مزاجیاں اور عیش کوشیاں، پریوں کے ناچ، بجروں کی سیر، ضرب المثل کی طرح بچہ بچہ کی زبان پر تھیں۔ بادشاہ کبھی کنھیّا بنتے تھے، بیگمات اور محلسرا کی عورتیں گوپیاں بنتیں۔ خوب ناچ رنگ ہوتا ــ بادشاہ جوگی بنتے تھے اور سیروں موتی پھونک کر ان کی راکھ تیار کی جاتی۔ اور جب یہ راکھ صاحبِ عالم کے جسم پر ملی جاتی تو فقیری میں بھی شاہانہ جلال کا منظر نظر آجاتا تھا۔ باغ میں ہر ایک کو آنے کی سال میں ایک روز عام اجازت تھی۔ سارا شہر پلٹ پڑتا تھا۔ لیکن اندر آنے کی اجازت صرف اسی کو ملتی جو جوگیا لباس پہن کر آتا۔ ستر ستر اسی اسی برس کے بوڑھے بچے اور شوقین نوجوان محض اشتیاقِ دید میں شنجرفی لباس اختیار کرتے۔ تمام شہر شنجرفی پوش ہو کر رنگیلے بادشاہ کو دیکھنے جاتا۔ جانِ عالم تہہ خانوں میں جاکر چھپ جاتے۔ انکی تلاش میں ساری گوپیاں اور جوگنیں بال پریشان، نگاہیں اُداس اِدھر اُدھر تلاش کرتی پھرتیں۔ چاروں طرف باغ میں ڈھنڈیا پڑجاتی۔ وہ اُن سب کا فراقیہ اشعار گانا "مورا دن دن برھت سہاگ سیاں نہیں آیئے" اور "جانِ عالم کو ڈھونڈھن نکلی" ایک ایسا سماں بندھ جاتا کہ دیکھنے والے محوِ حیرت ہو جاتے۔

اس کے بعد تہہ خانوں میں تلاش ہوتی تھی۔ اور جس خوش نصیب کو وہ تنہائی میں مل گئے اس کی قسمت چمک گئی۔

یہ تھا نوابی لکھنؤ ــ شہر کی ہر گلی اس زمانہ میں بہشت کو شرماتی تھی۔ اور قیصر باغ تو بالکل پرستان تھا۔ امین آبادمیں دو گھڑی دن رہے سے ہزار بارہ سو پریاں سنگھار کر کے آگ بھبوکا شعلہ جوالہ بنی کمروں پر کھڑی رہتی تھیں کہ جہاں پناہ کی سواری ادھر سے گذرے تو نظارہ بازی ہو۔ جدھر سے سواری نکل گئی آوازیں آنے لگیں "جانِ عالم ہم بھی آئیں" کوئی بیباک چست چالاک آنکھیں لڑانے لگی۔ کوئی جہاں پناہ کو دیکھ کر فرطِ محبت سے مسکرانے لگی۔ کسی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ کسی نے ادا سے اپنا سر شرما کر جھکا لیا" یہ تھا وہ لکھنؤ جہاں زندگی کا نصب العین۔ اس کا منشا صرف یہ تھا کہ جہاں تک عیش و مسرت سمیٹا جاسکے کم ہے۔ زندگی نام ہے تعیّش اور تفنّن کا۔ یہی وجہ ہے کہ اس لکھنؤ میں ہمیں زندگی کا تفریحی پہلو اُس کے تعمیری اور مقصدی پہلو پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ ان کی زندگی مختلف اشغال، تفریح و تفنّن۔ داستان گوئی۔ تعزیہ داری۔ مرثیہ خوانی۔ محرّم میلے۔ تماش بینی۔ شاہد پرستی۔ افیون اور دوسری منشیات۔ شاعری۔ امامباڑوں اور چوک کے کوٹھوں تک محدود تھی۔

لکھنؤ کی پانچ تصویریں

اس نوابی لکھنؤ کی تصویریں ہمیں مختلف جگہ نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے سرور کے ہاں فسانہ عجائب میں۔ اس کے بعد سرشار کی تصانیف میں (جن پر مفصل بحث بعد میں کی گئی ہے) پھر طلسم ہوشربا اور اس جیسی دوسری فوق الفطری داستانوں میں۔ شرر کے یہاں مشرقی تمدّن کے آخری نمونے میں۔ رُسوا کے ناولوں وغیرہ میں۔

پہلی تصویر

(فسانہ عجائب) سرور پہلے شخص ہیں کہ جن کے فسانہ عجائب میں ہمیں لکھنؤ کی اس رنگین معاشرت اس مجلسی زندگی اور ان رومانوی کیفیات کے مرقعے ملتے ہیں ــ ان

میں واقعیت بھی ہے اور مصنف کے تخیل کی رنگ آمیزی بھی۔ لیکن سرور کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ اس پردۂ سیمیں پر ہمارے سامنے اشخاص پیش نہیں کرتے بلکہ صرف چیزیں پیش کرنے پر قناعت کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں، اور ان طبقوں کے مختلف افراد کے مقابلے میں محض چیزیں کوئی Representative (نمائندہ) حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر ان چیزوں کے احوال میں بھی ہمیں کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر اوروں کی بہ نسبت زیادہ ملتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں "دسترخوان اور باورچیخانہ" معاشرت کا کتنا اہم جزو تھا۔۔۔ اس کے علاوہ ہمیں مکانات کی تصویریں، محلوں کے نقشے اور شاہانہ زندگی کے ٹھاٹ بھی ملتے ہیں بیگمات کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ شاندار بازار اور سربفلک عمارتیں نظر آتی ہیں۔ جو اپنی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں عروسانہ حُسن دا دا رکھتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان میں زندگی نہیں۔ سرور اشخاص کے بجائے ہمیں چیزوں کی تفصیل بتاتے ہیں اور انہی کا ذکر سُناتے ہیں۔ ان کے اشخاص بے جان اور مکڑی کی پتلیوں کی طرح بے حس و حرکت ہیں جو محض اپنے خالق کے اشاروں پر ناچتی رہتی ہیں۔ اور ایک ایک دو دو لمحے سانس لیکر پھر اس طرح خاموش اور بے جان ہو جاتی ہیں۔ ان کے شاندار بازاروں میں بھشتی نظر آتے ہیں۔ مشک کاندھے پر ہے اور کٹورا ہاتھ میں۔ مشک کے سوراخوں میں سے پانی کی دھاریں ٹپک رہی ہیں لیکن بے حس و حرکت کھڑے ہیں۔ دکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں سجا رکھی ہیں۔ ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی ہے لیکن مُنہ سے آواز نہیں نکلتی۔ کبابیوں اور باورچیوں کی دکانوں سے طرح طرح کے لذیذ کھانوں سے خوشبوئیں آرہی ہیں لیکن کھانے والوں کا پتہ نہیں۔ ہر جگہ بھیڑ ہے لیکن کوئی شخص چلتا پھرتا نظر نہیں آتا۔ نہ ہجوم میں پہنچکر گھبراتا ہے نہ نکلنے کی کوشش کرتا ہے نہ دھکا کھا کر گرتا ہے نہ دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ حلوائیوں کی دکانوں پر ہر قسم کی مٹھائیوں کے تھال چُنے ہوئے ہیں۔ ان پر ورق لگے ہوئے ہیں۔ لیکن زندہ خریدار تو درکنار وہاں مکھیاں بھی بمشکل نظر آتی ہیں۔ کبابی کی دکانوں میں پیاز کے باریک باریک کترے ہوئے لچھوں کا ذکر سُنتے ہیں، کہیں سے بگھار کی سوندھی لپٹ آرہی ہے لیکن زندگی کی خوشبو کہیں سے بھی نہیں آتی۔ سرور نے جو تفصیل ہمیں ایک جگہ بتا دی ہے گو ایسی کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ لیکن اسے بتانے سے زیادہ انھوں نے ہمارے تخیل کیلئے چھوڑ دی ہے۔ جس کا جی چاہے ان اشاروں کی مدد سے اس سوسائٹی کی تصویروں اس معاشرت کے پہلوؤں کو اپنے ذہن و دماغ میں رچا بسا لے۔

ان کی تصاویر کی طرح ان کے الفاظ میں بھی زندگی نہیں ملتی۔ وہ پھولوں کا ڈھیر ضرور ہیں لیکن وہ پھول جن میں نہ رنگ ہے نہ خوشبو خواہ وہ فلوریڈا کے گلاب ہی کیوں نہ ہوں۔ پھول اپنی خوشبو اور رنگینی کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔ یہی اس کی رُوح ہے۔ فسانۂ عجائب اس سب سے بڑی خصوصیت سے معرّا ہے۔ اس کی تصادیر نہ تصور زا ہیں Suggestive اور نہ اُن میں زندگی ہے۔

دوسری تصویر (مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ) شرر کے یہاں لکھنؤ تاریخی اور جغرافی حیثیتوں میں ملتا ہے۔ جہاں سرور کی طرح رنگینی نہیں بلکہ ٹھوس واقعیت نظر آتی ہے۔ شرر کا یہ مضمون جس کا عنوان ہے "مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ" تاریخی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ یہ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی ایک مفصل اور بنیادی تاریخ ہے۔ اس میں لکھنؤ کے آباد ہونے کے وقت سے لیکر اس کی تدریجی ترقی، مختلف نوابین، اُن کی جنگوں یا ان کی کوششوں کا تاریخی اعتبار سے ذکر کرنے کے بعد شرر لکھنؤ کی معاشرت کی اہم خصوصیات بتاتے ہیں اور یہ دکھلاتے ہیں کہ لکھنؤ میں شاہانِ اودھ کے دربار کے قائم ہو جانے سے جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیسی تھی۔ اس کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں۔ اور اس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر کیا۔ اس تمدّن پر واجد علی شاہ کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ اور یہ اس دورِ تمدّن کی معراج کہلایا جاتا ہے۔ اس میں شرر نے سب سے پہلے نوابوں کے ماحول کو بیان کیا ہے کہ اس ماحول نے نوابوں کی طبیعتوں پر کیا کیا اثر کئے اور اس کا ردّ عمل کن کن صورتوں میں ظاہر ہوا۔ اس کے بعد تماش بینی، عیاشی، شاعری، مرثیہ گوئی، مرثیہ خوانی، سبھائیں، ہزل گوئی، ریختی، نثر نگاری، داستان گوئی، ضلع جُگت، علم و فن، طبابت، علوم دینیہ، فنِ کتابت و تحریر (خطاطی) مختلف اشغال کُشتی، بکڑی، پٹہ، بنوٹ وغیرہ، تفریحی مشاغل میں بٹیر بازی، پتنگ بازی، موسیقی، ناچ اور بھانڈ سوسائٹی کے آداب و مراسم کی تاریخ نوابوں کے حوالے سے بیان کی ہے۔

علماء کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں بیگمات کی زبان، سوزخوانی، محرم منانا، شادی بیاہ کی رسوم مختلف تقاریب، عقیقہ، بسم اللہ وغیرہ۔ خوش اعتقادیوں میں صحنک، رت جگا وغیرہ۔ مہد سے لیکر لحد تک تمام اہم باتوں کا ذکر کیا ہے سوسائٹی کے اعلیٰ و درمیانہ طبقے میں مردانے اور زنانے لباس کی تفصیل بتائی ہے۔ گھر میں اور گھر سے باہر کس قسم کا لباس ہوتا تھا۔ لوازمہ صحت میں کیا کیا خاص چیزیں تھیں۔ اس میں پان الائچی چکنی ڈلی کی تشریح کی ہے۔ اور آخر میں مردانی اور زنانی سواریوں کا ذکر کیا ہے۔ جس میں سکھپال ہوادار، فنس، بوچے، ڈولی، رتھ بہلی وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے آخر میں لکھنؤ کے با کمالانِ فن کی صناعی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح لکھنؤ نے فن کو حاصل کیا اور اس میں کیا کیا اندرتیں کیں۔

چنانچہ اس معاشرت کا سب سے زیادہ مکمل تاریخی ذکر اگر کسی جگہ مل سکتا ہے، تو وہ شرر کے اس مضمون میں ہے لیکن اس کی حیثیت محض ایک خاکے کی سی ہے۔ اس میں آدمیوں کا ذکر نام کو بھی نہیں۔ تصویر اس جگہ مل سکتی تھی جہاں خاکے کی اصلیت کے ساتھ مصور کے موقلم کی رنگینی بھی اس میں شامل ہو۔ شرر نے یہاں ہر چیز پر تاریخی انداز سے بحث کی ہے۔ اور حرف معاشرت ہو جانے والی بہت سی چیزوں کے مخرج بتائے ہیں کہ انکی اصلیت کیا ہے۔ وہ کہاں سے آئیں اور لکھنوی معاشرت پر ان کا کیا اثر ہوا۔ یا لکھنوی تمدن سے ان میں کیا رد و بدل ہوئیں اور ان کا کیا نتیجہ ہوا۔ کس قدر ترقی ہوئی اور آخر میں ان کی صورت کیا رہ گئی۔

تیسری تصویر (طلسمی داستانیں)، اسی سلسلہ میں اس جگہ داستان گوئی کا حوالہ دینا بھی بیجا نہ ہوگا۔ لکھنؤ کی فضا اس کیلئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اور اس پودے نے بہت جلدی ترقی کر کے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لی۔ اسے وہاں فن کا درجہ عطا ہوا اور داستان گویوں نے اُسے انتہا تک پہنچا دیا۔ امیر حمزہ کے قصّے اور طلسمات کی داستانیں اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ جن میں حمزہ صاحبقران ان کی اولاد اور ان کے رفقاء کی فوق الفطرت شہ زوریاں دیووں اور جنوں کے معرکے، عیاروں کی ہوشیاریاں، ان کی چالاکیاں ان کا ہر فن مولا ہونا، طلسم کشاؤں کی طلسم کشائیاں، نوجوان حسین جادوگرنیوں اور خوبصورت شہزادیوں، بہادر لسنائی نقاب پوشوں کا طلسم کشاؤں اور ان کے رفقاء پر عاشق ہونا۔ غیبی امداد کا ملنا، اور کسی نہ کسی طرح لوحِ طلسم لیکر اُسے توڑنا۔ جادو کے کھیل کا تماشا ہونا۔ غرض بہت سی ایسی ہی چیزیں ہیں۔ اور شروع سے لیکر آخر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم یونانی دیو مالا کی دُنیا میں سانس لے رہے ہیں یا جہاں کے باشندے اس دُنیا کی طرح کمزور اور مسکین نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہر حیثیت سے دیو زاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہم ہمیشہ اپنے آپ کو انہی میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ وہ افسانوی اور تصوری ماحول ہم پر اثر کر لیتا ہے اور ہم اپنے ذہن کی دنیا کو ہر چیز کو واقع ہوتے ہوئے پاتے ہیں۔ یہی ان داستان گویوں کا کمال تھا۔ وہ اپنی لسانی چرب زبانی سے نہ صرف ماحول بلکہ پڑھنے والے کو بھی اپنے بس میں کر لیتے تھے۔ ان داستان گویوں میں احمد حسین قمر اور محمد حسین جاہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں جن کے کمالات اس فن کی معراج ہیں۔ داستان گوئی کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں چیز "طلسم ہوش رُبا" ہے۔ جو ایک حیثیت سے اس دورِ زندگی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کے علاوہ "طلسم ہفت پیکر"، طلسم خیال سکندری، طلسم نوخیز جمشیدی، طلسم نور افشاں اور طلسم زعفران زار وغیرہ بھی اہم ہیں، لیکن یہ سب ہوش رُبا کے چربے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمائندہ طلسم ہوش رُبا ہی ہے۔ ان طلسمات کی خیالی داستانوں میں سے جو ہزاروں طویل اور عریض صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں اگرچہ عیاری اور ساحری کے کارنامے نکال دیئے جائیں تو جو کچھ بچ رہے گا وہ لکھنوی معاشرت کی دلچسپ داستان ہوگی۔ یہ داستان گو سرور کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر جگہ چیزوں کی بڑی لمبی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے بیان میں سیکڑوں قسم کے کھانوں کے نام گناتے ہیں۔ اور جنگ و پیکار کے موقع پر مختلف فنونِ سپہگری کی اصطلاحیں بتاتے ہیں کُشتی کے موقع پر ہزاروں داؤں پیچ دکھاتے ہیں اور عیش و مسرت اور خوشی و شادی کی محفلوں میں ہر طرح کے سامانِ عیش کا ذکر کرتے ہیں۔ شراب و ساغر، مطرب و معشوق کوئی چیز اُن سے بچنے نہیں پائی۔ ان تمام بیانوں کو جو جگہ جگہ ہمیں نظر آتے ہیں اگر ایک جگہ جمع کر کے ان کی نفسیاتی تحلیل کی جائے تو اس زمانہ کے لکھنوی معاشرت کے بہت سے پہلوؤں پر بڑی کافی روشنی

پڑسکتی ہے۔ اور اس معاشرتی مواد کا بہت بڑا ذخیرہ ہمارے ہاتھ آجائیگا۔

چوتھی تصویر اس ضمن میں رسوا کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جہاں اور بہت سے ناولوں میں لکھنؤ کے متعلق جستہ جستہ اشارے ملتے ہیں ان میں موجودہ دور میں سب سے پہلے شخص رسوا ہی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے شرر کے بعد رسوا کی شہادت ہمارے لئے سب سے اہم ہے۔ رسوا جدید خیالات کے ہیں لیکن پرورش اسی لکھنوی ماحول میں پائی ہے جو دوسروں کے لئے چاہے برا ہو۔ لیکن ایک لکھنؤ والے کیلئے باعث صد ہزار نازش ہوسکتا ہے۔ ایسی چیز سے کسی کو نفرت نہیں ہوسکتی بلکہ نفرت کی بجائے اس کو دوسروں کے مقابلہ میں اچھا اور پسندیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رسوا اپنے ماحول سے نہ نفرت کرتے ہیں نہ بیزار ہوتے ہیں بلکہ وہ جس طرح ہے اسی طرح دوسروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ اسی عقیدت کا اظہار کرے۔ جو رسوا کے دل میں ہے ۔ رسوا کے یہاں بھی لکھنوی معاشرت کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے غدر سے پہلے اور بعد کی لکھنوی سوسائٹی کے مرقعے پیش کئے ہیں ۔ 'امراؤ جان ادا' اور 'ذات شریف'، اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ اور ان کی تصانیف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں تماش بینوں اور طوائفوں کی پوری زندگی اور ماحول۔ اور دوسرے میں بگڑے ہوئے نوابوں اور آوارہ مصاحبوں کی زندگی دکھائی ہے۔ رسوا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں افسانہ نویسی کے ذریعے نظام معاشرت کے واقعات فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ناول اس زمانے کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ لیکن جس طرح سرور کے یہاں لکھنؤ صرف چند حیثیتوں میں نظر آتا ہے اسی طرح رسوا کے مرقعے بھی مکمل نہیں ہیں۔ زندگی ان میں ضرور ملتی ہے لیکن اعلیٰ ادنیٰ اور درمیانہ طبقے کی زندگی کی آئینہ داری مکمل طور پر ان میں نہیں کی گئی ہے۔

پانچویں تصویر (سرشار کی تصانیف) سرشار اگرچہ تاریخی اعتبار سے سرور کے بعد ہیں لیکن تکمیل کے اعتبار سے سرور سے بڑھے ہوئے ہیں۔ سرشار کی تصانیف میں لکھنؤ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے کے بعد لکھنؤ کا صرف خاکہ ہمارے ذہن میں بس جاتا ہے بلکہ وہاں کی معاشرت کی چلتی پھرتی تصویریں ہمارے روبرو آجاتی ہیں۔ سرشار سرور کی طرح چیزوں کے موقعے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اشخاص کی تصویریں بھی پیش کرتے ہیں۔ سرور کے یہاں دیباچے میں جو تفصیل ملتی ہے، سرشار نے اسے اپنے ناولوں کا جزو بنالیا ہے۔ چنانچہ فسانۂ عجائب کا دیباچہ اور سرشار کے فسانۂ آزاد کی جلد اول کا پہلا باب مثال کے طور پر مواز نے کیلئے کافی ہیں۔ سرور نے اپنے آدمیوں کو انسانی شکل وصورت تو عطا کی لیکن اس میں شک کیا جاسکتا ہے کہ وہ گوشت پوست والے انسان (Incarnate) ہیں یا محض لکڑی کے گڈے اور کاٹ کی پتلیاں ہیں اس لئے کہ وہ ہمیں بت کی طرح خاموش معلوم ہوتے ہیں اور سانس لیتے ہوئے نظر نہیں آتے درانحالیکہ زندگی اور حرکت ہی انسان کی خصوصیات ہیں۔ لیکن سرشار نے اپنے کرداروں کے منہ میں زبان دی ہے۔ وہ بولتے بات کرتے ہیں اور ہمیں اپنے قصے سناتے ہیں۔ اسی وجہ سے سکسینہ لکھتے ہیں کہ "ان کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہمارے سامنے سے نہیں گذرتے بلکہ وہ ہماری آپ کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ بشن نرائن در نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔

سوسائٹی کی مصوری انھوں نے لکھنؤ کی اس زمانے کی سوسائٹی کی ہوبہو تصویریں ظریفانہ انداز پر کھینچی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ہمدردانہ ظرافت کے پیرایہ میں لکھنوی تمدن کے خراب پہلوؤں کی پگڑی اچھالی ہے۔ یہ زمانہ لکھنوی دور تمدن کی منتہا کہلایا جاتا ہے۔ جس میں لکھنوی زندگی اپنی پوری تصنعات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ تصنعات وہاں کی شاعری۔ انشاپردازی۔ گفتگو۔ لباس۔ وضع قطع۔ باہمی تعلقات اشغال۔ شادی بیاہ۔ موت۔ غمی۔ مذہب۔ رسوم، علوم وفنون غرض زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں حیثیت لئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور سرشار نے سوسائٹی کی صحیح تصویریں اتنی گہرائی اور اس قدر جزئیات کے ساتھ کھینچی ہیں کہ نہ اس سے پہلے سرور کے یہاں ملتی ہیں اور نہ اس کے بعد رسوا کے یہاں۔ سرشار نے اپنی تصانیف میں ان تصاویر کا ایک عظیم الشان ڈھیر لگادیا ہے۔

جس میں ہمیں ہر رنگ اور ہر قسم کی تصویر ملتی ہے۔ اشخاص میں علماء و فضلا، نواب و رؤسا، ان کے مصاحب، بیگمات ان کی ملازمائیں، افیمی، چانڈو باز، بٹیر باز، پتنگ باز، بانکے، پہلوان، کشتی گیر، بنوٹیے پٹے باز، چور، اٹھائی گیرے، شاہ صاحب، عامل، مداری، سرکس والے، حلوائی، داروغہ، پروفیسر، نجومی، رمال، ڈاکو، لٹیرے، فوٹوگرافر، سپاہی، کمہار، کسان، عیسائی، خوشنویس، اخبار والے، بھانڈ، تماکو فروش، باغبان، تھانے دار، چور، کانسٹبل، چودھری ٹھاکر، پاسی، کپتان، قلفی والے، بھیے، جوہری، صراف، کھنگی، وکیل، تھیٹر والے، رنگریز، کہار، مشعلچی، نائی، نانبائی، جیلر، نیچریئے، گریجویٹ، اسکول کے طلبار، مکتب کے مولوی، بنواڑی سائیس، مجاور، تھیوسوفسٹ، سیاح، بیرسٹر، گارڈ، اسٹیشن ماسٹر، پھیری والے، ٹکٹ بابو، آتش باز، بہروپیے، تماش بین، گندھی، مسخرے، میونسپل کمشنر، شاعر، شکاری وغیرہ سب نظر آتے ہیں۔ عورتوں میں بیگمات کے علاوہ بھٹیاریاں، کنجڑنیں، ساقنیں، ڈومنیاں، طوائفیں، میمیں، آیائیں، پادرنیں، ماسٹرنیاں، دائی، ہر طبقہ کی عورت نظر آتی ہے۔ اور یہ سب ہمیں چلتے پھرتے حرکت کرتے لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہمارے سامنے اشخاص کا ایک عظیم الشان سمندر لاکر رکھ دیا ہے جس میں ہمیں ہزاروں صورتیں نظر آتی ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہم ان کو ان کی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے آسانی کے ساتھ پہچان سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ظریفانہ چٹکلے اور فقرہ بازیاں ہیں۔ بدتمیز نوکروں اور بدتوفیق آقاؤں کے مرقعے ہیں۔ مختلف طبقوں کی زبان، ان کی بول چال، ان کی اصطلاحات، ان کا لب ولہجہ ہر چیز بہت واضح اور عین بین ہے۔

ماحول کا رنگ ایک ادیب جس کے زبان وقلم میں قدرت نے زور اور پہلو میں حساس دل دیا ہے اس کی تحریروں میں اپنے زمانہ کے جذبات، معتقدات، احساسات اور ماحولی رنگ کی تصاویر کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہیں۔ خواہ پس پردہ ہوں یا پردہ سے باہر منظر عام پر۔ گردوپیش کی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے ہر دم رہتی ہیں۔ اس کے ذہن وحافظہ میں رہتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ اور نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ جہاں مناسبت کے ساتھ یہ چیزیں بیان ہوجاتی ہیں۔ حُسن کو نکھار دیتی ہیں۔ جہاں بغیر سوچے سمجھے لائی جاتی ہیں نظر میں کھٹکتی ہیں۔ نمایاں چیزوں کے علاوہ اس میں جزئیات اور چھوٹی چھوٹی معمولی اہمیت رکھنے والی چیزوں کا اس کی واقفیت اور اثر کو بڑھا دیتا ہے۔ یہی چیز آگے چل کر مرقع نگاری کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ نمایاں چیزوں پر ہر ایک کی نظر پڑتی ہے لیکن غیر نمایاں باتوں کو نظر میں رکھنا یا ان کو نمایاں رنگ میں دیکھنا بھی ایک عام آدمی۔ ایک ادیب، مصور، آرٹسٹ اور فن کار کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔ یہی پیر ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ اچھے اور باکمال مصور ہلکے ہلکے چھینٹوں سے بھی شوخ تصاویر بنا دیتے ہیں۔ ایک باغ کے احوال میں سبزہ کی اہمیت بہت بڑھ جائیگی اور اس کا ذکر کئے بغیر وہ تصویر نامکمل ہی رہے گی۔ باکمال مصور ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں۔

سرشار کے یہاں جذبات اور معتقدات میں ان کے ذاتی بھی ہیں اور دوسروں کے بھی۔ ان میں اعلیٰ ادنیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد سب شامل ہیں۔ ماحولی رنگ کے سرشار کبھی موافق نظر آتے ہیں اور کبھی مخالف۔ اس چیز کو وہ کبھی اپنے ذاتی خیالات اور کبھی زمانہ جدید کے عام رجحانات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ جو چیز ٹھیک ہوتی ہے اس کی تعریف اور تائید کرتے ہیں۔ جو بُری ہوتی ہے اس کی بُرائی کرتے ہیں۔ جو قابلِ اصلاح ہوتی ہے اس کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اس ماحولی رنگ پر وہ ذاتی طور پر کبھی کبھی تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ اور جگہ جگہ اپنے علاوہ مشہور مقرروں، لکچراروں اور واعظوں کی زبان سے ان پر اظہار خیالات کراتے ہیں۔ ایسے موقع پر نقطۂ نظر ان کا ایک حد تک اصلاحی ہی ہوتا ہے۔

سرشار کی بیشتر تصانیف میں لکھنؤ کی مثالی زندگی کے مُرقعے ملتے ہیں۔ جن میں اس خطہ کی معاشرت کے حالات اور وہاں کی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے واقعات ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرشار کے سامنے کونسی چیز کونسا خیال تھا جس کے زیر اثر انھوں نے اپنی تصانیف کو "نگارخانۂ رنگیں" بنانا پسند کیا۔ اور اپنے ناولوں کو مہذب ظرافت کے قالب میں ڈھالا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناول کی تار و پود (Technique) سے بھی واقف نہیں ہیں، نہ ان سے پلاٹ کی پیچیدگیاں آتی ہیں نہ کردار نگاری کے ڈھنگ سے پوری طرح واقف ہیں۔ نہ کسی کی نفسیاتی تحلیل کرتے ہیں، نہ کسی جگہ اضطرابی

شان (Climax) پیدا کر سکے ہیں۔ ان کے ناول آزادانہ افسانے ہیں۔ جہاں نہ مصنف کسی اصول اور خیال کا پابند ہے اور نہ یہ پابندی اس کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ناول میں کسی ایک واقعے کو لیکر نہیں چلتے۔ بلکہ ایک دم کتنے ہی واقعے سُنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ واقعے بھی مختلف ضمنی قصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف (ناول) اس باغ کی طرح ہیں جن میں باغبان نے ہر قسم کے ہزاروں درخت جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ باغ کی شان دوبالا ہو جائے۔ لیکن درختوں کے ہجوم سے باغ باغ نہیں رہا بلکہ جنگل بن گیا۔

پھر بھی ہر کام کسی نہ کسی مقصد۔ خیال اور ارادے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سرشار کا بھی ایک مقصد ہے وہ اپنے ناولوں میں بے ترتیب واقعات جمع کرتے چلے جاتے ہیں لیکن غیر ارادی طور پر ان کا مقصد بھی پورا ہوتا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس کی تہ میں ایک چیز نظر آئے گی۔ جس سے وہ کسی جگہ علیحدہ نہیں ہوتے۔ یہ لکھنؤ کی تہذیب لکھنؤ کا تمدن۔ لکھنؤ کی معاشرت اور لکھنؤ کی سوسائٹی ہے۔ اسی ایک چیز کو انھوں نے مختلف شیشوں کے رنگین عکس کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کی سوسائٹی میں انھیں اتنی دلچسپیاں نظر آتی ہیں کہ وہ ہر جگہ اس معاشرت کو اپنے ناولوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھنؤ سے بہت متاثر ہیں اور یہ اثر ہر جگہ اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ یہی سرشار کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ وہ اپنے اصل رنگ میں وہیں ملتے ہیں جب وہ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہیں۔ جہاں وہ اس سے ہٹ جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ یا پڑھنے والے کو دھوکا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پولینڈ کی شہزادی کی داستان فسانۂ آزاد میں پڑھ لیجئے۔ معلوم ہو جائے گا کہ مصنف نے پولینڈ اور لکھنؤ کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کی طنابیں کھینچ کر ایک دوسرے میں سمو دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ لکھنؤ کا نازک اندام تمدن پولینڈ کی برفانی آب و ہوا کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔

جس طرح شرر نے مشرقی تمدن کے آخری نمونے میں شاہانِ اودھ کے مرقعے اور لکھنوی دربار سے وجود میں آئی ہوئی معاشرت کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسی طرح سرشار نے اس زوال آمادہ تمدن، اس مٹتی ہوئی تہذیب کے نقشے کھینچے ہیں، وہ تاریخ پیش نہیں کرتے بلکہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ تصویر اور تاریخ میں فرق ہے۔ تاریخ صرف تاریخ ہے۔ عریاں حقیقت خشک اور بے کیف واقعات۔ لیکن تصویر اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں مصوّر، نقاش اور فن کار حقیقی پس منظر کے علاوہ اپنے موقلم کی رنگینیاں بھی دکھاتا ہے۔ یہی رنگ اس تصویر کی جان ہے۔ جس کے بغیر وہ بے رنگ نقوش اور آڑی ترچھی لکیروں کا ایک بے جان ڈھانچہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تصویریں پیش کرنا ہی سرشار کا مقصد تھا۔ جو ماحول وہ پیش کرتے ہیں وہ انھوں نے صرف کتابوں میں ہی نہیں پڑھا۔ صرف بڑے بوڑھوں کی زبانی کہانیوں اور قصوں میں نہیں سُنا بلکہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔ اس میں سانس لی ہے۔ اس فضا میں اپنی زندگی گذاری ہے وہ ۱۸۴۶-۴۷ء میں پیدا ہوا ہے اور ۱۸۵۶ء میں جس سال واجد علی شاہ معزول اور لکھنوی دور اپنے سب سے بلند نشان پر پہنچ گیا وہ دس برس کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنوی تہذیب کی واضح اور روشن تصویریں جیسی اُن کے یہاں ملتی ہیں دوسروں کے یہاں مشکل سے ملیں گی۔ شرر کی طرح انھوں نے بھی اس زوال آمادہ تمدن کی آخری بہار اپنی آنکھ سے دیکھی تھی۔ اس پر دوسرے تمدن، دوسرے اثرات کا حملہ بھی دیکھا تھا۔ اُس کو آخری بار سانسیں لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کی خوبیاں بھی دیکھی تھیں۔ اور بزرگوں کی زبانی سُنی تھیں۔ اس کی بُرائیاں بھی دیکھی تھیں اور ان پر غور بھی کیا تھا۔ خوبیوں کو وہ پسند کرتے تھے اور بُرائیوں کو بدل دینا چاہتے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ انھیں اپنے ماحول سے محبت ضرور تھی۔ ورنہ اُن کی تصویروں میں اس قدر رنگا رنگی اور تنوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ یہ جوش اور عقیدت کی پیداوار ہے۔ اگر اُن کو اپنے ماحول سے نفرت ہوتی تو اُن کے یہاں سوئفٹ ([illegible]) کی سی رہبرانگی ملتی۔ جو اپنے زمانہ کا سب سے زبردست طنز نگار ادیب تھا۔ اور انگریزی ادب میں اُس کا درجہ آج بھی بہت بلند ہے۔ جس کے قلم کی نوک سانپ کی زبان تھی۔ جس میں سے آبِ حیات کی بجائے زہر کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ جو اپنے دوستوں سے بے حد محبت کرتا تھا لیکن اس جانور سے سخت نفرت کرتا تھا جو انسان کہلاتا ہے۔

چنانچہ ظاہر ہوگیا کہ ان کا مقصد مسلسل اور مربوط قصے لکھنا

نہیں تھا۔ بلکہ قصے کی بجائے مسلسل حالات لکھنا تھا جو اودھ پنچ کا خاص رنگ تھا۔ سرشار نے اپنے کبھی نہ ختم ہونیوالے قصے ان تصویروں کو اہمیت دینے ہی کیلئے ترسنے ہیں جن کیلئے انھوں نے ایک مرکزی ڈھانچہ تیار کر لیا تھا جس کے سہارے سے وہ اپنی پتلیوں کو نچایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں بے حد بے ربطی اور انتشار ہے تسلسل کا وہ کوئی خیال نہیں رکھتے اور نہ اس کے پابند ہیں۔ اس کے علاوہ یہ رنگ کہیں ہلکا ہے اور کہیں گہرا۔ کسی جگہ مصور نے رنگ کی ساری پیالی اُنڈیل دی اور کہیں بے توجہی کے ساتھ رنگ پھیلا دیا۔ اور کہیں اپنی صناعی کا کمال دکھلا دیا۔ جس جگہ سرشار نے دلچسپی کے ساتھ ان کو لیا، کیا ان میں دلکشی آگئی۔ اور جس جگہ انھوں نے اس سے تھک کر دوسروں کی تسلی اور اپنے اطمینان کیلئے چند ٹیڑھی ترچھی لائنیں بنا دیں وہاں اپنی صناعی کا مذاق اُڑایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقتی ضروریات کے اثر سے ہمیشہ دبے رہے۔ یہی چیز ان کے پیش نظر رہی اور اس طرح تصویر کی تمام خصوصیات، اس کی تمام پہلو ان کی نظر کے سامنے سے ہٹ گئے۔ اس لئے سکسینہ نے ان کیلئے لکھا ہے کہ خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو وہ لکھتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان میں قوت پرواز نہیں رہتی وہ زمین پر گھسٹنے لگتے ہیں۔ یہ بات حرف بحرف درست ہے۔ بقول عسکری کے:-

"سرشار اپنی بلندی میں اس قدر بلند ہو جاتے ہیں کہ نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں لیکن جب یہ اضطراری دور، جوش کا یہ عالم گذر جاتا ہے تو وہ بلندیوں سے گر کر کیچڑ میں پھنس جاتے ہیں۔"

اپنی کینوس (Canvas) کو وسعت دینے کیلئے سرشار مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ وہ مختلف افراد کو فرداً فرداً تاکتے ہیں۔ اور اُن کے حالات پیش کرتے ہیں۔ ان کی کمزور پہلوؤں کو اُجاگر کر کے دوسروں کیلئے باعث صد ہزار تفریح بنا دیتے ہیں۔ سرشار کے زمانہ میں لکھنؤ حسن و عشق کی جنت بنا ہوا تھا۔ جس کے گلی کوچے مصر اور پیرس کے حسن و مستی کو شرما رہے تھے۔ ماحول اپنی رنگینیوں کی وجہ سے مکتب عشق بنا ہوا تھا جس میں ہزاروں دیوانوں کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ چیز سوسائٹی کی روح میں اس بُری طرح لپٹی ہوئی تھی کہ سرشار جیسا آزاد خیال بھی ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں دکھا سکتا۔

روایات حُسن و عشق اور محبت کی داستانیں معمولی چیزیں نہیں ہیں کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں۔ دُنیا کے ہر بڑے ادیب کے یہاں اس جذبے کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ لیکن فرق صرف اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا ہے۔ اس میں ادیب کی انفرادیت کار فرما پوشیدہ ہے۔ اس داستان پارینہ کو بعض اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایک ایک لمحہ میں جذبات کی ساری شدت سمٹ آتی ہے۔ بہر حال یہ کہ سرشار محض حسن و عشق کی داستان ہی پیش نہیں کرتے جو ظرافت کے بعد اُن کا خاص موضوع ہے۔ بلکہ وہ بعض دفعہ درت پنڈتوں، مکتب کے مولویوں، افیونیوں، مصاحبوں، ٹھاکروں، للاؤں، عاملوں اور رئیسوں کی خانگی زندگی کے حالات کو کام میں لاتے ہیں۔ یہ شخصیتیں اس زمانہ کی معاشرت کا نہ صرف جزو اعظم تھیں، بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ یہی لوگ اس سوسائٹی کے رکن رکین تھے۔ اگرچہ واجد علی شاہ کے ساتھ نوابی عہد حکومت ختم ہو گیا تھا اور لکھنؤ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ جنھیں ان آداب معاشرت سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور نہ کوئی دلچسپی۔ مگر ان لوگوں کے یہاں وہی واجد علی شاہی روایات برابر جاری چلی آرہی تھیں۔ بالخصوص نوابوں اور رئیسوں کے یہاں۔ گو سلطنت بدل گئی تھی۔ مگر ان کی محلسرا کا ماحول وہی تھا۔ ان کے مشاغل وہی تھے۔ ان کی روایات، ان کی وضعداریاں ان کی دلچسپیاں وہی تھیں، وہی رنگینی، وہی عیاشی، وہی آوارہ نگینی، وہی مبتذل شوق اور وہی بازاری ذوق و ذہنیت۔ جو ایک تباہ ہونے والی معاشرت، زوال آمادہ سلطنت اور اس کے حکمرانوں کے مزاج میں رچ جاتی تھیں۔ اس اعلیٰ طبقے کو اس جگہ ایک خاص اہمیت حاصل ہے یعنی یہ کہ وہی اس تہذیب کا سنگ اساسی ہے۔ ان ہی کے گھرانوں میں اس تہذیب کے مظاہرے نظر آتے ہیں۔ وہی اس تمدن کے نمائندے ہیں۔ سرشار بھی انہی سے دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی زندگی ہر رنگ میں اور ہر رُخ سے دکھاتے ہیں۔ وہ بس نہیں کرتے بلکہ جوش اور دلچسپی کی وجہ سے متواتر لکھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنی وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس زندگی کے ایک ایک ذرّے سے واقف ہیں۔ رؤسا اور نوابوں، محلات اور بیگمات کی زندگی انہیں بہت

ہی مرغوب ہے۔

مذہبیت

ان کے لکھنؤ میں ماحول کی رنگینیوں، حسن و عشق کی داستانوں، عیش پرستی اور سیہ مستی کے ساتھ ساتھ مذہب کے رنگ کی بھی ہلکی سی چاشنی نظر آتی ہے۔ مذہب ہمیشہ سے ہماری معاشرت کا جز و رہا ہے۔ اس کا ذکر کئے بغیر ہماری معاشرت کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ مشرق والوں کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نازک چیز اگر کوئی مل سکتی ہے تو وہ مذہبی جذبہ ہے۔ مذہب سے واقف ہونا اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا جتنا اُس کے اصولوں کی خاطر جان دیدینے کو اپنا نصب العین بنا لینا ہے۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر یہ چیز بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں نے اس میں شاخیں اور شگوفے پیدا کرنے شروع کئے۔ اس کی ابتدا سب سے پہلے ایوانِ شاہی سے ہوئی۔ نمونہ کے طور پر آئمہ مطہرین کی ولادت اور "اچھوتیوں" کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا زندگی کی یہ خصوصیت سوسائٹی کی عیش پرستیوں، رنگ رلیوں میں ہلکی سی گرد کی طرح دب کر رہ گئی۔ اور غور کیا جائے تو مذہبی ظاہر داریوں کے ہجوم میں حقیقت ایک نیم مُردہ اور بیجان پیکر کی طرح سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم محرم کے زمانہ میں اس مذہبی خمیر میں اُبال آجاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ مصیبتوں کا ایک پہاڑ ہو دُنیا اس کے ٹل جانے کی چشم براہ منتظر ہے۔ لیکن محرم کا مہینہ شروع ہوتے ہی مذہبی ظاہر داریاں اپنے لمبے خواب سے اکتا کر کروٹ لیتی ہیں۔ مذہبیت کا صُور پھُنک جاتا ہے۔ محرم ہے اور ماتمِ حسینؑ مجلسیں ہیں اور مرثیے۔ عزاداریاں شور و شیون اور نالہ و بکا۔ لکھنؤ کے گلی کوچے گونج اُٹھتے ہیں۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ــــ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری لکھنؤ کی سوگواری مذہبی دُنیا میں ایک منفرد چیز ہے۔ تعزیہ خانوں میں دُھوم مچ رہی ہے۔ امام باڑے پٹ رہے ہیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بانکے تلوار لگائے اینڈتے اکڑتے پھر رہے ہیں۔ بات بات میں سر پھٹول اور عفانہ جنگیاں ہوتی ہیں۔ دُکانیں لُٹ جاتی ہیں۔ لوگ جانِ عالم رنگیلے پیا کے لکھنؤ کو یاد کر کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ جگہ جگہ انیسؔ و دبیرؔ کا ذکر ہو رہا ہے۔ نجف اشرف، کاظمین۔ کربلا، چوپٹیاں ہر جگہ زیارت کو جاتے ہیں اور داخلِ حسنات ہوتے ہیں۔ تمام شہر اُداس ہے۔ کوئی ماتمِ حسینؑ میں برہنہ سر ہے کوئی سیاہ پوش۔ کوئی سبز پوش۔ امام باڑوں میں چراغاں ہو رہا ہے۔ اربابِ نشاط کے امام باڑوں اور مجلسوں میں اور ہی لطف ہے۔ گوہر جان کے یہاں سوز خوانی ہو رہی ہے۔ کون گوہر جان؟ جانِ لکھنؤ، شانِ لکھنؤ، آن بانِ لکھنؤ، روحِ روانِ لکھنؤ۔ رئیس زادے تعزیہ مصاحبت کر رہے ہیں۔ عاشورہ کے دن تعزئیے نکلنے شروع ہوئے ــــ رانگ کا تعزیہ، جو کا تعزیہ۔ موم کا تعزیہ، کھیلوں کا تعزیہ، روئی کا تعزیہ، پیپل کے پتّوں کا تعزیہ، انڈوں کا تعزیہ، نوگزہ تعزیہ، لاکھوں تعزئیے تالکٹورہ کی کربلا میں دفنائے جاتے ہیں۔ چہلم کے دن بھی کربلا میں ہجوم ہے، میلہ سا لگا ہوا ہے۔

نہ صرف محرم کا سیر حاصل تذکرہ ملتا ہے بلکہ اور بھی بہت سی ایسی رسوم، مذہبی اختراعات، خوش اعتقادیاں ملتی ہیں کہ ہم اُن کی روشنی میں اس زمانہ کی سوسائٹی کی مذہبیت سے اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد کے مذہبی جذبات و معتقدات ملتے ہیں جو تصویر کے اس رُخ کو اچھی طرح ظاہر اور واضح کر دیتے ہیں۔

ظرافت

ادب اور زندگی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ظرافت زندگی اور زندہ دلی کا دوسرا نام ہے۔ فلسفی اُسے زندگی کے سمندر کا کف کہتے ہیں۔ ادبیات میں یہ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اور چیزیں۔ اجتماعی زندگی کے ساتھ یہ بھی سائے کی طرح انسانی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ یہ عام اور عالمگیر حقیقت ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ خواہ ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی۔ مقصد بھی اس کا دونوں صورتوں میں یکساں ہی ہے۔ یعنی ایک تھکے ہوئے دماغ کو یک جانی کی مصیبت یا تلخ حقیقتوں کی کشمکش سے بچا کر اس کیلئے سرور اور تفریح کا سامان بہم پہنچانا۔ ادبیات میں وہ ظرافت اہم ہے جسے ادبی مرتبہ حاصل ہو۔ اور جس کا کوئی معیاری اسلوب ہو۔ ظرافتِ سفل کی ادب میں کوئی اہمیت نہیں۔ مثال کے طور پر ظرافت اور ہنسی گالی میں بھی پنہاں ہو سکتی ہے لیکن چونکہ یہ معیار سے گری ہوئی اور ذوقِ صحیح کی پیداوار نہیں ہوتی اس لئے اُس میں نہ کوئی ادبی محسن ہوتا ہے اور نہ کوئی ادبی شکل۔ اپنے موقع اور محل کے اعتبار سے یہ مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں تبسمِ زیرِ لب، کہیں خندۂ دنداں نما اور کہیں قہقہہ۔ سرشار کی ظرافت ان تینوں صورتوں پر حاوی ہے۔

ظرافت ادب کا جز ولاینفک ہے۔ ہر ادب میں اس کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ کہیں وقت پر کہیں وقت سے پہلے اور کہیں وقت کے بعد۔ ظرافت اپنے اولین نقوش میں Direct بلاواسطہ ہوتی ہے یعنی اس کی ابتدائی صورت وہ ہوتی ہے جب مصنف پڑھنے والے کے دوش بدوش کسی چیز پر خود بھی ہنستا ہے اور آپ کو بھی اس بات پر اُکساتا ہے کہ آپ بھی اس پر ہنسیں اور دل کھول کر اس کا ساتھ دیں۔ ورنہ اس کی ظرافت ادھوری اور نامکمل رہ جائیگی۔ یہ ظرافت کا تفریحی مقصد ہے جہاں ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کوئی غرض پوشیدہ نہیں۔ لیکن ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ظرافت بھی اپنے منازل ارتقا طے کرتی رہتی ہے۔ اور ایک بلند سطح پر پہنچکر طنز کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یہ ظرافت کی اعلیٰ قسم ہے۔ اور پہلی کے مقابلہ میں بہت زیادہ لطیف اور حسیاتی ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر مصنف شاذونادر ہی پڑھنے والے کے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتا ہے۔ یہ ظرافت کا تعمیری مقصد ہے۔

سرشار کے یہاں تعمیری ظرافت کی مثالیں بہت کم اور تفریحی ظرافت کی مثالیں بہت کثرت کے ساتھ ملتی ہیں وہ مضحک باتوں پر خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اور جو چیز بظاہر اسباب ایسی نہیں ہوتی کہ ہماری طبیعت میں گدگدیاں پیدا کرے وہ اس کا تذکرہ اس طرح اور ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ظرافت کے دونوں مقصد سرشار کے یہاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو اکثر جگہ ان کو علیحدہ کر کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی ظرافت عموماً Direct یعنی بلاواسطہ ہے Indirect یعنی بالواسطہ نہیں جو زیادہ لطیف اور مؤثر ہوتی ہے۔ وہ ہنسنے ہنسانے والی باتوں کا ذکر کسی چھیڑ کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے صرف لطف لینے کیلئے کرتے ہیں۔ طنزیہ پہلو بھی ان کے یہاں ہے مگر بہت کمی کے ساتھ۔ وہ ایسا کم کرتے ہیں کہ واقعات کو ان کی عجیب وغریب صورتوں میں پیش کر کے خاموش ہو جائیں۔ اور ہنسنا ہنسانا پڑھنے والے کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ نہیں بلکہ یہاں سب سے پہلے ان ہی کا قلم شوخیاں کرتا ہے۔ یہ چیز پڑھنے والے کے جذبات کو تحریک میں لاتی ہے انھیں شہ دے دے کر اُکساتی ہے۔ آخر کار اس کی آنکھیں شوخی اور مسکراہٹ کے ساتھ چمک اُٹھتی ہیں۔ ہونٹ متبسم ہوتے ہیں۔ ایک ہلکی ہنسی کی آواز آتی ہے جو رفتہ رفتہ بلند ہو کر قہقہے تک جا پہنچتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

سرشار کی ظرافت ایک تندرست دل ودماغ کی ظرافت ہے جس میں زندگی کے گرم خون کی روانی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے دماغ کی پیداوار ہے جو زندگی، اس کی گوناگوں مصروفیات۔ اس کی تلخیوں اور مسائل زندگی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اُن کی خاطر خون پسینہ ایک کیا جائے اور زندگی کو ان کیلئے گردش پرکار بنایا جائے۔ اس نے اپنی زندگی کے نقطۂ نظر کو کمانے اور پیدا کرنے نہیں بلکہ صرف کرنے کے قالب میں ڈھال لیا ہے۔ ایڈیسن کہتا ہے کہ زندگی نام ہے عرق ریزی اور محنت کا۔ جو چیز عرق ریزی اور محنت سے کمائی جاتی ہے جلدی نہیں اُڑائی جاتی بلکہ وہ بہت عزیز ہوتی ہے۔ اور اُسے لٹاتے ہوئے دُکھ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن سرشار اس دولت کو بے دریغ خرچ کرتا ہے وہ زندگی اور اس کے مسائل کا مذاق اُڑاتا ہے۔ خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ اور اس ہنسی سے وہ زندگی کی بہت سی تلخیوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ وہ تبسم زیرلب کا قائل نہیں اور نہ خندۂ دنداں نما اُسے زیادہ مرغوب ہے بلکہ وہ بلند قہقہے لگاتا ہے۔ اس کے قہقہے ہمارے کان کے پردوں سے ٹکرا کر گونجتے رہتے ہیں اس کی ظرافت غالب کی طرح لطیف اور رعنائی لئے ہوئے نہیں بلکہ بلند آہنگ اور تیز ہے۔ وہ اس تلوار کی طرح ہے جس کی دھار کُند ہے جو گوشت نہیں کاٹتی مگر ہڈی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اور جتنا کاٹتی ہے اس سے زیادہ تکلیف اور درد پیدا کرتی ہے ظرافت کے لحاظ سے وہ اُردو ادب کے والٹیر ہیں۔ ایڈیسن نہیں ـــ ایڈیسن کا رواں اور دلکش تبسم ان کے یہاں نہیں جو انگریزی ادب میں لطافت کی معراج ہے۔ لیکن والٹیر کے قہقہے مل سکتے ہیں۔ والٹیر دوسروں کو ہنسانے کے لئے خود قہقہے لگاتا تھا سرشار بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہی زندہ دلی کی نشانی ہے۔ اس زندہ دلی سے وہ زندگی کی تلخی مٹا کر اسے گوارا بنا دیتے ہیں۔ اور شگفتگی ومسرت پھیلا کر دُنیا کو سیلاب تبسم میں غرق کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اور ظرافت کا مقصد اسی کو بنالیا ہے۔

سرشار نے زبان وظرافت کے پیرایہ میں لکھنوی تمدن و معاشرت کے خراب پہلوؤں کی پگڑی اچھالی ہے۔ ان کے الفاظ ان کی تحریر مزاحیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس میں وہ اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔ وہ ایک جوش اور اضطراب کے عالم میں لکھتے ہیں۔ ان کا قلم اپنے آپ شوخیاں کرتا ہوا اچھلا چلتا ہے بعض جگہ وہ مثالیت سے گذر کر تصویریت کی حد میں بے اختیارانہ داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصویروں کو اُن کے اصلی رنگ میں نہیں دکھا رہے ہیں بلکہ اس نقش سے صرف تلخی کا کام و دہن مٹانا اور ہنسنا ہنسانا ہی مقصود ہے بظاہر یہ اُن کا عیب نظر آتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس عیب میں بھی ایک لطیف خوبی پوشیدہ ہے۔ وہ حالات و واقعات کو ان کے فطری رشتوں اور گرد و پیش کے ماحول سے توڑ کر ایسی زعفران زار دُنیا میں لے جاتے ہیں جس کے باشندے بقول ایک نقاد کے عمرو عیار، خوجی، سانکو پنزا اور فالسٹاف جیسے افراد ہیں۔ وہ اوّل درجے کے مزاح نگار ہیں۔ اس لئے اُن کے لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ تصویر کی بہ نسبت کارٹون اچھا بناتے ہیں۔

یہی ظرافت سرشار کے اسٹائل کی اور ان کی تصانیف کی جان و روح ہے جس کو اگر ان سے نکال لیا جائے تو الفاظ کا محض ایک ڈھیر باقی بچتا ہے۔ سرشار کی جن تصانیف میں یہ چاشنی نہیں وہ زندگی و بقا سے دُور فنا کی آغوش میں ہیں۔ فنا اور بے قدری کے تاریک پردے ان پر پڑے ہوئے ہیں۔ منظرِ عام پر اُن کیلئے کوئی جگہ نہیں اور نہ وہ اعلیٰ درجہ کے ادبی ذوق اور مذاقِ سلیم کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ سرشار کا یہ ظریفانہ انداز ہر جگہ باقی نہیں رہتا۔ جس جگہ وہ اس سے علیحدہ ہوتے ہیں وہاں ان میں کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں۔ ان کا اسٹائل اس وجہ سے محدود ہے اور جگہ جگہ محمد شاہی نثر کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ ان کے اسلوب کے یکرخاپن کی مثالیں اس جگہ بہتات کے ساتھ ملتی ہیں۔ جہاں وہ علمی مسائل اور خشک مضامین بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہ علمی مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ ان کیلئے یہ چیز ناممکن ہے۔ اگر ممکن بھی ہو تو جاذبیت اور اثر کے اعتبار سے اس کا پایہ عام مرتبے سے گر جائے گا۔

تخیل اور مبالغہ "شیکسپیئر کی کلیات میں انسانی زندگی کے جتنے مرقعے نظر آتے ہیں اگرچہ وہ سادہ ہیں لیکن فی الحقیقت تخیل سے رنگین ہیں اور یہی رنگ ہے جو شیکسپیئر کی کی شاعری کو بقائے دوام عطا کرتا ہے"۔ (تجوری)

قریب قریب یہی الفاظ قدرے تصرّف کے ساتھ سرشار پر بھی صادق آسکتے ہیں۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ سرشار کا مقابلہ شیکسپیئر سے کیا جا رہا ہے۔ ٹمری کا کورس سے مقابلہ کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر غیر معقول قسم کی کوشش ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ایک بین الاقوامی ادبی حقیقت دو مختلف زبانوں کی منفرد شخصیتوں پر جن میں سے ایک سب سے بڑا ڈرامہ لسٹ شاعر ہے اور دوسرا اپنے حلقہ کا سب سے بڑا نثر نگار کس طرح صادق آسکتی ہے سرشار کے یہاں جتنی تصاویر ملتی ہیں وہ انسانی زندگی ہی پر منحصر نہیں بلکہ وہ کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن مصنف کے قلم نے ان میں تخیل کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے خمیر میں واقعیت اور تخیل کے دونوں اجزا بکمال ہوشیاری کے ساتھ گوندھے گئے ہیں سرشار کا یہ تخیل مبالغہ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ ہمارے ادبی نقادوں نے مبالغہ کو گویا عروسِ ادب کے چہرے پر بدنما مہاسہ قرار دیا ہے۔ یہ کُلیہ یعنی مبالغہ سوائے ایک استثنا ہجو کے ہر جگہ درست ثابت ہوتا ہے۔ صرف ہجو ہی ایک ایسی شاہراہ ہے جسمیں مُبالغہ ہی نہیں بلکہ اغراق اور غلو کو بھی بجائے اکذب کے احسن شمار کیا جاتا ہے بشرطیکہ اس میں عریانی کی نمائش نہ ہو اور بالخصوص اُس وقت جب تخیل نے اس معاملہ میں فن کارانہ رعنائی پیدا کر دی ہو۔ سرشار بھی جہاں مبالغہ کرتے ہیں ان کے بیان میں دلکشی آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی تصانیف جنھیں ہم لکھنوی معاشرت کی آئینہ داری کا شرف عطا کر کے نگارخانہ رنگین کہنا پسند کرتے ہیں وہ لکھنوی دورِ تمدن کی ہجوِ ملیح ہے۔ یہ وہ تاثرات ہیں جو ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ دماغ نے محسوس کئے ہیں اور جن کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس نے دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ صرف یہی نہیں ہے بلکہ ان کی مبالغہ انگیزی کے ہم متوقع رہتے ہیں۔ اور اسی حیثیت سے ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

واقعیت لکھنوی تہذیب اور تمدن شرفا کی زندگی اور معاملات کی

طرزِ معاشرت جیسی کچھ سرشار نے پیش کی ہے وہ سر تا سر واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس میں انھوں نے ہمیں اودھ کی سوشل یا اجتماعی زندگی کی ایک تصویر دے دی ہے جس کے افراد اُن کی دُنیا میں زندہ ہیں۔ ان پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے اکثر حقیقی ہیں، بعض رومانی ہیں، بعض مثالی اور بعض انتہائی ہیں۔ گویا مصنف نے جو خاکے اپنے ذہن میں بنا رکھے تھے ان میں اپنے تصور سے رنگ آمیزی کی ہے۔ سرشار کا تخیل فوق العادت ہے۔ اور اس میں دیو زادوں کی سی قوت اور کائنات سے زیادہ وسیع و عریض کشادگی ہے۔ یہ چیز اُنھوں نے شاید قدیم مشرقی عشقیہ افسانوں سے لی ہے جن میں حسن و عشق کی معرکہ آرائیوں کے ساتھ دیووں اور جنوں کی خیالی قصے اور فوق الفطری باتیں بہت کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ اور انہی چیزوں پر ان کے تمام قصوں کا دارومدار رہتا ہے۔ سرشار نے اس کو دوسرے طریقوں سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں کو رومان اور تصور میں جذب کر دیا۔ اور ان تینوں کے امتزاج سے ایک نئی مخلوق پیدا کی جس میں حقیقت رومان اور تصور کے مشترکہ عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ گو ہم اپنی مادّی دُنیا کے دروازے اس مخلوق پر بند کر دیں لیکن ہمارے خیال و تصور ذہن و دماغ کی دُنیا میں وہ ضرور بار پانے کے لائق ہیں۔ سرشار کی دُنیا میں وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ وہ وصف ہے جو ہماری دُنیا کے باشندوں کو بھی حاصل نہیں۔ آرٹسٹ کی پیدا کی ہوئی مخلوق زندہ اور غیر فانی ہے۔ لیکن خود آرٹسٹ کے خالق (خدا) کی مخلوق (انسان) زوال آمادہ اور فانی ہے۔

حقیقت نگاری یہ کہنا کہ سرشار حقیقت نگاری سے محض نابلد ہیں اپنی انتہا پسند ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے۔ لکھنؤ کے اسلامی طبقہ کی معاشرت، نوابوں اور مصاحبوں کی گفتگو، بیگمات کی زندگی، ملازموں کی لڑائیاں، جہاں تک بول چال طرزِ بیان اور واقعیت کا تعلق ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ پیروں اور فقیروں کی ڈاکہ زنی، پولیس والوں کا ظلم اور فرعونیت بالکل درست ہیں اور آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ شرفا کی محلسراؤں کے حالات، بیگمات کی معاشرت، زبان و بیان بول چال اور گفتگو کے

وہ اتنی اچھی طرح واقف ہیں کہ شاید کوئی مسلمان بھی ان سے بہتر نہ جانتا ہوگا۔ جب وہ ایسے واقعات بیان کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھا دیتے ہیں اور حرم سرا کی دُنیا کا ایک ایک ذرّہ ذرّہ ہماری نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔ ہم ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں بے پردہ دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے آپس کے معاشرتی تعلقات، شادی بیاہ کی مصروفیتیں۔ خوش اعتقادیاں بے نظیر انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی بات چیت خوش گپیاں، فکرمندی، ہر چیز اسی طرح بے ترتیب اور بلا مقصد ہے جیسی زندگی میں ہوتی ہے۔ کسی چیز کی تصویر کھینچ کر رکھ دینا سرشار کیلئے معمولی بات ہے۔ بالخصوص اس جگہ جہاں وہ دھوم دھام اور مجمع کی تصاویر دکھاتے ہیں۔ وہ کہانی کی طرح اس مجمع کا بیان نہیں کرتے بلکہ اس مجمع میں طرح طرح کے آدمیوں اور اپنے اپنے مذاق اور پسند کے مطابق ان کی گفتگو ان کے تبصرے۔ ان کی چٹکیاں، ظریفانہ چٹکلے، لڑائی بھڑائی دھول دھپّا اس خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ہر چیز اپنے آپ ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہے اور ہم اس کی اتنی اچھی طرح دل و دماغ کی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں کہ شاید اپنی آنکھ سے خارج میں ممکن نہ ہوتا۔

سرشار ایک زبردست آرٹسٹ ہے۔ جب وہ نگارخانہ میں ہمیں اپنے تیار کئے ہوئے مُرقعے دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن و دماغ پر اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا جادو اس قدر اثر کر جاتا ہے کہ ہم اس کے بس میں ہو جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر قبضہ کر لینا اس کے ذہن و ذہنیات پر چھا جانا۔ کیا اس سے بڑا ادیب کا کوئی کمال ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام سرشار کا لکھنؤ نوابی لکھنؤ ہے۔ شوقینوں کا لکھنؤ ہے، امیروں کا لکھنؤ ہے اور رئیسوں کا لکھنؤ ہے۔ اس میں طوائفیں مل سکتی ہیں۔ ان کی رنگین زندگی کے نقشے اس سے مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن مزدوروں اور غریبوں کی زندگی کے خاکے اس میں نامکمل ہیں۔ جگہ جگہ ان کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ اس غرض سے نہیں لائے گئے کہ اس گیلری کی زینت بنیں۔ بلکہ اس لئے کہ اُن کے لانے سے نوابوں کی معاشرتی زندگی کی تکمیل ہو جائے۔ کیونکہ سفیدی کے مقابلہ میں سیاہی کا حسن کھلتا ہے۔ مصنف کا کسی جگہ یہ مقصد نہیں اور وہ اس کا ذکر بھی

کہیں نہیں کرتے۔ کہ ان کی زندگی میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ وہ بھی انسان ہیں اور سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کو کوئی حق حاصل نہیں کہ دولت کی غلط تقسیم سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے اصل حقداروں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دے۔ یہ فضیلت پریم چند کے نصیب میں تھی۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اس میں سوائے اعلیٰ طبقے کے کسی اور کی زندگی ہی نہیں ملتی۔ ضرور ملتی ہے لیکن اس کی حیثیت اور مرتبہ ثانوی ہے۔) نوابین ہی اس تہذیب کے سنگِ اساسی تھے۔ ان ہی کی معاشرت مصنف کیلئے جاذبِ نظر ثابت ہوئی۔ مزدوروں کی زندگی میں کیا رکھا ہے کہ ایک مزاح نگار اس کا مذاق اُڑائے گا۔ سرشار کی تصانیف نوابی لکھنؤ کی ایک حیثیت سے انسائیکلوپیڈیا ہیں جن میں لکھنؤ اپنی مختلف حیثیتوں سے ایک عجیب شان لئے ہوئے ہے۔ گو مصنف نے اس میں مبالغہ کی شوخ رنگ آمیزی سے کام لیا ہے لیکن اس کی تہ میں حقیقت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ سرشار مورخ اور سائنٹسٹ نہیں بلکہ فن کار ہیں۔ ان کی تصانیف سے تاریخی واقعات جمع کرنا یا ان کو تاریخ کے منتخب اصولوں پر جانچنا غیر ذمہ دارانہ بے انصافی ہے۔ گلاب کا پھول باغ کی بہار کو دوچند کرسکتا ہے۔ کسی حسین کے جوڑے میں سج کر اس کے حسن کو اور زیادہ جاذبِ نظر بنا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس پھول کی پتیوں کو بکھیر کر ان سے رنگینی اور نزاکت، جو اس کی جان ہیں لینے کی کوشش کی جائیگی تو ظاہر ہے کہ کس قدر کامیابی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو نہ پیمانہ سے نپ سکتی ہے نہ ترازو میں تل سکتی ہے۔ صرف محسوسات ہی سے اسکا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں سرشار کے لکھنؤ کا تمدن و معاشرت عمومی طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئندہ تفصیل میں ہمیں سوسائٹی کے اس ایک مخصوص حصے۔ طبقۂ اعلیٰ یعنی اُمراء و رؤسا اور بیگمات کی زندگی پر روشنی ڈالنی ہے۔ جو اس معاشرت کے اجزائے ترکیبی میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں دربار کی نمائشی زندگی کی صدائے بازگشت سب سے زیادہ انہی کی محلسرا میں گونجی۔ اس ہی وجہ سے ان کو نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ یہ طبقہ دربارِ شاہی سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا زیادہ متاثر ہوا۔ اور اس کی رگ و پے میں یہ اثر اس قدر رچ گیا کہ بساطِ حکومت اُلٹ جانے کے بعد بھی اس اثر کے مظاہر سے اُن کی دُنیا میں ہوتے رہے۔ یہ عوام کے مقابلے میں بیرونی اثرات کے حملوں اور دوسروں کے جذبات و معتقدات اور رسوم و روایات سے سب کے بعد متاثر ہوئے۔ اور انھوں نے ہر طرح اپنی انفرادی خصوصیات قائم رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بایانِ کار ان کو شکست ہوئی فی الحال ہم کو سرشار کے ساختہ و پرداختہ نواب کا کردار اور ان کی ماحولی زندگی دکھانی ہے۔ نواب اور ان کا ماحول دونوں ایک دوسرے میں اس قدر مدغم ہیں کہ ہم کسی کو علیحدہ نہیں کرسکتے۔ ماحولی زندگی سے مُراد وہ زندگی ہے جو محلسرا اور بیرونی دُنیا سے مل کر بنی ہے۔ محلسرا کی زندگی میں بڑی بوڑھی بیگمات، نوجوان لڑکیوں بیگموں اور ملازماؤں کے باہمی اتصال سے یہ زندگی پیدا ہوتی ہے محلسرا سے باہر کی زندگی وہ ہے جو نواب اُن کے مصاحب ملازمین اور بیرونی دُنیا کے افراد کے ان کے قریب تر آنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ماحولی زندگی کا دوسرا لازمی جزو ہے۔ آسانی کیلئے اس تفصیلی تذکرے کو ہم دو بڑے حصّوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ایک محلسرا کی دُنیا دوسری محلسرا سے باہر کی دُنیا۔ محلسرا کے باہر کی دُنیا کے عناصر خصوصی نواب، اُن کے مصاحب، اُن کے ملازمین ہیں جو وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہتے ہیں۔ محلسرا کی دُنیا میں عمر رسیدہ بیگمات، نوجوان لڑکیاں، نواب صاحب اور انکی بیگم اور ملازمین خاص طور پر اہم ہیں۔ یہ سب افراد آپس میں ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور ملے جلے ہیں کہ ہم اُن میں سے کسی ایک کا دوسروں کی مدد کے بغیر مطالعہ نہیں کرسکتے نہ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بیگمات ہر ہر قدم پر ملازماؤں میں گھری رہتی ہیں۔ نواب صاحب جہاں ایک طرف مصاحبوں اور ملازموں کے بغیر میر فرش ہیں وہاں دوسری طرف آدھی سے زیادہ زندگی محلسرا میں گذرتی ہے۔ وہ ان دونوں دُنیاؤں کے درمیان ایک بہت ضروری کڑی ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے اُن کی دوہری اہمیت ہے۔ ان مجموعی دُنیا کے سارے افراد کا فرداً فرداً ذکر کرنا بہت ہی مشکل اور بے حد طول طویل ہے۔ یہ خاص طور پر اس لئے کہ ایک کے حوالے کے بغیر دوسرے کی زندگی نامکمل اور تشنہ رہتی ہے۔ اس لئے قاعدے کی رُو سے ہر ایک کی پوری زندگی دکھانی چاہیئے جو محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اور ایک ساتھ سب کا ذکر کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس میں انتشار اور بے ربطی کا خطرہ ہے اس لئے کہ اُن

میں سے ہر ایک فرد کی ذاتی خصوصیات ہیں جو نہ اس سے علیحدہ کی جا سکتی ہیں اور نہ دوسروں میں پائی جاتی ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مختلف افراد کی ذاتی و انفرادی کوششوں سے مل کر پیدا ہوتی ہیں۔ یا ان کی مختلف کوششوں نے مجموعی حیثیت سے ایک نتیجہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لئے جب تک ان سب افراد کا مطالعہ ساتھ ساتھ یا یکے بعد دیگرے نہ کیا جائے پڑھنے والے کو کسی چیز کے متعلق پوری طرح اندازہ لگانے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ وہ اپنی آخری اور صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔ اگر کسی نامکمل چیز کو پڑھ کر کوئی قطعی رائے قائم کی جائیگی تو ظاہر ہے کہ وہ کس قدر صحیح ہوگی اور اُسے بدلنا کتنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ غلط رائے قائم کرنے سے تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ سرے سے کوئی رائے ہی قائم نہ کی جائے۔

مصنف کا نقطۂ نظر

اس کے بعد یہاں یہ بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس رنگین زندگی کے متعلق خود مصنف کا عام نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ اس کو کس معنی میں لیتا ہے اور اس سے کیا نتائج مرتب کرتا ہے۔ فسانۂ آزاد کی پہلی جلد میں مصنف نے عمومی طور پر اپنی یہ رائے پیش کی ہے "اس حصہ میں رسوم مذموم ہندوستان اور دقیانوسی خیالات کی ہجو ہے مگر مذاق کے ساتھ دل لگی کی دل لگی اور لطف کا لطف، مذاق کا مذاق اور مطلب کا مطلب۔ یہی تو ظرافت کے معنی ہیں" اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مصنف جدید خیال کا آدمی ہے۔ وہ مغربی تعلیم اور سائنس کے کرشموں سے آگاہ ہے۔ اس لئے نئی دُنیا کو بھی دیکھا ہے اور پرانی دُنیا پر بھی غور کیا ہے۔ گو اسے اپنی پرانی دُنیا ہی پسند سہی مگر اس کی بُری باتوں کو جنہیں وہ رسوم مذموم کا نام دیتا ہے کسی طرح پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ وہ بدل دی جائیں نئی روایات اُن کی جگہ لیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے وہ کسی آسمانی مدد یا مردے از غیب کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ فلسفۂ حرکت و عمل سے واقف ہے۔ اور کسی دوسرے شخص کو پیش قدمی کا موقع دیئے بغیر مجتہدانہ شان کے ساتھ پہلا قدم خود ہی اٹھاتا ہے اور ان رسوم مذموم کی بُرائیاں کرنا شروع کر دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ سمجھدار بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مشرق کی رجعت پسندی میں کیسی بے پناہ قوت اور مقابلہ کی طاقت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی بُرائیوں کو خوشنما الفاظ سے تیار کیا ہوا ایک دلفریب لباس پہناتا ہے۔ کونین کی تلخی کو شکر میں لپیٹ کر گوارا بناتا ہے۔ اور اس عروسِ نو کو جس کا دستِ حنائی ضرورت کے وقت پنجۂ آہنی بن کر گلا گھونٹ سکتا ہے۔ ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے جو مقبولِ عام ہے اور اس طرح سوسائٹی کی بُرائیوں کیخلاف عادت اور ذہن و ذہنیات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ کونسے ذرائع اس نے اختیار کئے۔

وہ بُرائیوں کی اصلاح ایک لمبے چوڑے وعظ سے نہیں کرتا بلکہ بُرائیوں کے نقشے سُناتا ہے اور اُن کو عُریاں کر کے دکھاتا ہے تاکہ اُن کی عُریانیوں سے شرم دار آنکھ جھک جائے اور حساس دل متاثر ہو۔ اس لئے بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب باتوں کو بھی دکھاتا ہے۔ اکثر جگہ حد سے گذر کر غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ و اشعار استعمال کرتا ہے۔ جس سے ہمارا اخلاقی احساس مجروح ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اپنے زمانے کی روش کے مطابق کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض چیزیں جو آج سب سے زیادہ مقبول ہیں کل سب سے زیادہ مردود ہو جائیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ افراد کے مذاق بھی تو بدلتے رہتے ہیں۔ پھر وہ سمجھتا ہے کہ بدکاریوں اور بُرائیوں سے لوگوں کو بچانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ بالکل عُریاں حالت میں دکھائی جائیں — مغرب والے اسی عریانی کو آرٹ سمجھ بیٹھے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی معاشرت ابھی اس قدر ترقی نہیں کر سکی ہے کہ عریانیوں کو آرٹ سمجھنے کا ارتکاب کر بیٹھے۔ اس زمانہ میں زندگی کے نیز نشے سے افراد کے ذہن و دماغ اس درجہ ماؤف ہو گئے ہیں کہ ہوش و حکمت کی گلریز باتیں اُن پر اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ تاوقتیکہ ایک تیز نشتر یا زہر میں بجھے ہوئے خنجر کے عمل جراحی سے اُن کے تصورات کو مجروح کر کے زندگی کا احساس پیدا نہ کر دیا جاتا۔ سرشار کے یہاں سوئفٹ ([illegible]) کی سی زہرناکی نہیں ملتی۔ وہ انقلاب پیدا کرنے کا خیال ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ جوش باطنی رُوح کے قہقہوں میں تبدیل ہو جاتا ہے — وہ رؤسا کی زندگی کی آلائشوں سے واقف ہیں اور اس کثافت کو اُچھال اُچھال کر دکھاتے ہیں۔ تاکہ لہو و لعب کے بوجھ سے دبی ہوئی روحیں اپنی کھوئی ہوئی لطافت کو دوبارہ پا سکیں۔

سرشار سودا کی طرح عیش پرست اُمرا کے خلاف کوئی عناد

نہیں رکھتے ادبی معاملات میں ذاتی و انفرادی بغض و عناد کو درمیان میں لانا ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو الوں کی بُری باتوں کو بیان کرتے وقت ان الفاظ میں "معذرت کرتے ہیں" راوی اپنے ناظرین اولی الابصار خصوصاً متین اور مہذب زگواروں کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ذیل کے حصّے کو بد تہذیبی پر محمول نہ فرمائیں۔ ہم اپنے ملک کی رسوم بد اور عادات کے خلاف تہذیب کو عمدہ طور سے لکھ ہی نہیں سکتے۔ تاوقتیکہ ہم کُل رسوم مذموم کا خاکہ نہ اُڑائیں لیس ہم مجبور ہیں۔"

اعلیٰ زندگی کی ایک جھلک

ان امرا کی زندگی کا نصب العین عیش و مسرّت اور آرام طلبی ہے۔ اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی تعمیری پہلو نظر نہیں آتا۔ اوّل اور آخر جو کچھ ہے یہی ان کا مقصد ہے۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک اس شراب کے خمار کا اثر ہے جو انکے بزرگوں نے پی تھی۔ ان کی وضع داری، خانہ نشینی اور عیاشی کا دوسرا نام ہے۔ اس خانہ نشینی نے اُن کی ذہنیت کو سُکیڑ کر انھیں تنگ نظر بنا دیا ہے۔ اُن کی محفلوں کی فضا عیش و عشرت کے نغموں سے گونج رہی ہے۔ بے فکری کا دَور دَورہ ہے۔ عیاشی و اوباشی کی گرم بازاری ہے۔ ان کی مذہبیت ظاہر داریوں اور اصلیت نمائشی رنگینیوں میں گُم ہو کر رہ گئی ہے، زندگی اپنی جوانمردانہ خصوصیات کھو کر صرف رنگ رلیوں تک محدود رہ گئی ہے۔ امرا، وزرا، حکام، رؤسا سب ایک رنگ میں شرابور، ایک حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر بدمست اور رندِ خرابات ہے۔ بدشوقیوں اور فضولیات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بازاری شوق عوام سے گذر کر شرفاء کی محفلوں اور محلسراؤں تک پہنچ گئی ہیں۔ ننگا پن اور آوارگی بزرگی کی علامت ہے۔ ہر چیز کا معیار اُلٹ گیا ہے۔ عیش پرستی اور طوفانِ بے تمیزی کے سیلاب میں ثقافت اور متانت خدا جانے کہاں بہہ گئی ہیں۔ ان کی مجلسوں میں گھنگھروؤں اور پازیب کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ نقرئی تبسم ہے اور رُخساروں کی تابانی۔ مرمریں شباب ہے اور گوری باہیں۔ طبلے کی تھاپ ہے اور کیف مستی کے بھرے نغمے۔ جھومر ناچ ہو رہا ہے۔ پھیر دیں اُڑ رہی ہیں بڑھ بڑھ کر تعریفیں ہو رہی ہیں۔ جلسہ کا یہ رنگ ہے کہ راگ الگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ محفل جھوم رہی ہے۔ گردن ہل رہی ہے۔ سازندے مست ہیں۔ کہیں سے حافظ شیرازی کی غزل کی فرمائش ہوتی ہے۔ حقانی غزل . . . کسی رنگین ادا کا طرز اور اس کی اٹھتی جوانی۔ اس پر مستزاد نازک آوازی۔ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ نغموں کی لہریں بادلوں کی طرح جھوم جھوم کر اٹھتی ہیں اور برس جاتی ہیں۔ محفل اِندر کا اکھاڑا بنی ہوئی ہے۔

کہیں آتشِ لرزاں (شراب) کا ذکر ہے۔ کانپتی ہوئی موجیں ہیں اور تُندیٔ صہبا سے پگھلتے ہوئے آبگینے۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور ڈگمگاتے ہوئے قدم، لرزتے ہوئے ہاتھ اور جھومتے ہوئے سر۔ لا اور لے کا شور ہے۔ ساقی ہے اور اس کے پرستار صراحی ہے اور ساغر، مستی ہے اور وارفتگی۔ کہیں بیچوانوں کی گڑگڑاہٹ سے کمرہ گونج رہا ہے۔ کہیں اُڑ رہی ہیں۔ چوسر، گنجفہ، شطرنج کی بازیاں ہو رہی ہیں۔ جی گھبرایا تو مدک کا دم لگایا۔ چانڈو کے چھینٹے اُڑائے، افیون کی چسکی لی۔ نشے بازوں کے پرے، مشرق اور مغرب کی الٹی سیدھی پھبکیے میں مصروف ہیں۔ بساطِ کائنات اُلٹی جا رہی ہے۔ افیم اور چانڈو کی مدح میں قصیدہ خوانیاں ہو رہی ہیں۔

پلا ساقیا مالوے کی افیم
کہ کر آؤں گلگشتِ باغِ نعیم

کہیں اکھاڑوں میں بٹیروں، مرغوں اور مینڈھوں کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے، بے انتہا شور ہے۔ واہ واہ، مرحبا، شاباش بیٹا، جیتے رہو میرے شیر۔ کی للکاروں سے کان کے پردے پناہ مانگ رہے ہیں کہیں شعر خوانیاں ہو رہی ہیں۔ پھکڑ اور ہزل سے گذر کر ڈھول ڈھپ تک نوبت آگئی ہے۔ ریختی سے شوق ہو رہا ہے اور ہر طرح زبان و شاعری کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ محلسراؤں سے ہلکی ہلکی ہنسی، شوخ کِھلکھلاہٹ اور حسین قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جو کانوں کے راستے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ ڈومنیاں لہک لہک کر گا رہی ہیں۔ ان کے پھیلے ہوئے دامنوں میں چھنا چھن روپے برس رہے ہیں۔ ملازمائیں اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں مغلانی کہانیاں کہہ رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے، الھڑ اور شوخ لڑکیاں اُسے گھیر کر بیٹھی ہیں۔ غزل (؟) کے اشعار آہستہ آہستہ گا گا کر پڑھ جا رہے ہیں۔ مُبادا کوئی سُن لے اور ہر آہٹ سے گھبرا کر چونک اٹھتی ہیں۔ رت جگوں اور شادی بیاہ کی دھوم میں کان پڑی آواز

سنائی نہیں دیتی۔ اور بیچ بیچ میں کہیں سے بڑی بوڑھی بیگمات کی ڈانٹ اور ملکاریں سنائی آتی ہیں۔ غرض اُمرا کی زندگی کے ہر رنگ کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ ان کے تاریک اور روشن پہلو دونوں دکھائے ہیں مگر روشن کم اور تاریک زیادہ اور ہر جگہ ظرافت کی مرصع کاری۔ اس فنی پختگی کے ساتھ کی گئی ہے کہ وہ لطیف ہوگئے ہیں۔ انھیں ہم اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہماری دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہم ہنستے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ شاید افسوس کبھی نہیں کرتے جو سرشار کا منشا تھا ہر چیز پردۂ فلم کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہم اپنی آنکھیں مل مل کر انھیں دیکھتے ہیں۔ کہیں دھوکہ تو نہیں۔ یہ سرشار کے اسٹائل اور تخیل کی برکت ہے کہ حقیقت رومان اور تصور ایک دوسرے میں گڈ مڈ نظر آتے ہیں۔ نوابوں کے کردار، ان کی پرواز تخیل کا ایک پرتو اور ان کی قوتِ فکر کی ایک دلفریب تخلیق ہیں۔ ان میں حقیقت ہے یا نہیں اس کا جواب اپنی اپنی صلاحیتوں کے پاس ہے۔ مبالغہ ان میں ضرور ہے۔ بلکہ اکثر جگہ تو پرواز فکر اور مُبالغہ ہی کی طلسم سازیاں ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دُنیائے عمل میں ان نوابوں کی وہی حیثیت تھی جو آج خیال کی دُنیا میں سرشار کے لکھنؤ کی ہے۔ وہ رئیس تھے، شوقین تھے اور رنگین مزاج بھی۔ کبوتر بٹیر وغیرہ پالتے تھے۔ لوگ اب بھی پالتے ہیں۔ چانڈو، مدک، افیون، شراب کا شوق رکھتے تھے۔ لوگ اب بھی اُن کے عادی ہیں۔ پتنگ بازی، گنجفہ، شطرنج کھیلتے تھے۔ یہ شوق اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں دولت و حکومت کا نشہ تھا۔ اب بھی دُنیا ایسی ہستیوں سے خالی نہیں غرض سب کچھ تھا جو سرشار نے دکھایا۔ اور وہی اب بھی ملتا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ قلم سرشار کے ہاتھ میں تھا جس رنگ میں چاہا رنگ دیا۔ جس طرح چاہا دکھا دیا۔ اور اس طرح دکھایا کہ تفریحی پہلو ہمیشہ نمایاں رکھا۔ اس خصوصیت کو وہ کبھی دبنے نہیں دیتے۔ اور جہاں وہ اس سے علیحدہ ہوتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں رہتے۔ یوں نوابوں میں جہاں انھوں نے صف شکن بٹیر والے نواب۔ سپہر سلطنت جو ہمایوں فر کے مرنے کے بعد سپہر آرا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ قمر رکاب جو حسن آرا کے غائبانہ عاشق ہوگئے۔ بشیر الدولہ جو انسانی لباس میں غیر انسانی مخلوق ہے رونق الدولہ جو بہت خانہ نشین ہیں، نواب چھپن جو اعتدال پسند ہیں۔ نواب محمد عسکری جو تنوع پسند ہیں۔ اس قسم کے افراد دکھائے ہیں وہاں ایسے نواب بھی دکھائے ہیں جیسے ثریا بیگم کے شوہر یا ہمایوں فر یا ان کے بڑے بھائی صاحب عالم وغیرہ جو نہ احمق ہیں نہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں جو ہمارے جذبات کو متلاطم کرکے گدگدا کر بے اختیار ہنسنے پر مجبور کردے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ سرشار کی پُرانے رنگ کی مخالفت نے ان ہی کے ہاتھ سے ایسے کردار بھی پیدا کردیئے جو اس کام میں اپنے خالق کے معاون ثابت ہوں۔ اور جو قدیم قابلِ اعتراض باتوں کے دُور کرنے میں اپنے مقابل کے کرداروں سے کشمکش میں مبتلا رہیں۔ لیکن ایسے کرداروں میں نہ اُن کے یہاں کوئی تنوع ہے اور نہ دلچسپی۔ وہ ایسے کردار پیدا کرنے میں ماہر نہیں۔ ان کی فیکٹری میں وہی کردار اچھے تیار ہوسکتے ہیں جو چپٹے ہوتے ہیں۔ جو اُن کے ظریفانہ جذبات کا اُبال ہوتے ہیں خواہ وہ نوابوں کی صورت میں ہوں خواہ مصاحبوں کی ان کی دلچسپی ان کی ظرافت کے ساتھ قائم ہے۔ یہی اُن کے جسم میں روح کی طرح دوڑتی رہتی ہے۔ جہاں یہ برقی رَو اُن کے جسم سے نکلی وہ بیجان ہوکر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ ہمارے رحم و کرم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم انھیں جی چاہے جہاں اٹھا کر پٹک دیں۔

دُنیا مُردہ جسم کی کوئی قدر نہیں کرتا اور نہ مُردہ نام کی
اور جس کا نام زندہ ہوتا ہے وہ کبھی مرتا ہی نہیں۔

سرشار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے نوابوں کی زندگی اور مشاغل کو دکھایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تجربہ اس شعبے میں کتنا وسیع ہے، مشاہدہ کتنا گہرا اور نظر کتنی باریک ہے۔ جو نہ صرف نمایاں، بلکہ معمولی اور جزوی باتوں کو بھی بھانپ لیتی ہے اور ان سے ایک نہایت موزوں پس منظر قائم کرلیتی ہے۔

مردانہ زندگی کے متعلق جتنے موقعے ہیں ان پر اتنی حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن جب سرشار اس نگار خانہ میں بیگمات، اُن کی معاشرت، بول چال، ماحول، غرض محل خانی زندگی کی تمام مصروفیات بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بتاتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔

مصور کا کمال یہ ہے کہ تصویر خود مُنہ سے بول اٹھے شاعر کا کمال یہ ہے کہ اشعار کے الفاظ آہنگ اور معانی میں لذت،

وہ درد کی ساری شدت سمٹ آتے۔ ادب کا کمال یہ ہے کہ اس کے خیالات اور الفاظ تصویر زا ہوں۔ اور پڑھنے والے کے ذہن کی خود بخود تعبیر کی رہنمائی کے وہاں تک رسائی ہو جائے۔ اسی لئے بعض ادیبوں کے یہاں ہمیں الفاظ کی تفصیل کی بجائے صرف اشارے اور کنائے ملتے ہیں۔

ستار کی ضخیم تصانیف کے صفحوں میں ہم بیگمات کی زندگی کے متعلق ہر قسم کا مواد پاتے ہیں جس کی بنا پر ہم ان کی زندگی کا مکمل خلاصہ بڑی آسانی اور کامیابی کے ساتھ تیار کر سکتے ہیں۔ ان میں بڑی بوڑھی بیگمات کی تصاویر جہاں ایک طرف محل خانی معاشرت و آداب کی آئینہ دار ہیں وہاں ہمارے لئے ذریعہ تفریح بھی ہیں۔ ان کا رعب، ان کی دھونس، ان کی جھڑکیاں، توہم پرستیاں، ان کی ضدیں، ان کا چڑچڑا پن، ان کی آمریت، اور مطلق العنانی سب کے سب دلچسپ ہیں۔ نوجوان لڑکیوں اور کمسن بیگمات کے ذکر میں ان کی بول چال، دل لگیاں، چہلیں، مذاق، آپس کی چھیڑ چھاڑ، پھبتیاں اور دھڑتے کرتے، حاضر جوابی، کی پردہ داریاں اور پردہ داری میں بے پردگیاں، ان کی رہت رسوم، توہم پرستی اور خوش عقادی، شادی بیاہ میں ان کی مصروفیتیں اور دلچسپیاں، عید بقرعید، محرم، میلے، تیوہار پر ان کے مشغلے، ان کی نزاکت آفرینی، آپس میں ایک دوسرے سے اظہار تعلق، بڑی بوڑھیوں کا ادب، محلسرا کی ملازماؤں سے ان کا سلوک، ان کی رنگینی طبع، غرض ہر چیز بڑی تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اس جگہ موجود ہے۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ لکھنؤ جیسے افسانوی شہر کی حسین و دلفریب مرقعے اس قدر اچھے اور دلچسپ و رومانک اور روح پرور ہیں جیسے اصلی رنگ میں بھی ہیں ہو سکتے۔ جس طرح گلاب کے رنگین تختوں کو دیکھ کر روح میں تازگی آجاتی ہے، دماغ معطر ہو جاتا ہے اور جہاں ہوا کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی لہروں کے ساتھ کھیلتا ہوا گزرتا ہو دل کھل جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں خوشی کے جذبہ سے چمک اٹھتی ہیں۔ یہی کیفیت ان بیگمات کے مرقعوں سے ہمارے حسیات اور ذہن پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس مادی دنیا کے بکھیڑوں کو بھول کر تھوڑی دیر کیلئے اس رومانی تصور کی دنیا اور اس کی دلفریبیوں میں کھو جاتے ہیں۔

رؤف رؤفی

واپسی

خاموش ہے، گنگ ہے، سیہ پوش!
ماضی کے محل کی نرم دیوار
ٹوٹا نہیں بے حسی کا پندار!
چھوڑا تھا اسی محل کے پیچھے
احباب کو صرفِ نغمہ و ساز
رکھتے تھے شرارتوں کی بنیاد
ہوتا تھا محبتوں کا آغاز
لوٹا ہوں تو محفلیں ہیں خاموش
آتی نہیں قہقہوں کی آواز!
زنداں کی حدیں کہیں کھو گئے ہیں
دیوانے بہل کے سو گئے ہیں
دروازوں پہ دے رہا ہوں آواز
خاموش ہے، گنگ ہے سیہ پوش
ماضی کے محل کی نرم دیوار
پھیلائے ہوئے زمیں کی آغوش
تاریکی میں ڈھونڈھتا ہوں راہیں
سورج کو ترس گئیں نگاہیں!

اختر الایمان

کمی

آرکسٹرا میں جونہی دھن شروع ہوئی تو ناچ کی گت بدلنے کیلئے وہ ایک قلیل وقفے کیلئے رُکا۔ ۔۔۔ اس کے دماغ پر پھر سے انہی خیالات نے یلغار کر دی۔ اسے اپنی ساتھی بیگو اینڈین لڑکی کوئی خوفناک چڑیل معلوم ہونے لگی۔ اس کی وہ خالی خالی سی حرص بھری آنکھیں، پوڈر اور روژ (Rouge) سے لپا ہوا ڈبل روٹی کا سا گول مٹول، بے کشش چہرا، لپ اسٹک سے رنگے ہوئے حد سے زیادہ پتلے ہونٹ، جیسے کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ اور بلی کے سے لمبے لمبے سرخ ناخون، سو فیصدی چڑیل، ہو بہو ڈائن، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس لمبے تڑنگے جسم کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ جیسے اس پر کوئی پہاڑ گر پڑا ہو۔

"مہربانی کر کے ذرا ٹھیرنا، میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے" وہ بہانہ بنا کر ان سخت سخت سی مردانہ باہنوں کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ وہ یہی رہی، ایک کھسیانی "سوری" کہتی ہوئی کسی اور سمت کو چلی گئی۔ اور وہ خود گرتا پڑتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال سے باہر نکل گیا جیسے برسوں کی قید سے چھوٹ کر بھاگا ہو۔ اور پھر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں اس سنسان ٹیلے پر بیٹھا ہوا وہ اداس اور غمگین نظروں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگا جیسے کسی چھپے ہوئے ستارے کو ڈھونڈھ رہا ہو۔ ابھی آٹھ روز پہلے تک اسے کسی فکر یا انتشار سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ رنج و غم کے الفاظ اس کی لغت ہی سے خارج تھے۔ احباب کے حلقے میں وہ زندہ دلی اور مسرت کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ "ہنسو اور ہنساؤ" یہی اس کی زندگی کا اہم اصول تھا اس نے ہمیشہ سہل الحصول چیزوں کو چاہا تھا۔ کسی ناقابلِ رسائی چیز کی اس نے کبھی اپنے دل میں طلب پیدا ہی نہیں ہونے دی تھی۔ اس کا قول تھا۔ انسان دنیا کی گوناگوں مسرتوں سے لطف اندوز ہونے اور خوش و خرم و کامراں رہنے کیلئے پیدا ہوا ہے رونے دھونے اور ناکام رہنے کیلئے نہیں۔ وہ ہمیشہ ان خیالات پرست احمقوں کی ہنسی اڑایا کرتا تھا جو خواہ مخواہ

ناقابلِ عمل تجویزیں سوچتے اور مشکل کاموں میں الجھے رہتے ہیں ہمیشہ خیال اور رومان کی دنیا میں بستے ہیں۔ ایسے بیوقوف رومان پسند وں کیلئے اس کے دل میں ذرہ بھر بھی وقعت اور ہمدردی نہیں تھی۔ ایسی دیوانگی کی باتیں اس ساکت و جامد زمانے میں تو سجھ سکتی تھیں حب انسانی ادہان مذہب اور قدامت کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ جب عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ کہا جاتا تھا۔ جب عارضِ محبوب میں جلوۂ حق نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دنیا جاہل اور انجان تھی۔ مگر آجکل اس ترقی یافتہ سائنس اور مشینری کے دور میں جبکہ کائنات کے ذرے ذرے کی ماہیت معلوم ہو چکی ہے، انسانی جذبات اور خواہشات تک کے اسباب کا کھوج لگایا جا چکا ہے۔ تو بھلا یہ بیمار تخیل اور ایسی فرسودہ حماقتیں کہیں قابلِ معافی ہو سکتی ہیں۔

"اخلاقی معیار کے مطابق زندگی بسر کرو۔ پاکبازی اور شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ کسی بداخلاقی کے مرتکب نہ ہو۔ محبت کے معاملہ میں ہمیشہ ثابت قدم اور وفادار رہو۔ اگر کسی کو چاہو تو ہمیشہ کیلئے اس کا کلمہ پڑھو۔ بس اسی کے ہو رہو" یہ سب کیسی عقلمندی کے اصول ہیں۔ گویا اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو مارفیا کے انجکشن سے ساکت کر لو۔ اپنی انگلیوں سے اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔ اپنے ہاتھوں طوق اور بیڑیاں پہن لو۔ انسان فطرۃً آزاد ہے۔ عورت ہو یا مرد ۔۔۔ اپنے قول و فعل کا مختارِ کل۔ کسی کی روح کو زبردستی غلام بنانے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہے کوئی جوا کھیلے، آوارہ گردی کرے، شراب پیئے، بھنگ گھونٹے سنکھیا پھانکے یا خودکشی کر لے۔ آخر کوئی کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا مجاز کب سے ہوا؟ کیا دوسرے جانوروں پر بھی ایسی پابندیاں عائد ہیں، ایسی کڑی قیدیں ہیں، ہرگز نہیں، وہ تو فطرت کے عین مطابق آزادانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر فطرتِ انسانی بھی تو انہی میں سے ایک ہے۔ جو ارتقائی منازل طے کر کے اب اشرف المخلوقات کہلانے لگا ہے۔ مگر بیوقوف انسان اپنے اس احساسِ فوقیت کی سنکی میں مذہب، اخلاق،

تہذیب، سماج اور نہ جانے کون کون سی بلائیں اپنے سر منڈھتا گیا۔

یہ دُنیا کس قدر پُر تنوع ہے۔ پیٹ بھرا ہوا ہو اور روپیہ پاس ہو تو جہان میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ نت نئی رنگینیاں، تازہ بتازہ دلچسپیاں اور ذوقِ نظر کی تسکین کیلئے نو بہ نو عورتیں، ایک نہیں دو نہیں متعدد، ورِ بے شمار۔ طرح طرح کے فیشن میں رنگی ہوئی۔ قسم قسم کی اداؤں کی مالک۔ پھر بھلا کس کا سر پھرا ہے کہ اس بوقلمونی کی توہین کرے۔ اور "جیسے ہر ایک شے میں کسی نئے کی کمی پاتا ہوں" کے نعرے لگاتا پھرے۔

اور وہ اپنا یہ اصول اور نظریہ ہر ایک کے سامنے بلا کسی جھجک کے ظاہر کر دیا کرتا۔ لیکن آٹھ دن ہوئے ایک رات اس کے خیالات و محسوسات میں یکایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا تھا۔ ایک آن کی آن میں زندگی کے متعلق اس کا نظریہ یکسر بدل گیا تھا۔ اس تمام رات یہاں کے ایک مشہور ہوٹل میں دلچسپ پروگرام تھا جس کا موضوع تھا "ہندوستان قدیم زمانہ میں"۔ یہاں کی سوسائٹی کس ذوق و شوق سے اس رات کی منتظر تھی۔ دو تین دن پہلے ہی ہوٹل کی تمام سیٹیں ریزرو ہو چکی تھیں۔ اور خاص اس روز سرِ شام ہی ہوٹل کا ہال زندگی اور زندگی کی سرخوشی سے چھلکا اٹھا تھا۔ وہ بھی اپنے احباب کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ ہال کا وہ حصہ اس کے دبے دبے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اتنے میں ایک مرد کے ساتھ ایک نازک اندام عورت مٹکتی شاتی، لجاتی، شرماتی، مہندی کی سبک ڈالی کی طرح بل کھاتی اُن کے عین قریب سے ہو کر گذری۔ پہلے تو وہ اپنی عادت کے مطابق اُسے دور تک کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اور پھر نہ جانے کس کشش کے زیر اثر اس نے ذرا سی دیر میں کتنی بار ادھر دیکھ لیا۔ جوان عورتوں کو چور نظروں سے گھورنا اور پھر اپنے ساتھیوں کے سامنے اُن پر رائے زنی کرنا اس کے نزدیک کوئی معیوب فعل نہیں تھا۔ مگر آج اس نے اس عورت کو دیکھ کر اس کے متعلق ایک لفظ بھی اپنے دوستوں سے نہیں کہا۔ اور کسی غیر مرئی قوت نے جیسے اس کو اس طرف دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب رقص شروع ہوا تو کتنی ہی واقف کار عورتوں نے اس کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر اُسے ہم رقص ہونے کی دعوت دی لیکن وہ اپنی جگہ سے بلا تک نہیں۔ یونہی انجان سا بنا بیٹھا رہا۔

لیکن جب دوسری بار آرکسٹرا نے ایک دلکش ناچ کی دُھن بجائی تو وہ اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورت کو جیسے ٹالنے کی غرض سے مارا باندھا اس کے ساتھ جا کر رقص کرنے لگا۔ لیکن اُسے ذرا بھی لطف نہ آیا، اور اس اثنا میں اُسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے آج وہ رقص کرنا ہی بھول گیا ہے۔ اس کا سر لٹو کی طرح چکرا رہا تھا۔

ایک بار تو اس نے بے خیالی میں اپنے بازو بالکل ہٹا لئے تھے۔ جس کیلئے اُسے اپنی ساتھی عورت سے بڑی لجاجت کے ساتھ معافی مانگنی پڑی۔ اور پھر جونہی ناچ ختم ہوا وہ پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا تیر کی طرح اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اور پھر وہ بظاہر اپنے احباب کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کے دل میں نہ جانے کیسی انجان سی مسرت بھر گئی تھی۔ اس کی رگ رگ میں کیسا عجیب سا سرور چھا رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دل کی اس نئی کیفیت کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیگا۔ کسی کو اس مسرت میں شریک نہیں کرے گا۔ گویا کسی کو بھید لگ جانے کی صورت میں اُسے اپنی یہ خوشی چھن جانے کا ڈر ہو۔ مگر اس کی بات بات سے اس کے من کا بھید ظاہر ہو رہا تھا۔ ہنسی جیسے اس کے ہونٹوں سے اُبلی پڑتی تھی۔ دو تین مرتبہ وہ بلا کسی بات کے بڑے زور سے بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ مگر پھر جلدی ہی جیسے اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہو گیا اس نے مجرمانہ نظروں سے اس طرف دیکھا۔ اس نے سوچا، وہ کیا کہتی ہو گی۔ ناچنے گانے والیوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ بدتمیز کہیں کے۔ اس کے بعد اس نے اسٹیج کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ اس کے دل پر آج عمر میں پہلی مرتبہ یوں کسی کا رعب چھایا تھا۔ اور پھر جب اس کے دوستوں نے وسکی اور شامپین طلب کی تو وہ خواہ مخواہ جھنجلا کر بولا "وہیں جا کر پی آؤ نا۔ میز پر دکان لگانی کیا ضروری ہے"۔

وہ سب حیران ہو کر اس کا مُنہ تکنے لگے تھے۔ اور پھر اُن میں سے ایک مسخرے نے قہقہہ لگا کر کہا تھا "آج دشمنوں کے مزاج کیسے ہیں؟ کہیں آج زیادہ تو نہیں پی گئے؟"

اس پر اُسے بہت غصہ آیا۔ کمبخت، بد مذاق "پی

لئے۔ پی گئے" کی واہیات گردان۔ گویا پینے کے علاوہ دُنیا میں کوئی کام ہی نہیں۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں کہ کہیں انھیں شک نہ ہو جائے۔ پھر بھی وہ اسرار زیادہ دیر تک کیسے چھپا سکتا تھا۔ مانا کہ زبان بس میں تھی۔ آنکھوں پر تو اختیار نہیں تھا۔ اور جب اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان سب کی نظریں بھی اس طرف پہنچ گئیں تو انھوں نے اصل معاملہ بھانپ لیا۔ "خوب! تو یوں کہو۔ آج یہ انوکھی شراب پی جا رہی ہے۔ اس مہلک مرض کا حملہ جناب پر کب سے ہوا؟"

اس سوال کے جواب میں ایک محجوب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا جیسے آج واقعی اس نے وھسکی، شامپین، ورموتھ کی بے شمار بوتلیں خالی کر ڈالی ہیں۔ جیسے اس کی نس نس نشے میں ڈوبی ہوئی ہو حالانکہ آج وہ بار کے پاس تک نہیں پھٹکا تھا۔ اس کے ہوش میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایسی سہانی رات میں یوں ساقی و شراب سے بیگانہ وار بیٹھا تھا۔ اور جب اس کے ساتھی پھر رقص کرنے چلے گئے تو وہ جلدی سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر بیٹھ گیا تاکہ وہاں سے اچھی طرح دیکھ سکے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد یکایک ہال کی تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ اور اسٹیج پر سُرخ قمقموں کی روشنی نے گویا آگ سی لگا دی۔ پردہ ہٹا اور ایک رقاصہ شعلۂ جوالہ سی ناچتی تھرکتی ہوئی چھم چھم کرتی نظر آئی۔ تماشائی اُچک اُچک کر اُسے دیکھنے لگے۔ کتنے ہی اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک نے اپنی دُوربینیں سنبھال لیں۔ کیا بوڑھا کیا جوان ہر ایک کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اور اس وقت وہ بھی ناچ دیکھنے کے بہانے سے جلدی سے اٹھ کر اس کونے کی طرف چلا گیا۔ اور اس کے قریب کے ایک ستون کے ساتھ لگ کر اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ کیسی باوقار، کیسی پُرتمکنت اور کیسے دلکش انداز سے بیٹھی تھی۔ ہر چیز سے بے نیاز ہر شے سے لاپروا۔ جیسے یہ سب اس کے نزدیک ایک ادنیٰ مذاق کا درجہ رکھتا ہو۔ اور وہیں کھڑے کھڑے اُسے معاً ایسا محسوس ہوا جیسے آج تک اس کی آنکھوں پر کسی نے کس کر پٹی باندھ رکھی تھی۔ جیسے آج تک اس نے کسی حقیقت کو پہچانا ہی نہیں تھا۔

سچ مچ یہ مذاق ہی تو تھا۔ زندگی کا ایک بھونڈا سا مذاق بے وقوف لوگوں کو اور زیادہ احمق بنانے والا مذاق — یہ تہذیب تمدن کے ڈھکوسلے — یہ آزادی اور ترقی کے بے سُرے الاپ یہ سائنس اور علم کے دھوکے۔ اور — اس کا نتیجہ یہ لوٹ مار یہ خود غرضی، یہ قتل و غارت۔ یہ رقص اور شراب۔ اور پھر یہ رنگا رنگ کے فیشنوں میں غرق تعلیم و تہذیب سے مزین عورتیں اور لڑکیاں کیسی بھولی بنتی ہیں۔ کیسی حسین بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیسی خوش خوش اور آزاد نظر آتی ہیں۔ ذرا کوئی ان کے من کے اندر جھانک کر دیکھے۔ کیا واقعی وہ ایسی ہی خوش ہیں ایسی ہی آزاد ہیں۔ نہ جانے ان مسکراتی آنکھوں میں کتنا حزن کتنا ملال اور کتنی غلامی بھری پڑی ہے۔ پھر اس ظاہری سج دھج سے کیا فائدہ۔ اس چمک دمک سے کیا حاصل۔ دُنیا کو فریب دینے اور خود فریب کھانے کا نتیجہ؟ دراصل یہ ظاہرداریاں ہی تو انسانوں کے دلوں سے خلوص کی بے بہا دولت چھین لیتی ہیں۔ اس سے تو وہ گاؤں کے رہنے والے سیدھے سادے کسان اچھے ہیں۔ وہ بے خبر سی جاہل اور سادہ دل لڑکیاں اور عورتیں ہی بہتر ہیں جو کچھ بھی نہ جانتی ہوں۔ لیکن نہیں نہیں ان کی سادگی تو حیوانیت کی حد تک پہنچی ہوتی ہے۔ بیچارے گائے بیلوں میں رہتے رہتے خود بھی ڈھور ڈنگر بن جاتے ہیں۔ ایک واقف دماغ ایسے انجان دماغ کی رفاقت کا دُکھ کیسے سہہ سکتا ہے۔

اس خیال ہی سے اس کا دل لرز گیا۔ اور اُسے پھر ایک شوق بھری سی بھرپور نگاہ اس پر ڈالنی پڑی۔ ایسی ہی دلکش سی معیاری عورتیں جو جدید تہذیب و تمدن میں رنگ کر بھی ایسی سادہ لجائی لجائی سی نظر آئیں جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک دلفریب انداز سے انجان انجان سی دکھائی دیں۔ آہ! اس کا یہ خالص ہندوستانی معیاری حُسن، یہ نشوں کی ایک دُنیا لئے ہوئے آنکھیں، یہ نظر فریب لباس اور یہ بھاری آنچل سے نصف ڈھکے ہوئے سیاہ گھٹاؤں کے سے بادل۔ اس کے حواس پر گویا بے خودی سی چھانے لگی۔ آہ! کاش وہ ایک بار اور صرف ایک بار اُس کے ساتھ رقص کرتا۔ صرف ایک ہی بار اس کے صندلی بازوؤں — اچانک ہال روشنی سے جگمگا اٹھا اور پہلی بار محض اتفاقاً اس کی نظریں ملیں — اُف! اُن نگاہوں کا یہ سنگم — یہ کیف بار مسکراتی ہوئی نظریں۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگا جیسے اس کے من میں ایک ساتھ لاکھوں دیوں کی جوت جگا دی ہو۔ جیسے وہ آسمانوں پر اُڑا جا رہا ہو۔

اور پھر جب سب بیٹھ گئے تو اُسے بھی مجبوراً اپنی جگہ جا کر بیٹھنا پڑا۔

اس کے دوست پھر اپنی اپنی ہانکنے لگے "یار چیز تو خوب ہے بہت ہی چھوٹی سی پیاری سی" ایک نے کہا اور دوسرا بولا "کاش میں اس کے ساتھ کچھ دیر کیلئے ناچ سکتا۔ مگر تعارف کے بغیر کیسے پوچھا جائے۔ ایسی دلکش اور نازک اندام ہستی کا ہم رقص بننا کس قدر مسرت انگیز ہو سکتا ہے۔ کیسی کومل ہے۔ جیسے جوہی کا پھول!"

اور اس نے قہر آلود نظروں سے ان سب کو گھورا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ان سب کی آنکھیں پھوڑ ڈالتا۔ وہ اپنے سوا ہر ایک کی آنکھیں بند کر دیتا۔ یہ بدمذاق، بدتمیز چلے ہیں اس کی تعریف کرنے۔ "جیسے جوہی کا پھول" کیسی عامیانہ سی تشبیہہ ہے وہ تو... وہ تو... لیکن اسے کوئی تشبیہہ اس کے قابل ملی ہی نہیں۔ اور اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کی سندرتا ہر تشبیہہ سے بالاتر ہے۔

پھر کتنی بار وہ مدہوش کن نظریں اس کی پیاسی نگاہوں سے ملتی رہیں۔ جیسے کچھ کہنے کیلئے لفظ ڈھونڈھ رہی ہوں۔ اور پھر جیسے چشم زدن میں رات کے دو بج گئے۔ ایک دم سے سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ وہ اور اس کے ساتھ آیا ہوا مرد بھی۔ اور وہ آخری بار ایک دیوانہ کن نگاہ سے اُسے از خود رفتہ بنا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بے خودی کے عالم میں جلدی سے ان کے پیچھے ہو لیا لیکن اچانک بہت سے آدمیوں کا ایک ریلا آیا اور اُسے اس کی آنکھوں سے اوجھل کر گیا۔ وہ دھکم دھکا کر کے ہوا کی تیزی سے نیچے اترا۔ اس نے پیدل چلنے والوں سے لیکر گاڑیوں میں سوار ہونے والوں تک سبھی کو بیتابانہ طور پر دیکھا مگر اس کا کہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ گویا وہ بانسری سے نکلی ہوئی ایک دلکش صدا تھی جو پلک جھپکنے میں فضا کے اندر تحلیل ہو گئی ___ اور پھر آٹھ دن، آٹھ بیقرار اور ویراں سے دن ___ اس نے کس طرح گذارے۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس پر تو کسی نے جیسے جادو کر دیا تھا۔ اس کی دُنیا بدل چکی تھی۔ ایک بیتاب آرزو تھی جو ہر وقت اس کے دل کو بیقرار رکھتی۔ ایک بیکل جستجو تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی۔ وہ کسی نوعمر اور نوآموز طالب علم عاشق کی طرح بے مقصد ادھر اُدھر مارا پھرا۔ کوئی سیرگاہ، کوئی ہوٹل، کوئی بال روم اور شہر کا کوئی حصہ اس نے ڈھونڈھنے سے نہ چھوڑا۔

رات گئے جب وہ بے نیل و مرام گھر واپس آتا تو اس کا جسم تکان سے چُور چُور ہو رہا ہوتا۔ جیسے شدید مشقت کر کے آیا ہو۔ اور پھر آج شام کو جب وہ اپنی ناکام تلاش کے بعد تھکے تھکے افسردہ قدموں سے واپس لوٹ رہا تھا دفعتاً یکایک سامنے سے وہ آتی دکھائی دے گئی۔ وہی شاعرانہ سی چال، ویسا ہی خوبصورت لباس، وہی سر پر سے سرکتا ہوا زرکار دھاری آنچل کا دوپٹہ۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے گہری اندھیری رات میں کاتک کی چاندنی یکایک کھل گئی ہو۔ جیسے کسی برسوں کے پیاسے کے مُنہ میں امرت ٹپکا دیا گیا ہو۔ اور وہ ناکام ایک بیوقوف لڑکے کی طرح سڑک کے جنگلے سے لگ کر اُسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور جب ذرا فاصلہ سے اس نے اس کی طرف دیکھا تو فرطِ مسرت سے اس کا دل کیسے زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خوشی کے آنسو بھر گئے۔ اور پھر اُس کی طرف دوبارہ ایک نظر ڈالے بغیر وہ اس کے قریب سے ہو کر گذر گئی۔ اتنے قریب سے کہ اگر وہ چاہتا اور اُسے ہمت ہوتی تو اس کا آنچل آسانی سے چھو سکتا اور آن واحد میں وہ ایک طرف کو مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جیسے کوئی آسمان کا چمکتا ستارہ ٹوٹ کر ایک لمحے کیلئے دُنیا کو روشن کرتا ہوا کہیں دور خلا میں غائب ہو جائے۔ اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی تیز رفتار موٹر میں بیٹھا ہوا نیچے کسی گہرے کھڈ میں اترتا چلا جا رہا ہو۔ جیسے اس کی آنکھوں کے آگے برسات کی راتوں کا سا اندھیارا چھا گیا ہو۔ لیکن مسرت کیسی، یاس بھی بات ہوئی بالکل ساون کی ہواؤں کی طرح بے اعتبار کرا بھی دنیا پر ستی اور نشے کی بارش کر رہی تھی، ابھی نہ جانے کہاں غائب ہو کر وہی دم گھونٹ دینے والا حبس اپنے پیچھے چھوڑ گئیں ___ اور وہ راہگیروں کی پرواہ لئے بغیر وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

کیا وہ سب دھوکا تھا، سراب تھا، اتنے دنوں وہ غلط فہمی ہی میں مبتلا رہا تھا۔ آخر وہ اس رات کیوں بار بار اس کی طرف محبت پاش اور جادو اثر نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ کیوں اُسے مسکراہٹوں کے انمول خزانے بخشتی رہی تھی ___ اور آج! ___ آج ایک بار اس نے دیکھ کر دوبارہ نگاہ غلط انداز سے بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا ___ کیا اُسے اپنے بلند معیار اور

تفوق کا غرور ہے؟ اپنی بے پناہ مقناطیسی طاقت کا گھمنڈ ہے؟ کیا ایسی مغرور معیاری عورتوں کے لئے یوں بیقرار ہونا حماقت نہیں؟ —

اور وہ بھاگا بھاگا اسی ہوٹل میں جا پہنچا، جیسے کوئی خالی ہاتھ شرابی تاڑی خانہ سے پٹ کر نکلا ہو۔ اور وہاں اس نے بھوکی نظروں سے ہر طرف دیکھا اور ایک خوبرو اینگلو انڈین لڑکی کو ہمراہ لیکر رقص کرنے لگا۔ کتنی سہل الحصول تھی یہ لڑکی۔ اس نے ایک لمحہ کیلئے سوچا لیکن دورانِ رقص میں اس کے دل میں پھر انہی خیالات کا ہجوم ہوا۔ وہ اُسے بھول جانے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اُسے جس کو اُس نے پہلی اور آخری بار اپنی روح کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہا ہے۔ وہ اس کی یاد سے کسی قیمت پر بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ وہ اس لمحے کے عوض جو ایک جاں فزا تصور میں بسر ہو، اپنی ساری جوانی، ساری عزت، اور اپنی ساری بیقرار زندگی دینے کو تیار تھا۔ وہ اس کی طلب اور تلاش میں عمر بھر بے وقوفوں کی طرح مارا مارا اور تباہ حال پھر سکتا ہے۔

اور پھر بالکل لاشعوری طور پر وہ دھیمے دھیمے سُروں میں گنگنانے لگا۔ ع

"جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں"

— بلقیس بیگم شیریں

یہ وسعتِ بیکنارِ صحرا

یہ وسعتِ بیکنارِ صحرا
ہماری جرأت کا امتحاں لے رہی ہے شاید۔
ہزار ہا کارواں ادھر سے گذر چکے ہیں
ہزاروں آئیںگے — پھر بھی ایک شانِ بے نیازی سے
سب کو یہ دیکھتی رہے گی
نہ کچھ کہے گی نہ کچھ سُنے گی!
بھٹک گیا ہی اگر کوئی راہ میں تو اس کا ملال کیوں ہو؟
بہت سے ایسے بھی ہونگے جن کو ملا ہے اپنے ہی نقشِ پا سے سُراغِ ہستی
کہاں گئے وہ؟
یہ کون جانے!
زمیں نے اپنی گداز باہوں میں شاید اُن کو پناہ دی ہو
مگر کوئی دلگداز نغمہ
کوئی محبت بھری حکایت
سُنا ہوا کوئی حرفِ شیریں
فضا میں اب تک تڑپ رہا ہے
یہی تو وہ شے ہے جسکو لائے تھے وہ ازل سے
یہی وہ دولت ہے جسکو وہ اپنے ساتھ لیجائیں گے ابد تک!

یہ وسعتِ بیکنارِ صحرا!
میں اک نحیف و زار رہرو!
مگر اے ذرّاتِ نور پیکر! گواہ رہنا
ادھر سے گذرا تھا اک مُسافر
مچل رہے تھے ہزاروں نغمات جس کے دل میں
مگر زمانہ نے اس کے ہونٹوں کو سی دیا تھا!

— منیب الرحمٰن

جشنِ فتح کی رات

دو متضاد جذبے انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ حزن و ملال اور کیف و سرور! باوجود اس کے غم کا ایک قطرہ اپنی گہرائیوں کے اعتبار سے مسرت کے دریائے ناپید اکنار کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے!!

دو مختلف صدائیں صحرائے زندگی کے بعید ترین گوشوں سے انسان کو پکارتی ہیں۔ خوش قسمتی اور بدنصیبی! وہ انتہائی تیزی کے ساتھ گرم رفتار ہوتا ہے۔ اور خوش قسمتی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے سامنے نظر آتی ہے، لیکن اس کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں کے نوکیلے پتھر اس کے تلووں کو چھلنی کرتے ہیں۔ خارِ مغیلاں کی زہر آلود نوکیں اس کی ہتھیلیوں کو مجروح کرتی ہیں، اردگرد سے بلند ہونے والی آہ و بکا اس کے حواس پراگندہ کرتی ہے۔ اور ذمہ داریاں اسے میدانِ عمل میں جدوجہد کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔ اس طرح جذباتِ رحم اور سیلابِ مصائب کی کشمکش میں خوش قسمتی کی یاد تک اس کے ذہن میں باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ بدبختی ایک حقیقت ہے اور خوش نصیبی ایک واہمہ!

دو متضاد جذبے انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یا حزن و ملال اور کیف و سرور، حالانکہ غم کا ایک قطرہ اپنی گہرائیوں کے اعتبار سے مسرت کے دریائے ناپید اکنار کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے۔!!

اس دن اور رات کی یاد اب تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ جب اتحادیوں کی توپوں کی اس گرج نے فتحمندی اور کامیابی کی خوشخبری سنائی، جس نے بارہا میدانِ جنگ میں انسانی زندگی کی ارزانی و بے وقعتی اور قومی مفاد کی اہمیت کا ببانگِ دہل اعلان کیا۔ اس شاندار جشن کو جس کی مسرتیں دارالحکومت کے گوشے گوشے پہ چھا گئیں، جس کی خوشی ... دہش کرنے والے دریادلوں اور عیش و عشرت کرنے والے ... مرانے برابر کا حصہ لیا۔ بھلا کون بھول سکتا ہے؟

لیکن دن کی روشنیاں تہواروں اور جشن سامانیوں کو اکثر بے رونق سا بنا دیتی ہیں اور عیش و عشرت کی محفلیں تاریکیوں ہی کے پردے میں اپنی پوری زیب و آرائش کے ساتھ جلوہ ریز ہوتی ہیں۔

اور اے تاریکی! تو وفا شعار ہے۔ جب آفتاب غروب ہوتا ہے، تو پرسکون اور متجسس انداز میں قریب آتی جاتی ہے تو اس عاشق محبوب کی طرح ہے جس کی پرجوش الفت کی زبان پر لب کشائی سے بہت پہلے دل کی بات مچلتی نظر آتی ہے۔ اور جو کسی لہجے یا انداز کو اختیار کرنے سے پہلے متعدد طریقوں سے سب کچھ کہہ ڈالتا ہے۔

اے تاریکی! اسی طرح آج پھر فضائے عالم پر تیرے چھا جانے کا وقت آپہنچا ہے۔ وہ سامنے افقِ مغرب پر تاریکیاں اپنے مختلف رنگوں میں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ اور ان کے درمیان چمکنے والے ستاروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعزازی تمغے اور امتیازی نشانات ہیں ——— بہادروں کے سینے پر!

فتح کی محرابیں جھنڈیوں کی کثرت سے نازک کمر کی طرح لچک گئی ہیں۔ روشنیاں دور سے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی روحوں کی طرح پراسرار اشارے کر رہی ہیں۔ باجوں کے طرب ناک نغمے ہر طرف سے فضا میں منتشر ہو رہے ہیں۔ سپاہی فوجی بینڈ کی تال پر گلی گلی چکر لگا رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا وہ کدھر سے آ رہے ہیں اور کہاں جائیں گے!

شور برپا کرنے والے طیارے جب بلند آسمان پر معلق نظر آتے ہیں اور اپنی نورانی شعاعیں زمین پر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ستارے آسمان کے سیاروں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔

فضائے عالم پر نو دِ مسرت اور خمارِ جشن طاری ہے، قلبِ شہر سے فتح و مسرت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر چیز میں چمک اور تڑپ، ہر نظارے میں سرور اور بیتابی پائی جاتی ہے۔ اب نعرہ ہائے

مسرت مجھ سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اپنے بالاخانے سے خوشیاں منانے والوں کو دیکھوں گی تاکہ ان کی مسرتوں میں شرکت کر سکوں!

لیکن . . . !

دو متضاد جذبے انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں: حزن و ملال اور کیف و سرور، حالانکہ غم کا ایک قطرہ اپنی گہرائیوں کے اعتبار سے مسرت کے دریائے ناپیدا کنار کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے!!

جب انسان سرشارِ مسرت سے چور ہو کر یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اجتماعی حدود اور قوانینِ فطرت اس کے عیش و عشرت اور لطف اندوزی کی تکمیل کے مقابلے پر تھوڑی دیر کیلئے ایک غیر ضروری اور بے جان شے بن کر رہ گئے ہیں۔ تو یہی چیزیں اچانک اپنے حقائق و معانی کی پوری باریکیوں اور اپنے مطالب و مقاصد کی مکمل قوت کے ساتھ کارفرما ہوتی ہیں۔

. . . . اور دفعتہً شور و غل کے سیلاب میں سے ایک عجیب و حزیں نغمہ بلند ہوا۔

میں ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی اور قریب کے مکانات پر ایک متجسسانہ نظر ڈالی تاکہ اس شور و غل کی وجہ دریافت کر سکوں میں نے اسے مصائب و آلام کے بھیانک روپ میں بہت جلد پا لیا، جس کی بے پناہ حرارت سے ذرات قلب پگھل جاتے ہیں۔

مقابل کے مکان کی بالائی منزل پر میں نے دیکھا کہ چار آدمی ایک مختصر سے کمرے سے کچھ سامان نکال رہے ہیں۔ اور ایک بوڑھی عورت کو جو بار بار التجا کر رہی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہے بُری طرح جھڑک رہے ہیں۔ بیچاری بڑھیا! خمیدہ پشت، کریہہ المنظر، جس کی پیشانی پر زندگی کے موسم سرما نے بڑھاپے کی برف بکھیر دی تھی۔ اس نے پانچ مہینے سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ بے رحم مالک خانہ اور نیلام والوں کا ہتھیار سنبھالا اور نیلام کیلئے اس کا مال ضبط کر لیا گیا۔ اب وہ اس تنگ و تاریک کمرے سے ہی نہیں بلکہ دو مکان سے آسمانی گنبد کے نیچے دھکیلی جا رہی ہے۔

خوشی دفعتہً اس سیلابِ تاریکی میں تڑپنے والی شعاعوں کو جو زہریلے ناگوں کی طرح فضا میں لہرا رہی ہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہیں — دیکھ رہے ہیں اور جھوم رہے ہیں۔ بدنصیب بڑھیا اپنے مال و اسباب کو جو ہمیشہ کے لئے غصب کیا جا رہا ہے، حسرت بھری نظروں سے بار بار دیکھ رہی ہے — دیکھ رہی ہے اور رو رہی ہے! کاش! قطرات اشک زر و سیم کی صورت اختیار کر لیا کرتے۔ تاکہ مقروض انسان اس طرح اپنے قرض خواہوں کے مطالبے پورے کرنے کے قابل ہو جاتے!

یہ چوکی ہے — جس پر وہ بیچاری اپنا خشک اور بے روغن کھانا کھاتی تھی۔ یہ پلنگڑی ہے — جس پر اس غریب نے اکثر وحشت ناک راتیں اس کے راز ہائے سربستہ کی ادھیڑ بن میں گذار دی ہیں۔ یہ آئینہ ہے — جس میں اسے اپنے غمگین چہرے، بھدے جسم اور مسلسل بہنے والے آنسوؤں کا عکس نظر آتا تھا۔

دردناک ہے — بہت دردناک ہے حسرت بھرے آنسوؤں کا منظر درشت و سرد آئینہ کی سطح پر!

وہ اپنے اس حقیر اور کم حیثیت اسباب خانہ داری کو کتنا عزیز رکھتی تھی۔ وہ اکثر ان چیزوں کو محبت و شکایت اور تشکر و تأسف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ چھوتی تھی۔ اب یہ تمام چیزیں اس کے قبضے میں نہیں رہیں گی۔ آہ! اب وہ انھیں کیسے حاصل کر سکے گی؟

لو! اب ان لوگوں نے کمرے کی بڑی اور بھاری چیزیں بھی نکالنی شروع کر دیں۔ بوڑھی عورت لڑکھڑاتی ہوئی ان کی طرف چلی۔ اور اس کی درد آمیز آہیں اور ارتعاش انگیز سسکیاں اس کے حلق میں اٹک رہی ہیں۔

یہ تخت ہے — جس پر اس کے درماندہ اعضا اکثر دن بھر کی مشقت کے بعد سکون و راحت سے ہم آغوش ہوتے تھے۔

وہ تخت بھی دوسرے اسباب کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ وہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اور دفعتہً اس پر سکون و خاموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا سر آہستہ آہستہ جھکنے لگا، یہاں تک کہ اس کے سینے پر آ کر ڈھلک گیا۔ اور وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ گویا وہ مجسمہ حزن و ملال تھی اپنے کسی دوست کے مدفن پر!

لوگ فرطِ مسرت سے چیخ رہے ہیں۔ توپیں گرج رہی ہیں

اور کثرتِ نور سے تیرہ و تاریک رات روشن و منور دن کی طرح چمک رہی ہے۔ لیکن مجھے اس بدنصیب بوڑھی عورت کے چہرے پر یاس و نا امیدی کی گہری نقاب پڑی نظر آتی ہے۔ میں نے محسوس کیا گویا نظرِ غور سے مسلسل دیکھنے والے ستارے اس بیکس و لاوارث بڑھیا کی چارہ سازی کیلئے ہمدردانہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

دو متضاد جذبے انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، حزن و ملال اور کیف و سرور! حالانکہ غم کا ایک قطرہ اپنی گہرائیوں کے اعتبار سے مسرت کے دریائے ناپیدا کنار کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے۔!!

دو مختلف صدائیں صحرائے زندگی کے بعید ترین گوشوں سے انسان کو پکارتی ہیں، خوش قسمتی اور بدنصیبی! وہ انتہائی تیزی کے ساتھ گرمِ رفتار ہوتا ہے اور خوش قسمتی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اُسے اپنے سامنے نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے حصول میں ناکامیاب رہتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں کے نوکیلے پتھر اس کے تلووں کو چھلنی کرتے ہیں۔ خارِ مغیلاں کی زہر آلود نوکیں اس کی ہتھیلیوں کو مجروح کرتی ہیں۔ اردگرد سے بلند ہونے والی آہ و بکا اس کے حواس پراگندہ کرتی ہے۔ اور ذمہ داریاں اسکو میدانِ عمل میں جدوجہد کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔ اس طرح جذباتِ رحم اور سیلابِ مصائب کی کشمکش میں خوش نصیبی کی یاد تک اس کے ذہن میں باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ بدبختی ایک حقیقت ہے اور خوش نصیبی ایک واہمہ!

دو متضاد جذبے انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں حزن و ملال اور کیف و سرور! حالانکہ غم کا ایک قطرہ اپنی گہرائیوں کے اعتبار سے مسرت کے دریائے ناپیدا کنار کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے!!

تماشائی جشنِ فتح میں شریک ہونے کے شوق میں حدیقۂ ازبکیہ کے جانے والے راستوں پر ہجوم کی صورت میں بہے جا رہے ہیں۔ ہے کوئی جو اس بدنصیب بڑھیا کو اس بڑھتے ہوئے انسانی سیلاب میں سے ڈھونڈھ نکالے۔

تو اگرچہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ لیکن اے بدنصیب بڑھیا! مجھے برابر تیرا فکر لگا ہوا ہے۔ تو کہاں چلی جا رہی ہے؟ کیا تو کسی ایسی انجمن میں جانا چاہتی ہے جس کا مقصد تو رفاہِ عام ہوتا ہے لیکن راتوں کو اکثر اس کے دروازے مقفل نظر آتے ہیں؟ یا تو کسی ایسے مخیر انسان کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی ہے جو بسا اوقات ظاہری خوبصورتی اور جسمانی حسن سے بے بہرہ سائلوں کی پرواہ نہیں کرتے؟ یا تو کسی عظیم الشان مکان کے دروازے پر رات گذارنا چاہتی ہے حالانکہ لوگ چوکیداروں اور پولیس والوں کی طرح ہر بے گھرے انسان کو مفرور چور سمجھنے کے عادی ہیں۔

کیا تو اب بھی اسی طرح رو رہی ہے؟ اپنے مرتعش ہاتھ اسی طرح سوال کیلئے بڑھا رہی ہے۔ اور لذتِ مسرت کے متوالے بے اعتنائی کے ساتھ تجھ سے کتراتے نکلے جا رہے ہیں؟ اصل میں ہر وہ مصیبت زدہ انسان جو لوگوں کی مسرت کو مکدر کر دیتا ہے سب سے زیادہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔ کیا تو کسی محبت بھرے دل کے جذبۂ رحم کو اُبھار رہی ہے۔ حالانکہ تو حسن و جوانی کی دولت سے محروم ہے جو لوگوں کے دل جوش اور ولولے سے پُر کر دے؟ نہ تو دلکش حسین صورت رکھتی ہے کہ دیکھنے والے خود کھنچے چلے آئیں یا تو دریائے نیل جیسے دردمند کی گود میں پہنچ جانے کا عزمِ مصمم کر چکی ہے — جو احسان کرتا ہے اور اس کے عوض کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ یقیناً تو اس کی لہروں کو نرم و نازک سینے کی طرح پائیگی اور اس کے پانی میں محبت اور ہمدردی کی شیرینی محسوس کریگی۔ اس طرح تو اس موت کا خیر مقدم کریگی جس کی گود میں تو ابتدائی لمحے سے لیکر ابتک پرورش پاتی رہی ہے؟

تیرا رُخ خواہ کسی طرف بھی ہو، ذرا توقف کرتا کہ میں تجھے الوداع کہہ سکوں۔

اگرچہ میری نظریں تجھے نہ پا سکیں۔ لیکن پھر بھی تیری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ میری دائمی محبت تیرے ساتھ ہے۔ اور میری رُوح جو تیری ہستی سے پیدائشی وابستگی رکھتی ہے، تیری ہمسفر ہے!

میری روح تجھ سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہے اے بیکس و لاچار!

تو بھی میری ہستی سے آشنا ہے؟ میں نوجوان ہوتے

ہوتے بھی ایک لمحہ کیلئے تیری ماں بن سکتی ہوں، اے بدنصیب بڑھیا!

بہر حال اس وقت مائکل بیمار کا سا ہے، تجھے اس وقت ماں کی سی سچی محبت کی ضرورت ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ماں کے ہوتے ہوئے صحیح معنوں میں محبتِ مادری اور اس کی برکتیں حاصل ہوں!

میں ابھی تیرے کانوں میں ایسے شیریں و محبت آمیز بول کہوں گی، جن کے اسرار سے سوائے مظلوموں کے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ میں ابھی تیرے آنسوؤں کو نازک نرم گلاب کی پتیوں میں جذب کر لوں گی۔ پھر اس گلاب کو جس میں دل کے یہ بیش بہا موتی جذب ہو جائیں گے، آنسوؤں اور حزن و ملال کے دیوتا کی خدمت میں پیش کر دوں گی۔

تو تنہائی کا شکوہ مت کر چونکہ تجھ جیسے حرماں نصیب بہت ہیں۔ تو اپنی قسمت کا گلا بھی مت کر چونکہ غم کی مورتیں بہت سی ہیں اور بدنصیبی کے ردیب بے شمار ہیں۔ جب تک محرومیت کا حُسن نظر سوز تجھ میں موجود ہے تجھے بدصورت نہیں کہا جا سکتا۔ تجھے کوئی ضعیف العمر نہیں کہہ سکتا۔ جب تک کہ تیرا چشمۂ اشک ابتدائے آفرینش کی طرح اپنے پورے شباب پر ہے۔

آج تیرے وجود میں فردِ حقیقی جلوہ نما ہے اور یہ خوشیاں منانے والے فردِ مجازی کی مانند ہیں۔ تو ایک ذات ہے صاحب عظمت اور ذی شان، اور یہ سب ہستیاں ہیں بے مایہ و کم مایہ! تو ایک پختہ حقیقت ہے، اور وہ سب ایک خیالِ خام، تو حزن و ملال کا وہ قطرہ ہے جو مسرت کے بحرِ ناپیدا کنار پر چھایا ہوا ہے۔ چونکہ لہو و لعب اور عیش و عشرت کا انجام ایک قسم کا سکون اور بے حسی ہے اور حسرت و مایوسی کے بعد نفسِ انسانی جذبات سے بھر، ورزشِ قلبی سے مشتعل اور آنسوؤں سے شاداب ہو کر اور پھر کارفرمائے حیات اس کی گہرائیوں میں ممکن و ناممکن کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھاتا ہے۔

دو مختلف صدائیں صحرائے زندگی کے بعید ترین گوشوں سے انسان کو پکارتی ہیں: خوش قسمتی اور بدنصیبی! وہ انتہائی تیزی کے ساتھ گرمِ رفتار ہوتا ہے، اور خوش قسمتی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے سامنے نظر آتی ہے لیکن اس کے حصول میں ناکامیاب رہتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں کے نوکیلے پتھر اس کے تلووں کو زخمی کرتے ہیں، خارِ مغیلاں کی زہر آلود نوکیں اس کی ہتیلیوں کو مجروح کرتی ہیں۔ اردگرد سے بلند ہونے والی آہ و بکا اس کے حواس پراگندہ کرتی ہے۔ اور دمداریاں اُسے میدانِ عمل میں جدوجہد کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔ اس طرح جذبات رحم اور سیلابِ مصائب کی کشمکش میں خوش قسمتی کی یاد بھی اس کے ذہن میں باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ بدبختی ایک حقیقت ہے اور خوش نصیبی ایک واہمہ!

"آشنا"　　　　صلاح الدین قریشی

من گھڑت

مجھے مضمون کی تلاش تھی۔ افسانے کے لئے کوئی معقول پلاٹ سوجھتا ہی نہ تھا اور افسانہ لکھے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ افسانہ لکھنے سے مجھے کوئی خاص دلچسپی ہے، بلکہ محض اس وجہ سے کہ اگر اس مہینے کوئی افسانہ فروخت نہیں ہوا (میرا مطلب ہے کہ بکوا نہیں گیا) تو ایک بڑا اہم اور ضروری خرچ کس طرح پورا ہوگا۔ آج سارا دن پلاٹ سوچتے اور پڑھتے پڑھتے گذر گیا تھا۔ شام کو کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھیں تو اہلِ محلہ کی نقل و حرکت سے انسان کو بہت سے نئے خیالات سوجھ سکتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ کھلی ہوئی کھڑکی میں محلہ کے اطراف و جوانب کو دیکھتا رہا۔ عورتیں چھتوں پر بیٹھی ہوئی سینک رہی تھیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے سروں میں سے جوئیں نکال رہی تھیں۔ بڑھیاں پرانے لحافوں میں ٹانکے ڈال رہی تھیں۔ نیچے گلی میں امرود والا امرود بیچ رہا تھا۔ ایک ٹھیلا جس پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں راستہ میں اڑا کھڑا تھا اور سواریوں کو بیچ میں جانے سے روک رہا تھا۔ مزدور کو گالیاں دیتے ہوئے لوگ گذر رہے تھے ——— ان سب چیزوں میں کوئی پلاٹ نہیں تھا۔ اور مجھے افسانہ لکھنا تھا۔ لکھنوں کو کام کیسے چلے — پبلشروں سے پیشگی ملتی نہ تھی کیونکہ پیشگی لے کر کھا چکا تھا اور کہیں سے ایسے کسی قسم کی آمدنی کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر الماری کی طرف آیا۔ دیکھکر دل باغ باغ ہو گیا۔ اتنی لمبی قطار میری ہی کتابوں کی ہے مجھے یقین نہ آتا تھا کہ اتنی کتابیں میں نے ہی لکھی ہیں۔ اگر ان سب کتابوں اور مضامین کے ابواب پر ایک پرچہ سوالات میرے سامنے رکھ دیا جاتے تو میں اسے حل نہیں کر سکتا۔ نہ جانے کب کے لکھے ہوئے ایک افسانے کو پڑھنے لگا۔ پلاٹ اور کردار حافظہ میں نہیں رہ سکتے اسے یونہی پڑھ کر رکھ دیا۔ آج کل کا لکھا ہوا ایک افسانہ اٹھا کر دیکھا۔ کوئی خاص بات ذہن میں نہیں آئی۔ یعنی یہ بھی نہیں کہ آیا یہ افسانہ اچھا ہے یا برا۔ یا خاصا۔ اس وقت مجھے دراصل جس چیز کی تلاش تھی وہ ایک مرکزی خیال کی تھی مضمون کی تلاش تھی۔ ایک ایسا موضوع جسے افسانہ بنایا جا سکے اور اس سے تہمت کے علاوہ کچھ رقم بھی پیدا کی جا سکے۔ ادبی قسم کی اگلی گذرار ثابت کی چیز نہیں جو آدمی فرصت کے لمحوں میں دل لگی کے طور پر ہاتھی گھوڑے پنسل سے بنانے کی بجائے، کاغذ پر ادب لطیف کے نام سے لکھنا شروع کر دیتا ہے بلکہ ایک واقعی دلچسپ، پرسوز، حقیقت پر مبنی انسانی تجربہ کی کہانی، جس کو پڑھ کر دل دفعتاً دھڑکنے لگے۔ سانس سرد ہو جائے۔ دماغ میں احساسات و کیفیات کے گھوڑے دوڑنے لگیں اور پڑھنے والا کچھ سوچنے اور کبھی پر مسحور ہو جائے۔ ایک کہانی جس کی ابتدا اچھی ہو، جس کا خاتمہ معقول ہو۔ جس کے کردار اس ہی دنیا کے بسنے والے ہوں جن کی دکھ درد، ہنسی خوشی فکر و راحت کی اپنی کہانی ہو اور انجام کے اعتبار سے لاجواب ہو ——— میرا مطلب ہے کہ مجھے ایک پلاٹ کی ضرورت تھی، ایک کہانی کے موضوع کی جو تقاضا کرتی ہے، جیسی زندگی جیسی نہیں ہوا کرتی ویسی تصوری کیفیت کی ——— کہانیاں پڑھنے والوں کو کیا معلوم ہے کہ ہم لوگ کس قدر جھوٹے ہوتے ہیں۔ حقیقت اتنی سیدھی سادی، اتنی دل گداز، اتنی رنگین یا پُرتکلف کہاں ہوتی ہے جیسی ہم بنا دیتے ہیں۔ ہم سکنڈ ہینڈ چیزیں سستے داموں پر بیچتے ہیں، اور کوئی ہمیں نہیں پکڑتا۔ آخر یہ کیا ستم ہے!

پرانے مسودوں اور کتابوں سے ہٹ کر میز پر آ بیٹھا۔ یہاں کیا رکھا ہے آج کی ڈاک میں آئے ہوئے رسالے۔ پرانے دوستوں کے خط۔ کبھی کبھار دو ایک پڑھنے والوں یا پڑھنے والیوں کے تعریفی خط بھی آجاتے ہیں اور دل پھولا نہیں سماتا۔ سب سے بڑھ کر خوشی اس لفافہ کو کھول کر ہوتی ہے جس میں معاوضہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے کی بشارت ہو یا کسی دور اندیش خیرخواہ نے مارے خلوص کے چیک ہی ملفوف کر دیا ہو۔ ایک آدھ بل بھی آجاتا ہے اور جیسے مکروہ اولاد کے جنم پر امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں ایسی ہی میری حالت البتہ بلوں اور تقاضوں کو دیکھکر ہوتی ہے۔ آج کی ڈاک میں بھی تقریباً ایسی ہی چیزیں تھیں۔ بھلا ان سے کیا خاک پلاٹ مل سکتا ہے جب اصل زندگی دریچے میں سے نہیں دکھائی دیتی۔ سڑک پر چلتی پھرتی مجھے نہیں سجھائی دیتی۔

کتابوں کے اوراق سے مجھے کچھ مدد نہیں مل سکی تو پھر پلاٹ کہاں سے ملتا ہے۔ ہر روز ڈاک آتی ہے ڈاک برآمد لگی رہتی ہے اور اُمید پر دنیا قائم ہے یعنی ڈاک پر۔ شام کی چار بجے کی ڈاک کبھی آتی ہے اور کبھی نہیں آتی اگر آ بھی جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ جیسی ایک ڈاک ویسی دوسری ڈاک۔ عورت عورت ہے اور ڈاک ڈاک میں سوائے "نفسِ مضمون" کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن خیر نیچے اتر کر جھانک کر دیکھا۔ سات برساتیں (بہاریں نہیں!) دیکھا لیٹر بکس وہیں جا کھڑا تھا۔ ہاں! ایک خط۔ تو گویا آ ہی گیا۔ یہ محض اتفاق تھا۔ لیٹر بکس کھولا ایک خط۔ تو اس سے کیا ہوگا۔ اس سے کیا کام چلے گا۔ دو تین منٹ میں اس کی عمر بھی تمام ہو جائیگی۔ ٹائپ شدہ لفافہ تھا۔ بظاہر کسی جلسہ یا "یوم" فلاں کی دعوت ہوگی۔ یا کوئی صاحب کسی صاحب سے کسی جگہ کسی وقت چائے پئیں گے۔ اور چند احباب کے علاوہ کچھ عمائدین شہر کو بھی مدعو کیا گیا ہوگا اور ان میں شاید میں بھی مدعو کر لیا گیا ہوں گا۔

بہرحال خط لے کر اوپر آیا خط کو غور سے دیکھا تو جی نے گہرا سانس لیا یعنی یہ کہ زنانہ خط میں پتہ لکھا ہوا تھا اور اُسے کاٹ کر میرا پتہ انگریزی ٹائپ میں طبع کیا گیا تھا معلوم ہوا کہ رسالہ "امروز و فردا" کے دفتر سے پتہ سبدل ہوکر آیا ہے۔

اچھا صاحب، ایک بات میں اور بتا دوں ہم لوگ، یعنی افسانہ نویس، طبیعت کے بہت بھدّے اور اوچھے ہوتے ہیں اور جہاں کسی بات میں عورت کا نام آیا اور ہم اوچھے ہونے شروع ہوئے۔ یہ اندرونی اور پس پردہ والی بات ہے۔ ظاہر ہمارا بالکل مثالی اور خوبصورت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی میری یہی حالت ہوئی، کسی مدّاح خاتون کا خط آنا ہمارے لئے عید کی سی خوشی لاتا ہے اور اس کے لئے ہم خاص رومانٹک فضا اپنے دماغ میں جنم لیتی محسوس کرنے لگتے ہیں اور اگر خط پڑھنے کی جلدی نہ ہو تو اتنے عرصہ میں دماغی طور پر اس مکتوب نویس کو آوارہ تو سا ہی دیتے ہیں!

خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اوہو، ایسے خط تو اکثر آتے ہیں "میں نے آپ کا فلاں افسانہ پڑھا نہایت عمدہ تھا۔ میرے دل پر بہت اثر ہوا لیکن میں ایک افسانہ لکھنا چاہتی ہوں مگر لکھنا نہیں آتا۔ کیا آپ برائے کرم اسے ٹھیک کر دیں گے۔ یا یہ کہ میں واقعات لکھکر بھیج رہی ہوں۔ نام مقام بدل کر اس کی ایک سٹوری لکھدیں کیونکہ میں اپنی اُس سہیلی کو جس کا یہ واقعہ ہے دکھانا چاہتی ہوں۔"

اِس قسم کے خط ہمارے پاس اکثر آتے ہیں اور اتراتے تو ہیں مگر دل ہی دل میں جلتے ہیں کہ اب اس خاتون سے عشق کرنے کو جانا پڑیگا۔ ایک خاتون ہیں جو الہ آباد ہی ملاقی رہتی ہیں۔ اور دوسری ایک اور ہیں جو صرف ایک بار ملنا چاہتی ہیں۔ ہمیں ایک بار کیا ہزار بار دیکھکر بھی ہوس نہ ہو۔ ان سب خطوں کے جواب دینے کے لئے روزانہ کافی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جواب طلب امور کے لیے لفافہ نہ بھیجنا قانوناً ممنوع ہونا چاہیئے۔

یہ خط اُودی روشنائی سے لکھا ہوا تھا: معلوم ہوتا تھا۔ دو پیڑے لگنے کے بعد مکرّمہ نے رنگ کا لقبہ حصّہ دوات میں ڈال دیا تھا۔ خیر اسے پڑھا۔ لکھنے والی کا نام تھا۔ "بیگم عابدہ رمزی" خط آگرہ سے آیا تھا۔ مکرمہ نے لکھا تھا کہ آپ نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ سب میں نے پڑھا ہے اور آپکی تحریروں سے میری طبیعت سیر نہیں ہوتی —— اس قسم کے الفاظ عورتیں اکثر لکھتی ہیں اور اناڑی مصنف ان کے جھوٹ کے جال میں پھنس جاتے ہیں، یہ میں آپ کو بتلائے دیتا ہوں —— ہاں۔ تو مکرمہ نے تحریر کیا تھا کہ میں ہندوستان میں سب سے زیادہ آپ کو لائق سمجھتی ہوں اور اس ہی وجہ سے چاہتی ہوں کہ آپ میری زندگی کا افسانہ لکھدیں۔ اگر آپ زحمت گوارا فرماکر آگرہ آئیں تو میں مل سکتی ہوں میرے ساتھ چائے پی لیجئے عنایت ہوگی۔

بقول غالب ہمارے ہاں تو یاں سے واں تلک سوختن کا باب کھلا ہوا ہے اگر دولت ہوتی اور ایک سکریٹری رکھ سکتے تو سکریٹری کی معرافت لکھواتے کہ بوجہ کثرت کار آجکل فرصت نہیں ہے لیکن آپ نے جو ازراہ کرم پیشکش فرمائی ہے اُس کو قبول نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔ لیکن چونکہ سکریٹری نہیں ہے اس لئے خود ہی جواب لکھدیا مگر اس طرح جیسے سکریٹری نے لکھا ہو۔ "بحوالہ مکتوب مورخہ ۳ راکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء عیسوی جو دفتر رسالہ "امروز و فردا" سے پتہ کاٹ کر مسٹر ..... کے نام آج پہنچا، مرقوم ہے کہ انہیں آپ کی اس نوازش سے مستفید ہونے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ کیونکہ انہیں آجکل ایک "ناول پر کام کرنا ہے" اور اس وجہ سے سخت مصروف ہیں۔ آپ کی نوازش کا شکریہ"

ہم نے جان بوجھ کر ایسا رسمی سا جواب دیا تھا اور دل میں

پتہ نہیں لکھا تھا تاکہ خط کا جواب پہلے والے پتہ پر آئے اور بہت جلد آئے ممکن ہے کہ زیادہ واضح اور رومانٹک آئے!

چنانچہ یہی ہوا۔

دوسرا خط بھی اس ہی رسالہ کی معرفت آیا۔ اس میں بیگم عابدہ مری صاحبہ نے لکھا تھا کہ آپ کے خط سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ اگر آنا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں میں لکھ کر پلاٹ بھیج دیتی ہوں۔ اس خط کا جواب ہم نے خود دیا ـــــ دیا تو پہلے بھی خود ہی تھا ـــــ کہ سکریٹری نے میری توجہ آپ کے ان دو خطوط کی طرف دلائی ہے اس سلسلے میں میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں سکنڈ ہینڈ معلومات کا قائل نہیں ہوں اور زندگی کے تجربات کو اس طرح سُن سُنا کر یا دیکھ کر قلم بند کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کی توجہ کا مکرّر شکریہ۔ اس دفعہ ہم نے پتہ درج کر دیا تھا۔ اس لئے جواب اس ہی پتہ پر آیا اور خاتون محترمہ نے بہت جل کر لکھا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ دُنیا کے سارے واقعات جو آپ افسانوں میں لکھتے ہیں کیا آپ پر بیتے ہیں۔ وہ بھی تو سکنڈ ہینڈ ہوتے ہیں پھر میری داستان آپ کیوں نہیں لکھ دیتے۔ میں نے تو سُنا تھا کہ مصنّفوں کو ایسے پلاٹوں کی تلاش ہوتی ہے جو زندگی کے واقعاتی تجربوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

میں نے سوچا کہ یہ کوئی ضدّی عورت ہے اور اسے پتہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ کسی روز گھر پر نازل نہ ہو جائے اس لئے رفع شر کی خاطر اس سے مِل کر اور واقعات سُن کر ایک کہانی لکھ کر سے ٹال دیا جائے۔ اگر کنواری عورت ہوتی تو دلچسپی کا موقع بھی تھا۔ لیکن خیر عورت تو ہے۔ ہیلو ڈینگیں مارنے کے لئے یہ موقع بُرا نہیں ہے۔ پھر یہ کہ مجھے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی معقول تجربہ سُننے میں آ گیا تو اس دفعہ کی مشکل بھی حل ہو جائے گی اور ایک خاتون سے ملنے کا طرب بھی حاصل ہو گا شادی شدہ ہونے کے باوجود بے محابا خط و کتابت اور ملاقات کی بشارت اس کے آزاد منش اور رومانی ہونے پر ویسے ہی دال تھے، اس لئے سب خیالات کو سامنے رکھنے کے بعد میں نے جواب لکھا کہ میں اگر اس ہفتہ کچھ مصروفیتیں کم کر سکا تو آگرہ آؤں گا اور آدھ گھنٹے کے لئے آپ سے مل بھی سکوں گا

تیسرے روز میں نے جواب آتے ہی بغیر بارے تامّل کے خود ہی لکھ دیا کہ ہفتہ کی رات کو دہلی سے چلوں گا اور شب کو ایک بجے آگرہ پہنچوں گا۔ ایک دوست کے ہاں جو بلوچ پورہ میں رہتے ہیں قیام کروں گا اور اتوار کی شام کو پانچ بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک آپ سے مل سکوں گا۔ گو دل میں یہ سوچا تھا کہ اگر رات بھر وہاں رہیں تو کیسا اچھا ہو۔ اوہ! لارڈ!

خط کا جواب آیا کہ میں آپ کی منتظر رہوں گی اور تنہا ہوں گی ورنہ کچھ دوستوں کو بلا سکتی تھی لیکن چونکہ اپنی زندگی کے واقعات رازدارانہ طریق پر سُنانا چاہتی ہوں اس لئے سوائے آپ کے کسی کے سامنے ان کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتی۔

دل میں سوچا یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ لڑکی بہت رومانی ہے۔ بس کام چل جائیگا۔ اب مجھے دلچسپی بخار کی حرارت کی طرح محسوس ہونی شروع ہو گئی تھی۔

چنانچہ اتوار کی صبح چل کر ایک سرائے میں بستر رکھا اور دن کا بقیہ حصّہ ذاتی زیب و زینت میں صرف کیا اور وقت سے پہلے تانگہ میں بیٹھ کر مقرّرہ جگہ کا پتہ کوچوان کو بتا کر چل پڑا۔

یہ مکان ایک تاریک گلی میں تھا۔ پُرانے فیشن کا مکان دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ہم تو افسانوی فضا سوچ کر آئے تھے یہاں تو یکسر معاملہ دگرگوں نکلا۔ یہ تو کچھ حقیقت سی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ افسانوں میں تو بیشک حقیقت جھلکا کرے لیکن جب اپنی باری آئے تو زندگی اتنی حقیقت مآب نہ ہو بلکہ بالکل رومانی ہو جائے۔ یہ بد دیانتی ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہے اور جو لوگ ہماری زندگی کے پس منظر اور ذہن کے خانوں کو نہیں جانتے وہ ہمیں جب تک بھی پُر خلوص حقیقت نگار سمجھتے رہیں تب تک اچھا ہی ہے۔

بہرکیف میں نے دروازہ پر دستک دی ایک لڑکا اندر سے نکل کر آیا میں نے کہا کہ ... سے ایک صاحب آئے ہیں اطلاع کر دو۔ بڑی دیر کے بعد لڑکا آیا اور کہا کہ اندر آ جایئے میں نے خوف محسوس کیا۔ طرح طرح کے وسوسے دماغ میں آ کر رہ گئے قدم اُٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ تذبذب شاید اندر محسوس کیا گیا اور ... کہ آپ تکلّف کیوں کرتے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا ایک اُجڑا ہوا مکان تھا جسے آج کے موقع کے لئے شاید بہتر بنانے کی پوری سعی کی گئی تھی ...

اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بدمزگی سے بچ سکتے اور یہی لغو سا دیا
تھا۔ غرض ہماری کوشش ہوئی۔ نظر جب دروازے تک گئی تو ایک کمرے میں خاتون محترم
دکھائی دیں۔ ۲۲ سالہ پری چہرہ ہوگا عمر بھی دیکھنے میں بڑی نہ
تھیں وہ مجھ کو آتا دیکھ کر کھڑی ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس کہ
مشکل کا راستہ مل جانے کا کافی اطمینان [illegible]۔ کمرہ میں داخل
ہوا۔ [illegible] اس وجہ سے کہ اس مکان کے
سامنے [illegible]

[illegible] بیگم صاحبہ نے فرمایا میں
ایک کرسی [illegible] دوسری کرسی اور نہیں تھی اس لئے بیگم صاحبہ
[illegible] کھڑی ہوگئیں [illegible]
کا [illegible]

میں نے سگریٹ [illegible] کر جلایا

[illegible] آپ کا [illegible] دیکھا تھا اس سے
آپ بالکل مختلف نکلے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا میرے حواس بالکل بجا نہیں تھے
اور اس قدر گھبرا رہا تھا کہ شکل کھا گئے کوئی [illegible]
جیسا ہوا تھا بار بار یہی ڈر ہو رہا تھا کہ اب کوئی مرد کسی کونے
میں سے نکل آئے گا اور مجھے دبوچ کر [illegible] کھوا لے گا۔
[illegible] آئے گی۔

[illegible] میرے نام سے یہ معلوم کر ہی لیا ہوگا کہ میں عابد
رمزی صاحب کی بیوی ہوں عابد رمزی صاحب کا نام آپ نے شاید
کم سنا ہوگا کیونکہ وہ زیادہ تر ادھر ہی کے مشاعروں میں جایا
کرتے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی کسی نفسیاتی شاعر کی بیوی ہیں
وہ انہیں چھوڑ کر کسی طوائف سے نکاح کرکے کہیں مزے اڑا رہے
ہونگے ان کے ایک بچہ ہوگا جو وہ واپس نہیں کرتا ہوگا۔ طلاق و
مہر کا جھگڑا چل رہا ہوگا۔ اپنا زیور بیچ اور گھر کا سامان بیچ کر
گذارہ کر رہی ہونگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے زیادہ ان کی کہانی میں
اور کیا پلاٹ ہوگا۔ بھلا ان سے کیا افسانہ بن سکتا ہے!

"وہ کوئی بڑے شاعر نہیں ہیں مگر مجھے بہت کچھ میں نے
بھی کچھ پڑھی لکھی ہوں۔ انہوں نے مجھے طلاق دیدی ہے اور میں
یہاں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہوں اور سکول میں پڑھاتی ہوں
یہ لڑکا میرا ہی ہے والدہ کو اس وقت میں نے ایسے دو ڈبل ڈوز

ایسم کے دیئے ہیں کہ وہ کل آٹھ بجے سے پہلے شاید ہی پلنگ سے اٹھ سکیں
لڑکا بالکل ناسمجھ ہے اور صرف اس قدر سمجھتا ہے کہ آپ الہ آباد سے آئے
ہیں اور میرے چچا زاد بھائی انور ہیں اور واقعی وہ ہیں بھی۔ وہ اکثر
آگرہ آتے رہتے ہیں اور والدہ کو علم ہوا بھی تو معمولی بات سمجھیں گی،
اور آپ [illegible] ہوگی کہ باوجود میرے جگانے اور جھنجوڑنے
کے وہ نہیں اٹھ سکیں، اور انور بھائی بغیر ملے چلے گئے۔ ذرا سی دیر کے
لئے آئے تھے کچھ کام تھا۔ تھوڑی دیر کو آگئے تھے۔ آپ کے سب خط
سکول میں بھیج جاتے ہیں کیونکہ [illegible] ہے اور ڈاک لینے
لینے کے بعد کسی قسم کی پکڑ نہیں [illegible] کے
[illegible] کا حل ہے۔

"آپ نے تو مکمل سازش کر لی ہے" میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں سازش وازش تو جبر کچھ نہیں ہے البتہ ذرا احتیاط
شرط ہے کیونکہ یہ اسلامی محلہ ہے اور اگر یہ شبہ ہو جائے تو بڑا خرخشہ
پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر یہاں ملنے کی مدد سے [illegible] ہوتی تو پھر تاج محل
میں ملتے ———"

میں نے دل میں سوچا کہ اگر ایسا ہو جاتا تو تاج محل کا لطف
[illegible] آ ہی جاتا

"آپ کے شوہر نے کیوں بے رخی برتی۔ ذرا تفصیل سے سنئے"
میں نے دل دکھوں کے اظہار [illegible] پوچھا۔

واقعات [illegible] بیگم صاحبہ نے بیان کئے وہ دردناک واقعات
نہیں وہ [illegible]
احتیاط کا محتاج سمجھ رہی تھیں۔ ایک شوہر جس نے ان سے لڑ جھگڑ کر
ایک نائکہ سے ناجائز تعلق پیدا کر لیا ان کا ایک لڑکا تھا۔ بیوی کو
اسے بچے سے بڑی الفت تھی، ہونی بھی چاہئے تھی اس لئے خلع حاصل
کر لیا۔ شوہر نے لڑکا بھی دیدیا اب کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ چونکہ مکان
کا پوسٹل ایڈریس ان کے سابق شوہر کی نسبت سے مشہور ہے
اس لئے خطوط بجنسہ پرانی اسمیت پر آرہے ہیں۔ وغیرہ ان سب
واقعات کو سن کر میں نے ظاہری ہمدردی کی [illegible] ہی سے اٹل
بے جوڑ قسم کی شادیوں کے انجام کا افسانہ تھا اور بس کچھ نہیں۔ یہ
میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔

گفتگو کوئی ایک گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ میرے شوہر نے میرے
ساتھ کیا کیا زیادتیاں کیں کس طرح جھگڑتے تھے۔ خلع کا دعویٰ کیا۔
وغیرہ۔ ایک ایک تفصیل انہوں نے سنائی اور دل [illegible] کر ہلکا ہوگیا۔

جب ان کی داستان سرائی ختم ہوگئی تو بولیں۔

"تو آپ نے دیکھا کہ میرے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کی گئی ہیں۔ بس میں چاہتی ہوں کہ ان کا ایک افسانہ لکھ دیں، اگر ناول لکھ دیں تو اور بھی اچھا ہے۔ تاکہ اور عورتوں کے لئے بھی سبق ہو۔"

میں نے کہا "بہت دلسوز داستان ہے۔ واقعی ہندوستانی عورتوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اور میں ضرور اسے قلم بند کر دونگا۔"

اس پامال اور لغو سی حقیقت کو افسانہ بنانے کی تو چنداں خواہش نہیں تھی مگر اس بے باک اور قابل رحم حد تک برخود غلط داستان سرا کی اپنی ہستی ضرور ایک مطالعہ کی چیز تھی اور میں زیادہ تر اسی پر غور کرتا رہا یعنی اس کے چہرے کو تکتا رہا۔

اس قسم کے گھسے پٹے پلاٹ۔ ایسی لغو و پامال تھیم پر بھلا میں افسانہ لکھونگا۔ مجھے غم کی نوحہ گری کا سلیقہ ہی نہیں۔ سماج کے دکھوں کو میں مبالغہ آمیزی سے معرا نہیں پاتا۔ اس قسم کے افسانوں کے لئے زنانہ رسالوں میں لکھنے والی "خالہ جانوں" کو میں زیادہ موزوں پاتا تھا۔ لیکن جوں جوں میں غور کرتا تھا بیگم رمزی کی داستانِ زندگی میں کچھ اثاثہ ایسا ضرور ملتا تھا۔ ہم سٹ ٹاہم سٹائیل میں ——— اوفوہ! ٹاہم سٹائیل کیا ——— میرا ہی سٹائیل اسے کیوں نہیں کہا جائے!! بالکل سپاٹ سا واقعہ لے کر ایک عظیم الشان جذباتی قصر تعمیر کر کے دلوں کی دھڑکنوں سے اسے معمور کر دیا جائے۔ دلسوزی کا تعلق دل سے ہے کہ اسے پڑھنے والے پر چھوڑ دیا جائے۔ بس بن گیا افسانہ۔

کبھی کبھی میں بیگم رمزی کی طرف دیکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی دماغ میں اہرمن جاگنے لگتا تھا اور میں آپ پر لفریں بھیجنے لگتا تھا غرض عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ خیر کسی نہ کسی طرح چائے ختم کی اور رخصت ہو کر سرائے میں واپس آیا۔ دوسرے دن گھر پہنچ گیا۔

اس کے کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ وہ کافی دکھی تھی اور اسے ایک ہمدرد و جانسوز محبت کرنے والے کی ضرورت تھی تیسری دفعہ جب میں ان سے ملا تو وہ میرے کندھوں سے چمٹ کر رونے لگیں میں نے بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا اور چوم لیا۔ یونہی بے خیالی سے۔ دیکھنے میں وہ بُری نہ تھیں۔ ذرا عمر زیادہ ہو گئی تھی اور ایسے موقعوں پر بھلے آدمی بشریت کے تقاضے سے مجبور ہو کر جو کیا کرتے ہیں اس کی منطق اور جواز و عدم جواز کی بحث کو جانے دیجئے بس یہ سُن لیجئے کہ پھنسے اور بُری طرح پھنسے۔ اب راہِ نجات دیکھتے ہیں تو مسدود ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

بیگم رمزی دُنیا میں تنہا تھی مگر اکیلی اکیلی سی تھی حیات کو مسدود پاتی تھی۔ شرارِ زندگی کجلا جاتا تھا اور آخری ٹمٹما رہا تھا۔ اس لئے شدید ضرورت تھی کہ اس شعلہ مستعجل سے جس قدر دیرپا اور جس قدر جسد نو روحرارت حاصل کی جا سکے کی جائے۔ بس نے بھی پی لیا آپ مجھے مطعون کریں تو یہ آپ کی بے انصافی ہے ——— ! آپ بھی اگر ترقی پسند افسانہ نگار ہوتے تو یہی کرتے معمولی آدمی ہوتے تو ممکن ہے بچ جاتے، ممکن ہے آپ بھی کمینے پن کا ثبوت دیتے۔

میں خود عموماً غیر منطقی اور اکثر ظالم طبیعت انسان بن جاتا ہوں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاتی یا خانگی زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہوں۔ میں ایک فراخ حوصلہ۔ بے پرواہ متوسط قناد کا آدمی ہوں عشق سے آشنا ہوا۔ بددل ہو گیا۔ ایک سانٹ رنگ خانگی زندگی شروع ہوئی تو اُسے بھی ایسا چلاتا رہا کہ جیسے کوئی سلطنت کا انتظام کرتا ہے بیوی کی دلجوئی۔ بچوں کی دیکھ بھال محنت و عرق ریزی سے تحصیلِ معاش، دوستوں سے کھلا ہوا ہم مذاق زاللہ اخوت وغیرہ۔ غرض کوئی شخص ذاتی یا خانگی طور پر مجھے مطعون نہیں بنا سکتا۔

بچوں، دوستوں، عورتوں اور جانوروں کے ساتھ حسن سلوک شرافت و فطرتِ زندگی ہے دل کھول کر قرض لینا اور دینا خوش رہنا اور خوش رکھنا میری عادت ہے۔ بہت سے لوگ میرے مداح ہیں میری تحریروں کے لیے کا رہیں مگر بہت سے اس سے مختلف ہیں مگر میرا دشمن کوئی نہیں ہے۔

بہرحال یہ میری زندگی کا ایک منظر تھا اور ہے۔ اس کے ماتحت میں نے جو کچھ کیا اس کی صفائی کے لئے یہ سطریں نہیں لکھی ہیں بلکہ دکھانا مقصود ہے کہ میری زندگی کیا ہے اور کیسی قنادِ طبع کا آدمی ہوں تاکہ آپ اناڑی پن میں کوئی غلط رائے میرے بارے میں نہ قائم کر بیٹھیں اور کبھی ملیں تو مفت میں آپ کو ندامت اور (مجھے بھی) خفت محسوس نہ ہو ———!

میں نے افسانہ لکھا اور وہ چھپ گیا۔ جانور، کو میں اب بھولتا جا رہا ہوں۔ ان کے اکثر خطوط آتے رہتے ہیں مگر میں کوئی توجہ نہیں دیتا کیونکہ مجھے اس وقت ایک پلاٹ کی ضرورت تھی۔ اس لئے ملا تھا پھر اہتمام یہ رہا کہ اُن کی بے ساختگی اور زندگی کے بارے میں خانگی بھولیں نے مجھے اُن سے ملنے کے لئے اُکسایا۔ جذبہ

مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا اور آخری کانفرنس میں میں نے دستبرداری کا اعلان کردیا۔ صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ رقت آمیز تقریریں ہوئیں۔ میں بھی کچھ پسیجا مگر آخرکار اس قصّہ کو ختم کرنے کی تدبیر کی جو یہاں نہیں بتائی جا سکتی۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن تھا کیونکہ خاتون نے مجھے جو کچھ دیا میں نے بھی اس کے جواب میں کچھ خدمت کردی۔ دونوں کا علم جب برابر ہو جائیں تو حساب بھی تو کون جھٹلا سکتا ہے

بعد میں نے اس خاتون کی کہانی کو کچھ ایسی کہانی کو ملا کر ریڈیو کے لئے لکھا۔ بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ادبی شہرت بھی حاصل ہوئی۔ خاتون نے لکھا کہ میں نے آپ کا لکھا ہوا ڈرامہ سنا۔ دل کی کیا حالت ہوئی بس کچھ نہ پوچھئے۔ میں پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لئے نہیں پوچھا۔ وہ اکثر ملاقی میں مگر آدمی یہاں تک لڑکھڑاتا رہے اور یہ بھی ایک بات ہے کہ یہ عورت تو جو آپ کی زندگی کی راہ میں آکر آپ کو پاؤں میں لگا کر حد مانی بن جائے اور اپنا نڈھال جسم آپ کی آغوش میں سپرد کردے۔ اُسے کس طرح سنبھالا جا سکتا ہے۔ [illegible] کو ظالم بننا پڑتا ہے۔ ـــ اور میں وہ ظالم اور [illegible] معیار زندگی [illegible] کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے جب ضرورت آ جائے تو اسے اس چھڑی کی طرح رکھ لیجئے جو سہارا دینے کے لئے آپ سڑک پر لے کر چلتے ہیں اور گھر واپس آکر کونے سے لگا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

خاتون کے خطوط سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے ظالم اور بے رحم نہیں سمجھتیں البتہ سماجی ڈرپوک اور ضعیف العقل ضرور سمجھتی ہیں [illegible] اس بات کا انہیں بھی احساس ہے کہ ایک مشہور و لائق آدمی ایک [illegible] کم استعداد خاتون کے ساتھ عرصہ دراز تک مربوط نہیں رہ سکتا اور شادی نہ کرسکنے کے جو بہانے میں نے انہیں بتائے اُن سے وہ مطمئن نہیں تو ہم دلی کے ساتھ قائل ضرور ہوگئیں اور مجھے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے یہ کافی ہوگیا۔ محبت کی بھوکی تھیں وہ میں نے حتی الوسع انہیں دی لیکن اس روٹی میں میرے ساتھ پہلے سے ایک شریک ہے اُس کی حق تلفی گوارا نہ ہوئی اس لئے یہ سلسلہ دراز ہونے سے پہلے چھوڑ دیا۔

میری بیوی اکثر مجھ سے یہ بات دریافت کرتی ہیں کہ یہ جو کہانیاں آپ لکھا کرتے ہیں کیا واقعی سب سچی ہوتی ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں کہ سب من گھڑت ہوتی ہیں جیسے بیگم عابد رمزی کا قصّہ۔ یہ جواب سُن کر وہ مطمئن ہو جاتی ہیں۔ "اُفوہ آپ بھی کس قدر جھوٹی جھوٹی باتیں لکھا کرتے ہیں" یہ بات سُن کر ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا۔

واقعہ بھی یہ ہے کہ ہم لوگ بہت جھوٹے ہوتے ہیں اور جھوٹ کو سچ بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ ہماری محبت، نفرت، بددلی، دلچسپی، غرض ہر چیز مصنوعی ہو کر رہ جاتی ہے۔

میری پاکدامنی اور نیک نفسی کا میری بیوی کو کیوں یقین نہ ہو جبکہ وہ جانتی ہے کہ میں جانوروں تک سے بدسلوکی نہیں کرتا اور جو کچھ لکھتا ہوں وہ سب جھوٹ موٹ باتیں ہوتی ہیں۔ جب تک اس کا یہ نقش ذہنی قائم ہے اُس وقت تک میں اگر سچ بھی لکھوں تو وہ جھوٹ سمجھیں گی۔ اس لئے یہ تصوّر برقرار رکھنا فرض ہے اس لئے اس قصّہ کو بھی بس اسی ذیل میں سمجھئے۔ لیکن اگر کہیں واقعاتی طور پر کسی کی زندگی کا ذکر آگیا ہو تو اس کے لئے میں کوئی معذرت پیش کرنا نہیں چاہتا ـــــ!

ظفر قریشی دہلوی

تاروں کی چھاؤں میں

. . . جب وہ سہمی سمٹائی اندر داخل ہوئی تو اُس نے عجیب سماں دیکھا۔ چاروں طرف سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ قمقموں کی ضو میں روشنی دیواروں پر گلابی روغن، دریچوں میں قرمزی پردے، فرنیچر کی احمریں پوشش، سمرقند کا گلنار قالین، غرض اُس ماحول کا ذرّہ ذرّہ گلگوں قبا تھا۔ آپ ہی آپ اُس کے قدم رُک گئے، اور اُس نے وہیں ٹھٹک کر دیکھا کہ سامنے شاندار سنہری پلنگ پر نواب اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ متمکن ہے۔ حیرت و انتشار کی ایک بلند آہ اُس کے لبوں تک آتے آتے رہ گئی اور وہ بے ساختہ اپنی سفید فام بانہہ سے مُنہ چھپا کر دروازے کے پیچھے کی طرف لپک گئی۔

نواب اپنے مخصوص انداز سے مُسکرایا، اُسی انداز سے جس سے وہ حُسن و شباب کی پروردہ کسی نئی عورت کو اپنے عشرت کدے میں داخل ہوتے دیکھ کر مُسکرایا کرتا تھا۔ بس یہی اُس کا شوق تھا، یہی اُس کی تمنا کہ دُنیا کی ہر حسین عورت کو کم از کم ایک دفعہ اپنی آغوش میں لے لوں۔ اس ارمان کی خاطر اُس نے دور دراز کا سفر کیا تھا، اور جیسے اُس کی دولت بے پایاں تھی، اسی طرح اُس کی جسمانی طاقت اور شباب سدا بہار تھا۔ عورتیں از خود اُس پر فریفتہ ہوتی تھیں، لیکن ایسی عورتوں کو سر نگوں بنا کر اُس کا جی خوش نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی طبیعت تو اُن عورتوں کے لئے مچلتی تھی جو چراغِ خانہ ہوتیں اور جنہیں اپنی پارسائی پر غرور ہوتا ــــــ اور اُسے فخر تھا کہ وہ آج تک کسی باعفت عورت سے نہیں ملا جس کے کردار کو اس نے ملوث نہ کر دیا ہو، جس کی خوبصورتی کو اُس نے داغدار نہ کیا ہو۔ دُنیا میں ہر شخص کو تمام نعمتیں تو میسّر نہیں ہیں آخر وہ کونسی متاعِ حیات ہے جس پر کوئی نہ کوئی مجبوری گراں نہیں؟ ان اذیت کوشیوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنا پانسہ پھینکا کرتا اور اپنی کامیابی کے لئے ہر ممکن کوشش بروئے کار لاتا۔ اور اس حصولِ مقصد کے لئے اُس نے کیا کیا نہ کیا؟ کیسے کیسے مظالم روا نہ رکھے؟ کس کس داؤں گھات سے اُس نے معصوم عورتوں کے جسم نہ خرید لیے۔

اور آج کی رات اپنی بساطِ عشق پر اس نئے فرزیں کو دیکھ کر وہ وارفتہ سا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے یہ قابو میں آئی تھی۔ انتظار کے لمحے اس کے لئے کس قدر صبر آزما اور کس قدر تکلیف دہ تھے؟ لیکن اندر آ کر بھی وہ آگے نہ بڑھی، اس نے قدموں کو مطلق جنبش نہ دی تو وہ خود اُس کے استقبال کو کھڑا ہوا "آخر ــــــ تم آ گئیں!" اُس نے پُر اشتیاق لہجہ میں کہا اور اُس کی جانب سرکا۔ "آدھی رات سے میں تمہارا منتظر ہوں۔ دیکھو رات کتنی جا چکی ہے؟"

اُس کی نگاہ کے ساتھ ساتھ رخسانہ کی نظریں دریچے تک چلی گئیں اور اُس نے دیکھا کہ آسمان کا مدالی کے دوپٹے کی طرح جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ بس کوئی دم میں یہ ستارے ماند پڑ جائیں گے سپیدۂ سحر نمودار ہو جائیگا اور وہ ــــــ وہ۔

نواب بولا "اِدھر آؤ میری جان! واقعی تم بے حد خوبصورت ہو۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں صرف دُور سے دیکھا اور ہر بار تمہارے جمال سے مسحور ہو گیا۔ لیکن آج ــــــ آج کی رات تم اس قدر قریب ہو! اور تمہارا حُسن اپنی پوری رعنائی کے ساتھ اس وقت میرے سامنے جلوہ آرا ہے ورنہ تم نے تو ہمیشہ مجھ سے احتراز کیا۔ تم مجھ سے بچتی رہیں۔ تم نے سمجھا کہ تمہارا اجتناب مجھے تم سے غافل کر دے گا۔ تمہاری سرد مہری میری آتشِ شوق کو فرو کر دیگی۔ لیکن نہیں جس آگ کو جوانی ہوَس بار کرتی ہے جُدائی اس کو اور بھی بھڑکا دیتی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ جو شعلے حرص کی ہوا سے بلند ہوتے ہیں انہیں امتناع خاک نہیں کر سکتا۔"

رخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنگِ مرمر کے ایک خاموش بُت کی مانند وہ ساکت و جامد کھڑی رہی۔ نواب اُس کے بالکل نزدیک آ گیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "تمہارا یہ لباس سفید ہے۔ تم مجھے چڑانے آئی ہو۔ بتانا چاہتی ہو کہ تم عصمت مآب ہو۔ تمہارا یہ پاکیزہ لباس، تمہاری شوہر پرستی اور عفت کا نقیب ہے مگر میں اسے ــــــ"

یکایک وہ اُس پر جھپٹا اور پیشتر اس سے کہ وہ سنبھل جاتی، اُس نے اپنے لب اُسکے رُخسار پر رکھ دیئے۔ اُس کے لبوں کو چوم لیا اور جب وہ انتہائی کشمکش کے بعد اُس کی آغوش سے نکل گئی تو وہ ہنسنے لگا۔ اُسکے قہقہے کی آواز بھیانک ہوتی گئی ــــــ "اب

ا ہو جاتے ہیں؟ ایسے جوان اور رخساروں کو پوچھنے سے کیا فائدہ؟ دیکھو
دیکھو مہاشے دیس بھگتی سے ... سے ... مار کے لستان کھلا
نمایاں ہیں، چلتے و پکتے ہوئے رقم!"

لیکن رخسانہ کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی، اور پھر ایک
... بار ادھر سے ... بار ادھر کو ... مجھے ... دو ... مجھے
جانے دو ..."

"کچھ آئی ہی نہیں تھیں؟" نواب نے وہاں کھڑے کھڑے سوال
کیا۔ "کیا تم سمجھتی ہو میں نے اتنی دیر میں چار ہزار روپے وصول
کر لیے؟ اتنی بڑی رقم میں تمہاری درستی عنایت کیلئے دے دیتا؟"
میں سودا کرنے نہیں آئی تھی" رخسانہ نے مشکل حواس
جمع کر کے کہا۔ "میں تو اس لئے آئی ہوں کہ تمہاری محبت کا ... تمہارے پیروں پڑوں ... التوبہ"

"ہاں، وہ شوہر کی لوٹ ہے۔ اس شوہر کی محبت ہی لوٹ ہے جو
تمہیں یہاں کھینچ لائی۔ تم جانتی ہو کہ اسے اِلاج ہونے سے بچا لو۔
یہ ... یاد رکھو ... آج ہی کی رات باقی ہے، کل تک
اگر تمہیں روپیہ نہیں ملا تو اس لنگڑے کا کبھی علاج نہ ہو سکے گا
اور تم کام تمام ... کیونکہ رات تنہا ہو کر بھی آئے ہو"

"چیں ... میں ... رحم ..." رخسانہ کچھ آئی ہوئی تھی اور میں لوٹی
اور دروازے کی جانب مڑی، مگر نواب نے لپک کر دروازہ اندر سے
مقفل کر دیا اور اس کے روبرو آکر بولا "اب کچھ نہیں ہو سکتا! کیوں
خواہ مخواہ وقت ضائع کرتی ہو؟ وہ سامنے الماری میں زرد جواہر
اور نقدی کے انبار ہیں جانے جتنے لے لینا۔ چار ہزار یا چالیس
ہزار"

رخسانہ کا دماغ معطل ہو گیا۔ جانے کی کوئی راہ نہیں تھی۔
نواب کی آنکھوں میں آوارگی کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر اس کے رہے
سہے حواس بھی جاتے رہے۔ وہ بے بس ہو گئی۔ کاش! کسی طرح صبح ہو
جائے اور دن کا اجالا پھیل جائے۔ وہ وقت گنوانا چاہتی تھی، کسمسا کر
اس نے پوچھا "یہ، یہ کمرہ سرخ کیوں ہے؟"

اس سوال سے نواب کو بڑا لطف آیا اور وہ دلچسپی لیتے
ہوئے بولا "جب کوئی نئی عورت میری آغوش میں آتی ہے، میں اسکے
مزاج یا حالات کے تقاضے کے مطابق اپنے حجلۂ عیش کو ایک نیا
رنگ دے دیتا ہوں"

"میں نہیں سمجھی!" رخسانہ نے بات کو بڑھانے کے لئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں!" نواب اس کے بازوؤں پر ہوسناک انگلیاں
پھیرتے ہوئے بولا "ایک دفعہ میں نے اپنے عشرت کدے کو سبز جامہ
پہنایا، کیونکہ اس رات میری شریکِ خواب ایک ایسی عورت تھی جسے
تمہاری طرح یا کسی اور کی محبت نہیں تھی بلکہ وہ مجھ سے
جلتی تھی، لیکن کہاں تک؟ اس کا رشک و حسد کام آیا اور آخر کار
ایک دن میری عشرت گاہ میں آکر رہی۔ اس رات سارا ماحول سبز پوش
تھا، کیونکہ یہ میری ... رقابت اور حسد کی نشانی ہے"

رخسانہ نے اسے ... سے دیکھا۔ آخر یہ عورتوں کا اسقدر
شوقین کیوں ہے؟ کیوں یہ ہر بار ایک نئی عورت کو ساتھ رکھتا ہے؟
یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور نواب نے کہا "ایک دفعہ لکھنؤ میں عجب
واقعہ پیش آیا کہ وہیں یاں کی شریف لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی
اور جب میں نے اسے رات کو اپنے پاس بلایا تو وہ کھولی بھالی، جو مرد
اور اس کے چھپے ہوئے ... بات سے ... تھی، اسے جون دن داخل آئی۔
اس سب لوگوں نے اسے کمرہ عیش کی سرمئی شہری رنگ میں کی تھی
کہ ... یہ دنیا کا نشان ہے۔ اس نے ... واقعی ہی ...
مجھ پر قربان کر دی؟"

یہ سنکر رخسانہ کا دل ہمدردی سے بھر بھر ہو گیا اور اس نے
بے ساختہ پوچھا "اور پھر اسے چھوڑ دیا؟ تم نے اس کے ساتھ دغا کی؟"

"اور کیا؟" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا "مجھے اس سے محبت تو
نہیں تھی؟ ایک عارضی جذبہ کوئی دائمی نقش" وہ پھر چھوڑتا ہے
البتہ میرا دل چاہتا ہے کہ زندگی میں ایک دن اپنے عشرتکدے کو
سفید اور سفید ہی بناؤں لیکن یہ اسی وقت ہو گا جب میں کسی کو سچے
دل سے اپنا کہوں، اسے اپنا شریکِ حیات بناؤں۔ اس رات وہ
کمرہ، عشرت گاہ نہیں، حجلۂ عروسی ہو گا۔ اور اس کے چپے چپے پر
چاندی جھل جھل کریگی۔ دریچوں میں سفید پردے آویزاں ہونگے
دیواروں پر سیمیائی روغن کیا جائیگا۔ گلدانوں میں سپید پھول
آراستہ ہونگے ——— کہ سفید رنگ سے پاکیزگی اور عصمت
کی مظہر ہے!"

"اور آج رات یہ کمرہ سرخ کیوں ہے؟"

نواب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی گویا وہ کوئی ضروری
کام بھول گیا تھا، جواب یاد آگیا ہے۔ باہر ستارے تیزی سے گردش
کر رہے تھے۔ تاروں کی گھنی چھاؤں چھدری ہوتی جا رہی تھی۔
کہیں صبح نہ ہو جائے!

اُس نے زبردستی ایک ہاتھ رُخسانہ کے گرد ڈال کر اپنے سینے سے لگا لیا، اور دوسرے ہاتھ میں اس کے نرم و نازک مکھڑے کو پکڑ کر بولا: "اس لئے ——— اس لئے کہ سُرخ رنگ ذہنی ہیجان اور جسمانی تکلیف کی نشانی ہے۔ انتقام اور قتل کی نشانی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حُرمتی اور رُسوائی کی بھی! خود ہی دیکھ لو، تم جو آج یہاں آئی ہو تو کیا ذہنی کشمکش میں مُبتلا نہیں؟ کیا میرے یوں بھینچنے سے تکلیف کے مارے تمہارے چہرے کا رنگ متغیر نہیں ہوا ہے؟ کیا میرا انتقام تمہیں بے حُرمت نہیں کر دیگا؟ اور اگر تم یونہی میرے قبضے سے نکلنے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں، تو کیا میں تمہیں قتل کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاؤں گا؟"

"تم مجھے بے حُرمت کر دو گے، تم مجھے قتل کر دو گے؟ وحشی کہیں کے!"

نواب نے ایک قہقہہ لگایا، بھیانک قہقہہ جو سنسان رات کی تاریکی میں نارسائی سے تار تار ہو جانے پر لگاتا ہے۔ "بے حُرمت تو تم ہو چکیں! تمہیں گھمنڈ تھا کہ کسی غیر شخص نے تمہیں کبھی گلے تک نہیں لگایا لیکن اس وقت میں نے تمہیں اپنے سینے سے چمٹا لیا ہے۔ مجھے وہ رات ابھی یاد ہے جب تم نے اپنے شوہر سے پیمانِ وفا باندھا تھا، جب تم اُس سے کہہ رہی تھیں کہ گھر والوں کے علاوہ کسی نے تمہاری پرچھائیں بھی نہیں دیکھی، کسی غیر محرم نے تمہارے ہاتھ تک کو نہیں چھوا۔ اور جب تم اُس کی آغوش میں یوں مدہوش تھیں، میں بالائی منزل میں منڈیر کے پیچھے چھپا ہوا تمہیں دیکھ رہا تھا۔ چاندنی رات میں پائیں باغ کا یہ منظر میں نہیں بھول سکتا۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہمارا پڑوسی، جو اوپر کی منزل میں رہتا ہے، تمہاری تمام حرکات و سکنات نگاہ میں رکھتا ہے، لہٰذا میں اُسی وقت سے تمہاری طرف متوجہ ہو گیا تھا جب تم لوگوں نے نیچے کی منزل کرایہ پر لی۔ اور اس رات تمہارے ملمع آہنگ دعوے سُن کر تو مجھ سے بالکل نہ رہا گیا اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہوگا، میں تمہارے پندار کو زخمی کروں گا۔ چنانچہ میں اُس وقت کا انتظار کرنے لگا جب تمہارا شیشۂ عصمت میرے ہاتھوں چکنا چُور ہوگا۔ آخر آج کی رات تم ....."

رُخسانہ طیش میں آ گئی، لیکن بے بس کا غصہ ہی کیا؟ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گئی، مگر جب اُس نے اُس کی محرم کے بند میں اپنی انگلیاں ڈالیں تو وہ بے قابو ہو گئی اور خشمناک آواز میں بولی: "تم جنگلی ہو! تم میں ذرا شائستگی نہیں۔ میری مجبوری سے تم نے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے لیکن تم میری ناموس کو ہرگز ہرگز لوٹ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا!" وہ زور آزمائی کرتے ہوئے بولا: "میں یہ بند توڑ ڈالوں گا۔ تم یوں قابو میں نہ آؤ گی تو میں تمہاری قمیص کی دھجیاں کر دوں گا۔ تمہاری برہنہ کمر میں میرے ناخن پیوست ہو جائیں گے۔ شاید میرے دانتوں سے تمہارا چہرہ بھی خون آلود ہو جائے اور یہ سب کچھ تمہاری اپنی بدولت ہوگا۔ پھر کیوں بیکار مدافعت کرتی ہو؟ ایک ذرا خاموش رہو۔ سکون اور اطمینان سے یہ وقت گزر جانے دو۔ اس کے بعد تم چاہے جتنی دولت لے کر چُپ چاپ چلی جانا، اور اپنے شوہر کی زندگی خرید لینا، جس کا پیمانۂ حیات عنقریب چھلکنے والا ہے۔"

"نہیں، مجھے تمہاری دولت نہیں چاہئے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

"مجھ پہ التجا اثر نہیں کرتی رُخسانہ! میں ایسا موقعہ ہاتھ آئے پھر نہیں جانے دوں گا ——— ادھر دیکھو!"

انتہائی جوش اور دیوانگی میں اُس نے رُخسانہ کو مسہری پر دھکیل دیا اور جیسے بجلی یکایک آسمان کا سینہ چیر کر نمودار ہو اور آناً فاناً غائب ہو جائے، رُخسانہ نے قلیل ترین ساعت میں اپنے سفید لباس کو دیکھا جو کھینچ کر اس سے علیحدہ کیا جا رہا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی نظر نواب کی سُرخ یاقوتی انگشتری پر پڑی جو اُس کے قلب پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ پھر معاً آخری لمحے اس کی تمام قوت عود کر آئی اور اُس نے جھلا کر نواب کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ ہاتھ بُری طرح پڑنے کی وجہ سے اس کی ایک چوڑی ٹھنڈی ہو گئی اور اُس کا ایک ٹکڑا نواب کے گلے میں چبھتا ہوا اُسے زخمی کر گیا۔ خون کی ایک بوند ٹپک کر چادر پر پھیل گئی۔ اُس پر بھوت سوار ہو گیا اور جیسے کوئی سنگدل اپنے شکار کو دبوچنے کو جھپٹتا ہوا مسہری پر چڑھ گیا۔

——— اور رُخسانہ بلکتے بلکتے، جو اب برفانی چٹان کی مانند سرد و بے حرکت ہو گئی تھی، نواب نے اپنا عکس مسہری کے آئینے میں دیکھا۔ وہ گھبرا گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آئینے میں اُسے یوں نظر آیا جیسے حیوانوں کی طرح اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے اور اپنے آپ کو

اس ندرت راؤ ماد دیکھکر وہ خود خوف محسوس کرنے لگا۔ پھر دفعتاً اُس کی نگاہ رُخسانہ پر پڑی جس کی پھٹی پھٹی آنکھوں، نیم وا ہونٹوں اور چہرے کی رنگت سے ایک ناقابلِ بیان کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ ناقابلِ بیان کیفیت اس کی بے چارگی کی، اس کی کشمکش کی، اس کی آہ رسا کی!

بس چند اُڑتی ہوئی گھڑیاں، وہ کبھی اپنے عکس کو اور کبھی اُس سفید فام مظلومہ کو دیکھتا رہا، اور پھر فوراً مسہری سے نیچے اُتر آیا۔

نواب اُس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اُسے احساس ہوا کہ اس میں انقلاب ہیبت ہو رہی ہے۔ اس کی روح سانپ کی کینچلی کی طرح، اپنا گھناؤنا پیراہن اُتار رہی ہے اور جوں جوں رُخسانہ کی ملکوتی برتری اُس کے ذہن پر طلوع ہوتی گئی اُسے یہ معلوم ہوا کہ عرصہ دراز تک لمبی اندھیری غار میں قید رہنے کے بعد، وہ آفتاب کی روشنی میں آیا ہے۔ کچھ دیر بعد، رُخسانہ کی پلکیں جھپکنے لگیں تو اُس نے بہانے نرمی سے اُسے سہارا دیکر اُٹھایا اور ایک مجروح جکارے کی طرح، دردناک آواز میں کہنے لگا "تمہاری فریاد نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ تمہاری خوشامد درآمد بھی بیکار گئی، رُخسانہ! مگر اب میں خود اپنے آپے میں آگیا ہوں۔ میں نے اپنا بھیانک روپ دیکھ لیا ہے۔ واقعی عورتوں کی ناموس سے کھیل کر انسان درندہ ہو جاتا ہے، جنگلی۔ وحشی!"

رُخسانہ زرد پڑ گئی تھی۔ آہستگی سے وہ نیچے اُتری اور جیسے کوئی خواب میں چلے، وہ دروازے کی طرف مڑی۔ نواب نے اسکا دامن پکڑ لیا "میں تم سے معافی نہیں مانگتا میں نے جو کچھ کیا، اُس پر میں شرمسار بھی نہیں، البتہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ——— جو عورت کو پاکدامن ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں تھا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ مجبور ہو جانے پر ہر عورت اپنی ناموس فروخت کر دیتی ہے ——— میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم اب بھی باعصمت ہو۔ اب بھی، کہ میری ہوسناک اُنگلیاں تمہارے شانوں اور کمر سے مس ہو چکی ہیں، میرا پُرشوق سانس تمہارے رُخساروں پر لہرا چکا ہے، میں تمہیں اپنی آغوش میں لے چکا ہوں ——— تمہاری عفت برقرار ہے۔"

رُخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے، گویا وہ اپنی متاعِ حیات لُٹا چکی ہے ایک غیر مرد سے چھوکر اپنی پاکیزگی کو آلودہ کر چکی ہے۔

نواب پھر گویا ہوا "تم نہایت خوشی سے چلی جاؤ حالانکہ ابھی رات باقی ہے اور میں نے تمہیں یہ پیغام دیا تھا کہ آدھی رات سے لیکر صبح کے تڑکے تک تم میرے پاس رہو گی لیکن نہیں تم آزاد ہو یہ الماری تمہارے لئے کھلی ہوئی ہے، جتنا روپیہ چاہیئے، لے لو۔"

رُخسانہ الماری کی طرف مڑی تک نہیں۔ البتہ اُس نے یک بیک نواب کو نگاہ بھر کر دیکھا، اور یہ نگاہ اُسکے دل و دماغ کو چیرتی ہوئی اسکی روح کی پہنائیوں میں اُتر گئی۔ ان نرگسی آنکھوں میں، اس نے صاف طور پر پڑھ لیا کہ اسے دولت کے دیوتا! یہ دولت مجھے اپنے لئے نہیں، اپنے شوہر کے لئے درکار تھی جس سے مجھے عشق ہے۔ اسی عشق کی خاطر، میں اپنی ناموس خطرے میں ڈال کر تمہاری منت سماجت کرنے کیلئے چلی آئی تھی ——— لیکن اب کہ میں خود ہی نہ رہی، میری آبرو بگڑ چکی ہے۔ مجھے ایک غیر مرد نے بے حرمت کر دیا ہے، میں کیسے اپنے شوہر کے سامنے چلی جاؤں؟ کیونکر وہ مجھ گنہگار کو قبول کرے گا؟

نواب متاثر ہو گیا اور گھُٹی ہوئی آواز میں بولا "میں خود تمہیں دروازے تک پہنچا کے جاؤنگا۔ بلکہ ٹھہرو! میں اسی دم تمہارے لئے پالکی منگواتا ہوں اور اگر تم یہ رقم نہیں لیتیں تو میں تمہارے شوہر کے علاج کا اپنے آپ بندوبست کرونگا ——— مگر تم یوں غمدیدہ نہ جاؤ میں نے واقعی تمہیں رنج پہنچایا ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا رنج خود مجھے مغموم کر دیگا۔"

رُخسانہ غمناک ہنسی ہنسی "تمہیں کیا رنج ہوگا؟ مجھے بے آبرو کر کے تو تمہارا دل فانوس کی طرح جگمگا گیا ہوگا۔ تمہاری روح خوشی سے ناچ رہی ہوگی اور جب تم یہ سنو گے کہ میں نے اس بے عزتی کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے تو اُسوقت اگر چاہو تو اپنے عشرتکدے کو سیاہ رنگ دینا کہ ایک پاکیزہ ہستی کو تم نے ہمیشہ کیلئے ماتم کناں کر دیا ہے۔"

"نہیں نہیں" وہ دلگیر لہجے میں بولا "ایسا نہ کہو۔ تم تو اب بھی باعصمت ہو۔ کیونکہ ——— عصمت دراصل روح کی پاکیزگی ہے، خیال کی نیکی ہے جس کا ذہن اُجلا ہو، جسکے جذبات پاک ہوں، جسم میلا ہو جانے سے وہ بے حرمت نہیں ہوتا۔ تم نے اپنے حسن و جمال کو تو فروخت نہیں کیا۔ تم یہاں گناہ کی نیت سے تو نہیں آئیں تم نے میری بدنگاہی میں تو شرکت نہیں۔ اس کے برخلاف تم مقدور بھر مدافعت کرتی رہیں اور میں نے جو کچھ کیا وہ زبردستی، اور تمہیں زیر کر کے۔ بلکہ یہاں تک آنیکی جرأت بھی تمہیں اپنی بے پناہ محبت کی وجہ سے ہوئی۔ تم یہاں صرف اسی لئے آئی تھیں کہ تمہیں اپنا شوہر عزیز ہے مجھے نہیں"

رُخسانہ نے اُس کی بات پوری نہیں سُنی۔ سر نگوں دروازے سے باہر نکل آئی اور نواب متفکر و پُرنم اُسے کواڑ کے سہارے کھڑا دیکھتا رہا ———

صادق الخیری!

پال

پال!

یس ڈارلنگ!

کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں تمہاری ڈارلنگ نہیں ہوں۔

تم ہو۔ میں نے جب کہہ دیا۔ بس۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔

میں یہ پہلے بھی سن چکی ہوں۔

میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کئی بار برسوں میں۔

بڑے سوّر ہو تم۔

نہیں میں سوّر نہیں ہوں۔ میں آریں ہوں تم بھی آریں ہو ہم دونوں آریں نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں فرانسیسی ہوں۔ تم انگریز ہو۔ یہ ہندوستان ہے اور ہم دونوں آریں نسل کے افراد جنگل میں اس صحرا میں، اس ویرانے میں، اس سمندر میں اکیلے ہیں ایک جزیرے کی طرح۔ سو آؤ ہم کیوں نہ محبت کریں ڈوروتھی ڈوروتھی،

تمہارا نام عجیب سا ہے۔ ڈوروتھی، مجھے پسند نہیں ہے۔ تمہارا نام ہونا چاہئے تھا۔ ژی زل، آرابیلا، روز، وائنا۔ وائنا بالکل ٹھیک ہے۔ پیارا نام ہے۔ شرابی نام ہے مغربی فرانس کی سلوں کی لطافت ہے اس میں۔ وہ کیف، وہ بہار، وہ رعنائی وائنا!

بڑی عجیب باتیں کرتے ہو تم، بڑی پیاری باتیں

تمہیں پسند ہیں نا یہ باتیں۔ سبھی عورتیں مجھ سے یہی کہتی ہیں۔

سبھی عورتیں؟.. تو کیا تم —— ہٹو، مجھے جانے دو میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی۔

نہیں بیٹھو، انگریزی قوم بھی سچ مچ کس قدر عجیب ہے۔ محبت کے نام سے بدکتی ہے، محبت فرانسیسی کلچر کی جان ہے، اب اگر تمہاری جگہ کوئی فرانسیسی میڈموزیل ہوتی۔ تو جانتی ہو کیا کہتی .. اچھا جانے دو۔ بیٹھو، یہ ہندوستان ہے۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج کی رات ہماری ہے۔

آج کی رات؟ احمق، تم مجھے گھر پہنچا کے آؤ گے نا۔ پاپا انتظار کر رہے ہوں گے۔

شش.. پاپا کا نام نہ لو، آج کی رات ہماری ہے۔ یہ چینی رستوران ہے چینی کھانا ہندوستان میں، اور ہندوستانی کھانا چین میں، میں جب چُنگ کنگ تھا۔ تو ایک ہندوستانی رستوران میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا۔ انڈیا کافے انڈیا کافے ہائے فرانسیسی کافے یاد آنے ہیں۔ ہر روز۔ بار بار۔ ہر لمحے یاد آتے ہیں یہ بھی کوئی کافے ہیں، نہ وہ لطافت ہے۔ نہ وہ بارکی، نہ وہ گفتار کا ہجہ۔ اپنی پیاری میٹھی زبان کو سننے کے لئے ترستا ہوں۔ معاف کرنا، تمہاری انگریزی تو اس طرح بولی جاتی ہے جس طرح کھردری سڑک پر رولر چل رہا ہو۔

شٹ اپ

سچ کہتا ہوں۔ اور سچ کو ہمیشہ شٹ اپ کہا جاتا ہے ڈوروتھی، مجھے تم سے عشق ہے۔ مجھے فرانس سے عشق ہے لیکن آج ہم دونوں اکیلے ہیں۔ سروایہ کھانا یہاں نہ رکھ دو۔ نہیں اس میز پر نہ رکھو، کھانا کھا نں گے تھوڑی دیر کے بعد ہی۔ لیکن محبت نہیں رُک سکتی۔ ایک لمحے کے لئے نہیں۔ گھبراتی کیوں ہو۔ یہ سروتی انگریزی نہیں سمجھتا۔

فرض کر لو کہ یہ سمجھتا ہے تو۔

تو بھی کیا پرواہ ہے۔ ہر روز یہ اس ٹیبل پر اسی قسم کی گفتگو سنتا ہے غالباً...

تم تو نرے غنڈے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں رستوران میں چلی آئی۔

تم یہ بات دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ یہ جھوٹ ہے مکر ہے۔ دلفریب دھوکا ہے۔ میں اُسے خوب پہچانتا ہوں۔ سنو۔ ڈوروتھی۔ میں تمہیں وائنا کہوں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔ تمہاری آنکھیں کہے دیتی ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔ ڈوروتھی تو نوکروں کا نام ہوتا ہے نا۔ سنو وائنا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس سے پہلے بھی تمہیں کئی انگریز مردوں نے بتایا ہوگا پر آج ایک فرانسیسی کی زبان سے سُن لو تمہارا حسن بالکل نیا ہے۔ اس میں کنوارتے کی تازگی ہے۔ مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بالکل عنبرل، اور ان شفاف تلیوں کی گہرائیاں اور یہ دلرُبا رنگت، جیسے زیتون میں شہد ملا ہو۔ اور یہ بال بُلا نڈ صحرائی ریت کی طرح تابناک، آہا ہا۔ کیسی اچھی خوشبو آ رہی ہے ان میں سے۔

ہٹو۔ مجھے۔ چھوڑو۔

کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے تمہارے۔ اچھی۔ ساری مہکی مہکی جیسے شمالی ہواؤں کی تازگی اور خنکی ان میں بسی ہوئی ہے، آہ۔

اے انگریز عورت۔ تو نے کبھی کسی ہندوستانی کی عبادت کی ہے نہیں؟

تو نے زندگی میں محبت کی معراج کھو دی ہے۔ خدا سے عشق کر۔

سچ مچ بڑے پاگل ہو۔ تمہارا سچ ہے تمہیں کچھ پسند ہو

ہاں اب آئیں راہ راست پر۔ ہر عورت بھٹک جاتی ہے پھر راہ راست پر آ جاتی ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔

تمہارا تجربہ؟ اُف کس قدر بے حیا ہو تم

سچی بات کہتا ہوں اُس ملک کا بیٹا ہوں جس نے القاموس کی پہلی موج کو جنم دیا۔ سچی بات کہتا ہوں۔ ورنہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور یہ ہندوستان ہے۔ اور آج جنگ ہے اور موت کا طبل بج رہا ہے۔ ہوسکتا ہے میں کل مر جاؤں، تم تو اسے۔ بدل ہو کر اسکندر آباد چلی جاؤ یا مر جاؤ یا کوئی اسی قسم کا دلیل۔۔۔ اتفاق سے ہم تم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں پھر کب ایک کم، کیا میں اسے معجزہ نہیں کہہ سکتا کہتا ہوں۔ لاکھوں لاکھوں لاکھوں لاکھوں لاکھوں۔۔۔ کے درمیان دو ذرّے ٹکرا گئے ہیں اور تم اداس۔ مجھے مشکل لگ رہی ہے میں تو ہوٹل میں رہتا ہوں میرے پاس ایک کمرہ ہے اور چاروں طرف خاموشی ہے زندگی سو رہی ہے کھڑکی میں کالے بادل جھانک رہے ہیں دو بڑے بڑے پھول، دو بادل کہ وہ آنسوؤں کی طرح بھیگے بالوں میں چمکتے نظر آئیں گے۔ آہ۔۔۔

نہیں مجھے سخت کھولا۔۔۔ رہی ہے

لو آؤ کھولا۔۔۔ مادی۔۔۔ کا ذکر کروگی۔ انگریز عورت جو کچھ بھی ہو اسی ہلکے محبت کو ترجیح دیتی ہے۔ انگریز کھانے کو معاف کرنا۔ ڈارلنگ۔۔۔ مادی۔۔۔ معراج کی معیار ہے،

جس میں یہ ہندوستان بھی شامل ہے، کہو اس ملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے

میں نے دیکھا ہی نہیں اسے ابھی تک، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ۔۔۔ کہ اس میں بدبو بہت ہے۔

بدبو؟ تم بدتمیز ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ملک بدبوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ہم تم دونوں اکیلے ہیں۔ دو پاک و صاف سفید آرین نسل کے فرد۔ آؤ کھو جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔

ہچ۔ ہچ

کوئی دیکھے گا۔ کوئی سن لے گا۔

ہچ ہچ

سوئٹ ہارٹ چاروں طرف جھینگروں کا شور ہے، مادیت کے اس ہنگام عالم میں محبت کی لطیف آواز کون سنتا ہے۔

ہچ ہچ

ہا

روٹی

کٹ آؤٹ۔ ہیرو

(۲)

ہاں

ہاں پیارے۔

ان سے ملو۔ یہ اختر ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شاعر۔ یہ جاوید ہیں ہندوستان کے بہت بڑے ایکٹر۔ یہ ونایاس ہیں ہندوستان کے بہت بڑے گوئیے۔ یہ۔۔۔ ہیں ہندوستان کے بہت بڑے مصور، اور اس کمرے میں لڑکی ایک بھی نہیں۔ تم لوگ، ہندوستان کے بڑے لوگ عورت کے بغیر زندگی کس طرح بسر کرتے ہو

ہم میں سے کوئی شخص بھی عورت کے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ ہم لوگ ہوتے ہیں۔۔۔ بال بچوں والے ہیں، عشق بھی کرتے ہیں۔۔۔ بیٹھے ہیں

شرکھ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے۔ معاف کرنا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر ہندوستانی نے اپنی عورت کو خوابگاہ کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ مجھے گھٹن سی محسوس ہوتی ہے یہاں، ایک عجیب بیکلی، جلا رہی ہے مجھے ہر طرف پردے اور دیواریں نظر آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے۔۔۔ اچھا کیا بتاؤں کیا جی چاہتا ہے سن کر کیا کرو گے۔ میں پردیسی ہوں تم ہندوستانی ہو۔ میں گورا ہوں۔ تم کالے ہو۔ مجھ سے نفرت کرتے ہوگے اپنے دل میں۔ ہر یوروپین سے تمہیں نفرت ہوگی میری باتوں پر تمہیں کیونکر اعتبار آئے گا

نہیں ایسا نہیں ہے، یاں ہمیں کسی فرد سے نفرت نہیں۔ ہم تو اسی نظامِ زندگی سے نفرت کرتے ہیں، جو ہمارے اور تمہارے درمیان نفرت کا بیج بو رہا ہے۔

کتابی باتیں نہ کہو۔ زندگی کی زبان میں بات کرو۔ معاف کرنا۔ یہ کمرہ۔ یہ لوگ۔ یہ فرنیچر، تمہاری روحانی غربت اور ذہنی افلاس کا آئینہ دار ہے کیا اس طرح رہتے ہیں مہذب لوگ۔ یہ بھدے پھول تپیوں والی

دری یہ بڑا آئینہ، یہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی، یہ صوفے جو اب نہ یوروپی ہیں نہ ایشیائی، یہ کونسی تہذیب ہے کونسی کلچر ہے، کس مسرت کی اشاعت کرتی ہے۔ ذرا بتا دو ہم تم اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس کمرے کی شخصیت کیا ہے۔

ترش سنبھل کر بات کرو ہوش میں آؤ۔ مال یہ کمرہ اختر کی محبوبہ کا ہے اختر کی محبوبہ کا ہے؟ ہائے غریبی معاف کرنا شاعر۔ تم شاعر ہو تمہارا دل شاعرہ ہو گا۔ لیکن اس کمرے کی روح اسقدر بے ترتیب کیوں ہے، دیواریں داغدار ہیں، یہ ننگے آئینے، یہ بے ڈول صوفے

کرایہ پہ اٹھا لایا ہوں۔

محبت کرایہ سے نہیں خریدی جاتی، یہ محبت نہیں ہے حیوانیت ہے، جانتے ہو اگر یہ کمرہ میری محبوبہ کا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں اس کمرے کی ہر دیوار کو چنبیلی کے پھولوں سے ڈھانپ دیتا۔ چنبیلی کے رنگ کا ال ... ذرا ... کی ... یاسمین تمہارے ملک میں ... قدیم ... دیواریں ننگی ہیں ... کوئی دلوان نہیں کوئی قالیچہ نہیں۔ ہوا میں عطر نہیں ... پھولوں کی بیلیں نہیں۔ دروازوں پہ چنبیلی کے پردے کیوں نہیں ... کی سانسیں یہاں بسا کر رہی ہیں۔ یہ ہمارے محبوب کا کمرہ ہے۔ یا حسل خانہ۔ ہمارے اختر شاعر۔ بتاؤ۔ تم کس کلچر کی اولاد ہو۔ تم کیسے با ہو گئے۔ کدھر جا رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس ... ہوں تم بہت افلاس ... کی غلامی، ... صدیوں کے تودے کے دارث ہو۔ معاف کرنا میں سامراج کا حامی نہیں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں کیا تم مجھ میں کوئی کسی قسم کی سامراج کی جھلک دیکھتے ہو۔

نہیں

بس جو میں کہتا ہوں اسے ٹھنڈے دل سے سمجھو یا یاد ... ملاؤ گے۔

ضرور ... مگر ایک بات کہوں، ... تم جب بات کرتے ہو تو تمہارا نچلا ہونٹ بڑے عجیب انداز میں آگے کو پھیل جاتا ہے۔ مونس تھوپیر ذرا ...

ہر فرانسیسی میری طرح دلکش انداز میں اسی دلکش انداز میں باتیں کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی خصلت ہے۔ چارلس بوباں کو فلموں میں کام کرتے دیکھا ہو گا۔ آہ۔ چارلس بوباں فرانسیسی انداز محبت کی تفسیر ہے۔ انگریز جب عشق کرتا ہے۔ تو کہتا ہے "میں تم سے محبت کرتا ہوں" کس قدر ... انداز ہے یہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" "تم کس قدر حسین ہو" یہ عاشق کی زبان نہیں ہے۔ یہ کری کے ... کی

زبان ہے۔ جب فرانسیسی عشق کرتا ہے۔ تو خوشبوؤں کی زبان میں اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ یاسمین ... یاسمین ... آخر۔ اس کمرے کو چنبیلی کے پھولوں سے رشک گلزار بنا دو۔ ... تمہاری محبوبہ اٹھلاتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو تو تم آنکھوں کی زبان میں خوشبوؤں کے سانسوں میں اس سے اظہار محبت کر سکو۔

ہاں ... بس ... یاد ... فقرہ کبھی نہیں بھولتا جو اس نے ... محبوبہ کی تعریف میں کہا تھا ایک سادہ سا فقرہ ہے لیکن اس سے بہتر جملہ محبت کی زبان میں آج تک ادا نہیں ہوا۔ اس نے ... محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم ... میری محبوبہ نہیں ہو تم ... ہو ... میری ... ہائے ... اس جملے ... ان ... ہوں ... ایسی محبوبہ سے کیا کہتے ہو ...

"نہیں ... میں تو کچھ بھی نہیں کہتا ... خاموش ... رہتا ہوں"

... کی زبان ہے محرومیت کی زبان ہے ... بیٹھے ہوئے لوگوں کی زبان ہے ... آزاد ہو جاؤ گے سچ کہتا ہوں ... نرمی نہیں ... ہے تم لوگوں کا دل ... ماحول ... کی ضرورت ہے میں رنگ کا ذکر ... فرانسیسی قوم ... کی قوموں میں پہلی قوم ہے جو ... ہم ... رنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ ... امریکنوں کے ہاں ... موجود ہے میں فرانسیسی ہوں۔ ڈیموکریسی کا سچا سپاہی ... بتاؤ تمہیں ... شاعر ... تم ... تمہاری محبوبہ

نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے ... رنگ کی عورتیں ... تو ہیں

اور تم جاوید ...

اچھی ہوتی ہیں لیکن ذرا ناصاف ... جسم سے بدبو آتی ہے ... صحت مند ہوتی ہیں۔

اور تم سکاری ... ایکٹرسوں میں ... "انگریز ... "

سکنڈے نیوین ... ہے یعنی بالکل ہماری ... آدمی ... کو اتنا کیوں پسند کرتا ہے شاید یہ ... قوت انسان کے ... ہے۔ شاید یہ محبت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ... قوت

کئی نہیں۔ اُن کا تصادم محبت ... ہو ... ٹھیک نہ ہے۔ مجھے دیکھو۔
میں سعید، ملک کا خوبصورت کو اتنا پسند نہیں کرتا اور انگریز عورت تو اسقدر بھدی ہے کہ بالکل لطف سے انرجی ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت سے پیار ہے عشق ہے۔ والہانہ محبت ہے۔ میں ہندوستانی عورت سے پیار کرتا ہوں۔ ہر ... مجھے اُن کا رنگ پسند ہے۔ اُن کے بال پسند ہیں۔ اُنکی چال پسند ہے۔ اُن کی ... پسند ہے۔ اُن کی ... پسند ہے۔ اُن کی مامتا، اُن کی حیا، اُنکی مجبوری، اُنکی مظلومیت ... یورپی عورت تو بڑی بدصورت ہے۔ نوکدار اور عاریت میں لی ہوئی گندی ... اور اس کا سانولا اور گہرا رنگ ... اور اُس پر نیلی نیلی رگیں اور ... آہ کس قدر ... نامطلوب ہے۔ کہاں وہ دلفریب سانولا ... جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی ریت ... وہ قم قم کا شعلہ ... شاید میں بھی تمہاری طرح اسی ضد کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہندوستان میں صرف اِدھر کی عورتیں پسند ہیں۔ میں کسی ہندوستانی عورت سے شادی کرونگا۔

معلوم ہوتے ہو ... تم بھی فرانسیسی کیوں نہیں کسی گسکال لڑکی سے شادی کر لو گے اور جنگ کے بعد فرانسیسی شراب کی تجارت کرو گے ہندوستان میں کیا کام کیا ہے گے

... میں فرانس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ... میں ہندوستان کی ایک دیوی کو فرانس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میرا ملک اُس کا استقبال کریگا۔ میرا خیال ہے میرے ماں باپ اُسے پسند کریں گے میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ میں ہندوستان کی روح کو سمجھتا ہوں اس لئے ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اُس کے لئے میں ایک چھوٹا سا مندر بنواؤنگا فرانس میں۔ یہ فرانس اور ہندوستان کی شادی ہوگی۔

وہ شادی جو ڈوپلے اور لالی اور نپولین نہ کرا سکا

تم بھولتے ہو یار۔ میں وہ فرانسیسی نہیں ہوں۔ میں روسو اور والتیر کا فرانس ہوں میں سامراجی نہیں ہوں میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ آؤ چلو، کہیں چل کر تھوڑی سی شراب پئیں۔ اور کسی ہندوستانی لڑکی کا ناچ دیکھیں۔ مجھے ہندوستانی ناز بہت پسند ہیں۔ اور وہ سُرخ سُرخ پردے جس کے اندر وہ ہندوستانی لڑکیاں ناچتی ہیں۔ چھم چھم چھم چھم ہاہاہا:

(۳)

پال۔

ہم۔

رینے کلیر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

بہت اچھا فلم ڈائرکٹر ہے۔ فرانس کا بہترین ہدایت کار ہے ہالی ووڈ نے تباہ کر دیا۔ یہی ہوتا ہے جب کوئی فرانسیسی اپنے ملک سے باہر جاتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اسی طرح تباہ ہوئی ہے تمہیں معلوم ہے میں رینے کلیر کا اسسٹنٹ رہ چکا ہوں۔

نہیں مجھے معلوم نہ تھا۔

اُس کے لئے میں ایک کہانی بھی لکھ رہا تھا۔ پھر جنگ سر پر آگئی۔ اور سب کچھ رہ گیا۔

اُس کہانی میں کیا تھا

ماں اور بیٹی دونوں کو ایک ہی آدمی سے عشق ہے۔ اور یہ آدمی اُسکی ماں کا ناجائز خاوند ہے یعنی اِس بیٹی کا باپ۔

بہت خوب۔ پھر کیا ہوتا ہے۔

پھر ——— مگر۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ بیٹی اور باپ خاوند اور بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ محبت لازوال ہے مرہ ادولارج دسکی لاؤ

پال تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے۔

ایک بات ہے تمہیں بتانا چاہتا تھا، مگر میں نے سوچا جو پینے کے بعد بتاؤنگا۔

کہو

میں کل صبح ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں فرنچ سیریا جا رہا ہوں۔

اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔

یہی کہ اب فرنچ سیریا جا رہا ہوں۔ ہندوستان چھوڑ رہا ہوں۔ وہاں سے بحرہ روم کا منظر شروع ہوتا ہے۔ سرس دو قدم پر ہے، اور پھر سچ پوچھو تو وہ فرنچ سیریا ہے اپنا ملک ہے۔

پال وہ تمہارا ملک کس طرح ہے۔

کیا کہتے ہو تم۔

غور کرو۔ فرنچ سیریا تمہیں ان لفظوں میں کچھ دکھائی دیتا ہے باہر سے مت پڑھو ان لفظوں کو۔ انہیں اندر سے پڑھو پال۔

فرنچ سیریا۔ فرنچ کیوں۔ تمہیں اس میں کوئی عجب بات نظر آتی ہے فرنچ سیریا برٹش انڈیا، ڈچ بورنیو، تمہیں ان خوشرنگ چمکتے ہوئے الفاظ کے پردوں میں کہیں تاریکی کی جھلک نظر آتی ہے؟

لو۔ وسکی پیو۔ ۔۔ ۔

پال تم کل جا رہے ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم ایک دھمس فرانسیسی ہو۔ تم یوروپ کے کلچر تہذیب اور مذہب کا بہترین آئینہ ہو۔ تم راسپیوٹ دوست۔ تم کل فرنچ سیریا جا رہے ہو۔ تاریخ کا یہ لوا تر ڈیڑھ دو سو برس سے چلا آرہا ہے۔ ڈیڑھ دو سو برس کیا ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دو دن ڈیڑھ دو لمحے، کچھ بھی نہیں دوست۔ پھر اگر کل کو یہ لوا بدل جائے اور کوئی سپاہی تم سے کہے، میں جینی فرانس ہندی، ہالینڈ اور جرمنی اطالیہ میں جا رہا ہوں۔ تو تمہیں خوشی حاصل ہوگی؟

بہت پی گئے ہو شاید، پی کر تمہارا احساس کمتری بولنے لگتا ہے۔

احساس کمتری نہیں احساس برتری بول رہا ہے۔ آج معلوم ہوا تم کتنے پیچھے رہے ہو۔ تمہاری تہذیب وقتی ہے تمہاری جوشی وقتی ہے تمہاری موت بت وقتی ہے دوست، تم مر چکے ہو۔ کیوں کہ تم نے اپنے دل میں ناانصافی اور ظلم اور بے رحمی کو جگہ دی ہے۔

ذلیل ہندوستانی!

پال۔ مجھے گھونسا مت دکھاؤ، اسے اُس ہندوستانی عورت کے لئے سنبھال کر رکھو جس کے لئے تم فرانس میں مندر بنا رہے تھے۔

وہ مندر کب کا مسمار ہو چکا۔ وہ مندر جس میں روسو اور والٹیر کی روح نے جنم لیا تھا۔ میں ذلیل ہوں۔ لیکن زندہ ہوں۔ تم ارفع ہو لیکن مر چکے ہو۔ اور مجھے مُردوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ جاؤ۔ فرنچ سیریا جاؤ، یا ڈچ افریقہ، تیسری جنگ عظیم تمہارا انتظار کر رہی ہے جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے۔ اسی طرح وقتی صلح کے بعد پھر جنگ آئیگی کیونکہ پال تم ابھی تک نفرت کے قبرستان میں سو رہے ہو۔

بیٹھ رہو نہیں مجھے بولنے دو۔ آج میری باری ہے اور تم فرنچ سیریا جا رہے ہو۔ اور ہم دونوں وسکی پی رہے ہیں، ایک زندہ ایک مُردہ۔ ایک ذلیل، ایک بے رحم، ٹھہر جاؤ۔ پال۔۔ یہاں سے اُٹھ کر کہاں جا رہے ہو۔ اپنے دوست کا آخری سلام تو لیتے جاؤ۔ سُنو میں ایک نہیں ہوں پال۔ میں چالیس کروڑ ہوں میں نفرت نہیں ہوں میں محبت ہوں۔ میں نپولین نہیں ہوں۔ میں اشوک ہوں۔ میں اکبر ہوں۔ میں گوتم ہوں۔ چشتی ہوں۔ کبیر ہوں۔ کبیر کا نام سُنا ہے تم نے ہنستے جاؤ پال، میں اجنتا ہوں۔ ایلورا ہوں۔ میں تاج محل ہوں میں محبت ہوں۔ عشق و انسانیت کی تفسیر ہوں تم آزاد ہو کر بھی محبت نہیں کر سکتے۔ میں غلام رہ کر بھی تم سے محبت کرتا ہوں، میرا گھر بڑا ہے۔ میرا دل بڑا ہے، میری روح عظیم ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ پال یہ چنبیلی کے پھولوں کا ہار لیتے جاؤ۔ ایک ذلیل ملک کا آخری تحفہ سُنو سُنو پال! پال! میں تمہیں اُس تیسری جنگ عظیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ سُنو پال۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ !

کرشن چندر

حبِّ اکسیر خاص

شباب انسانی زندگی کا "عہدِ زریں" ہے۔ جس میں تمام جسمانی اور نفسانی قوتیں اعتدال پر ہوتی ہیں انسان اپنی طبیعت میں ایک چونچال پن محسوس کرتا ہے، دُنیا کی ہر شئے اُسے حسین اور بہار بداماں نظر آتی ہے۔ وہ ہر تکلیف کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ ہر بڑی سے بڑی مشکل اس کے عزم وارادے کے آگے بے حقیقت ہوتی ہے۔ اور دُنیا صحیح معنی میں اس کیلئے جنت بن جاتی ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہی وہ مبارک دَور ہے جسے حیاتِ چندروزہ کا 'حاصل' کہا جا سکتا ہے۔

لیکن کس قدر بدنصیب ہیں وہ نوجوان جو شباب اور اُسکی بہار آفرینیوں سے محروم ہیں، جو عزم وارادے کے مقابلہ میں مایوسیوں اور ناکامیوں کا مُرقع ہیں۔ جنھیں زندگی کی جدّوجہد میں قدم رکھتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے اور جن پر خود اپنا وجود ایک بارِ گراں ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ بدقسمت نوجوان دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور انھیں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں پر اپنی بپتا سنا کر اپنے درد کا صحیح علاج حاصل کر سکیں۔ انھیں برگشتہ بخت نوجوانوں کیلئے سنٹرل دواخانہ دہلی نے جسے ہز اگزالٹڈ ہائنس اعلیحضرت حضور نظام، ہز ہائنس مہاراجہ آف منی پور، ہز ہائنس مہاراجہ آف سروہی ہز ہائنس مہاراجہ آف سیریلہ اور دیگر والیانِ ملک و رؤسائے عظام کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ برسوں کی تلاش و جستجو اور محنت شاقہ کے بعد حب اکسیر خاص تیار کی ہیں جو دل، دماغ، جگر وغیرہ جملہ اعضاء رئیسہ کی تقویت کیلئے آبحیات کا اثر رکھتی ہیں۔ قوتِ مردانہ کے ضعف اور نظامِ عصبی کی خرابیوں کو دُور کرتی ہیں۔ خون اور مادۂ تولید کی پیدائش میں حیرت انگیز طریقے پر اضافہ کرتی ہیں معدہ اور آنتوں کی اصلاح کر کے بھوک بڑھاتی اور قبض کو دُور کرتی ہیں۔

غرض یہ کہ ان تمام نقائص کیلئے اکسیر الاثر ہیں جو ایک نوجوان کی زندگی کو جہنم سے بدتر بنا دیتے ہیں۔

قیمت ۴۲ گولی پانچ روپے چار آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

سنٹرل دواخانہ، دہلی

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

مارچ ۱۹۴۴ء کے شمارہ میں ساقی کے مدیر شہیر نے نگاہ اولیں کے زیر عنوان آل انڈیا ریڈیو کی "ادب نوازیوں" پر ایک شذرہ تحریر فرمایا تھا۔ اُمید تھی کہ اس اجمال کی تفصیل کوئی اور اہل قلم ضرور کریگا کیونکہ یہ مضمون ایسا نہ تھا کہ اسے عرصۂ دراز تک زیر بحث نہ لایا جاتا مگر خلاف امید صد لائے برنخواست۔ خیر اس دبی چنگاری کو میں ہی ہوا دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اُمید کو دل میں لئے ہوئے کہ معاصرین بالخصوص شعرا حضرات اپنی شعلہ نوائی سے اس آگ کو ٹھنڈا نہ ہونے دیں گے۔ اور ریڈیو کے محکمہ کو بتا دینگے کہ "بارشیں یا باہم بازی" کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اور شعرا کی تحقیر اب برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔ اسے بند ہونا چاہیئے۔

زیب عنوان مصرع کے پہلے حصّے سے متعلق جرائد میں کافی لے دے ہوتی رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ غالباً ابھی جاری رہے گا۔ اُردو زبان کے خلاف ریڈیو والوں نے جو ٹیڑھی روش اختیار کر رکھی ہے، اُردو داں طبقے نے تو ہندوستان کے طول و عرض میں اس پر اظہار ناراضگی کرنا ہی تھا اور برز در کیا بھی لیکن جن ہندی والوں کی تالیف قلوب (یا اپنی مداہنت کے اظہار کی خاطر) اصلاحِ زبانِ اُردو کا یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا محکمہ کی بدقسمتی سے وہ بھی خوش نہ ہو سکے۔ اور انھوں نے حال ہی میں محکمہ ریڈیو کی اُردو نما زبان کے خلاف تادیبی ووٹ پاس کر کے بیچاروں کو "گھر کا نہ گھاٹ کا" کر کے چھوڑا۔

اگر یہ مسئلہ صرف "لسانی" ہوتا تو آئے دن کی الجھن بڑھتی ہی کیوں؟ "زبان" کے پردے میں جب سرے ہی سے سیاست جلوہ گر تھی۔ اور اس شاخسانے کے اٹھانے والوں کو بجائے اُردو زبان کی اصلاح و تسہیل کے جب فرقہ وارانہ جذبات کا بھڑکانا ہی مقصود تھا تو تالیف قلوب یا مداہنیت کی روش جو ریڈیو والوں نے دانستہ اختیار کی کیونکر کامیاب ہو سکتی تھی۔ کس قدر اچنبے کی بات ہے کہ ہندی والے انگریزی زبان کے الفاظ سے تو نفرت نہیں۔ اور ان کو بے تکلف ہندی میں بولے جاتے ہیں۔ مگر فارسی اور عربی کے وہ الفاظ بھی جو اُردو کے جسم سا تھی ہو چکے ہیں چن چن کر جلا وطن اور ان کی جگہ ایسے "جناتی بول" ٹھو نسے جا رہے ہیں جن کو غیر ہند و تو کیا خود "ہند و جاتی" کی اکثریت بھی سمجھ نہیں سکتی۔ اب تو یہ حقیقت اس قدر آئینہ ہو گئی ہے کہ اس کا انکار کرنا اپنی بصیرت اور بصارت دونوں کی فاتحہ پڑھنا ہے۔ یہ لسانی ڈھونگ اصل میں اسلام دشمنی ہے۔ سیاست کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کوئی دانشمندانہ چال نہیں۔ کیا ہندی کے پرچارکو حال ہی کی تجویز جس میں ہندی کے ادیبوں کو ریڈیو کے محکمہ کے بائیکاٹ کا مشورہ دیا گیا ہے سبق آموز نہیں؟ جن کی خاطر ریڈیو کا محکمہ اصلاحِ زبان کے باب میں بدنام ہوا تھا۔ وہی اب اس پر ادر سوار ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ "آداب عرض" کی بجائے "نمستے" یا "پاؤں لاگن" کیوں نہیں کہا جاتا۔

وقس علیٰ ہذا۔ اب جبکہ ہندی کے پرچارکوں کی نیت کی کالی ہنڈیا حقیقت کے چوراہے پر ایسی بُری طرح پھوٹ چکی ہے تو اگر ریڈیو کا محکمہ اب بھی زبان کے پھٹے میں پیر اڑائے رکھے گا تو بیچاری ٹانگ کی جو پہلے ہی کمزور واقع ہوئی ہے خیر نہیں۔ سُننے میں آیا ہے کہ ریڈیو والے "ہندی" غوغا آرائی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور اب ایک اصلاحاتی کمیٹی بنانے کی فکر میں ہیں یا بنا چکے ہیں۔ اللہ خیر کرے!

اصل میں میرے مضمون کا تعلق تو زیب عنوان مصرع کے دوسرے حصّے یعنی "خبر لیجئے دہن بگڑا" سے تھا۔ لیکن سطورِ بالا بھی بر سبیلِ تذکرہ لکھنا ہی پڑ گئیں۔ کیونکہ جب تک الزام کی پہلی شق کا اجمالاً ذکر نہ ہو جاتا اس کی دوسری شق کی تفصیل کچھ ٹھیک نہ بیٹھتی۔

"زباں بگڑی تو بگڑی تھی" (محاورہ کی رُو سے نہیں، بلکہ الفاظ کے سادہ معانی کی رُو سے) آپ نے دیکھ ہی لی۔ اب "بگڑی دہن"، کا نقشہ بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔ اس سے متعلق ایک بات عرض کرنی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ "دہن بگڑنا" محاورے میں تو مُنہ چڑانا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس حرکت کا مقصود ہوتا ہے دوسرے کی تحقیر۔ اس لئے یہاں میں نے اس ٹکڑے کے تحقیری پہلو کو

مدِ نظر رکھا ہے۔

مارچ ۱۹۴۴ء کے پرچہ میں مدیر ساقی ادیبوں اور شاعروں کی عام ناقدری کا رونا رونے کے بعد فرماتے ہیں "ریڈیو! اس محکمہ سے کروڑوں روپئے کی آمدنی ہے۔ اور یہ محکمہ کروڑوں ہی روپئے صرف کرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی جیسی قدر اس طلسم کدے میں ہوئی ہے شاید کسی کدہ میں نہیں ہوئی ہوگی۔ یہاں غزلوں کا بھی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ایک غزل کا معاوضہ اگر آپ سنیں گے تو حیرت کریں گے۔ وراغو سے سُنیے۔ آٹھ آنے اور چند بارہ آنے۔ اور پھر شرط یہ کہ وہ شاعر جس کی غزل گائی جائے زندہ ہو۔ اور اگر مُردہ ہے تو یہ آٹھ آنے بھی بحق سرکار ضبط۔ مگر ہمارے ادیبوں کو راہ راست پر لانے کیلئے یہ تادیب کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ اس لئے ہم حضور ڈائریکٹر جنرل بہادر سے سفارش کرتے ہیں کہ ایسے بے حس اور شدید مجرموں کیلئے بعبور دریائے شور کی سزا تجویز فرما کر عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں"

مدیر ساقی کی خدمت میں دست بستہ عرض ہے کہ صاحب آپ شاید دہلی ریڈیو اسٹیشن کی بات کر رہے ہیں۔ اور غالباً یہ ریٹ ۸ر سے ۱۲ر تک ہی نہیں بلکہ بعض خاص الخاص لوگوں کے لئے پورے سولہ آنے بھی ہے۔ البتہ یہ ۱۲ر اور ۱۶ر فی براڈکاسٹ غالباً دو ایک زریں پالان ہستیوں کیلئے ہی مخصوص ہے۔

لیجئے ہمارے مردم خیز خطے یعنی پنجاب (لاہور ریڈیو اسٹیشن) کے ریٹ بھی سُن لیجئے "۲ر اور ۴ر" فی براڈکاسٹ۔ کہئے پنجاب ریڈیو اسٹیشن نے حاتم کی قبر پر لات ماری کہ نہیں؟ اب ذرا سرکاری چھاپ شدہ ایگریمنٹ (اقرارنامہ) کی شرائط بھی ملاحظہ فرمایئے: اور محکمہ کی قارونی ذہنیت کی داد دیتے ہوئے پکار اٹھئے: "یہ مُنہ اور مسور کی دال" ان حالات میں کوئی خوددار ادیب یا شاعر جب تک بیچارہ بنگال کے کال کے تخیل سے لرزہ براندام نہ ہو کیونکر ریڈیو والوں کے دامِ تزویر میں آسکتا ہے۔

اقرارنامہ میں شروع ہی میں شاعر کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام کلام پر قبضہ جما لیا گیا ہے۔ مطبوعہ اور شائع شدہ کلام تو خیر پہلے ہی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اور ریڈیو والے اپنے مذاق کی چیزیں اس میں سے چُن کر نشر کر سکتے ہیں۔ مگر وہ کلام جو ابھی بطنِ شاعر میں ہے اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "اس ... کی پیدائش کی رپورٹ پندرہ دن کے اندر محکمہ کو پہنچ جانی چاہئے"

اب آپ ہی فرمائیں یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ شاعر اپنی ہر نئی چیز ریڈیو والوں کو خواہ مخواہ بھیجے، خواہ وہ اُن کے کام کی ہو یا نہیں۔ اور اس طرح اپنے اوپر خود ہی یہ نئی قسم کا سنسر بٹھالے۔ ریڈیو والے گو وہی چیز براڈکاسٹ کرینگے جو اُن کے مطلب کی ہو جب یہ صورت ہے تو اس غیر فطری اور غیر معقول شرط کے ماننے کو کون عقل کا اندھا تیار ہوسکتا ہے۔ ریڈیو والوں نے اس اقرار نامے کی رُو سے

"از صحنِ خانہ تا بہ سرِ بام ازانِ من
وز بام تا بہ عقدِ ثریا ازانِ تو"

کی مشہور روایتی تقسیم کو اپنا رکھا ہے۔ دراز دستی اور سینہ زوری کی مثال جو اس اقرارنامہ کی شرائط میں دکھائی گئی ہے شاید آقا اور غلام ہی کے عہدنامے ہی میں نظر آئے تو آئے۔ اس سینہ زوری پر جو معاوضہ تجویز کیا گیا ہے "گالی دیکر جوتہ رسید کرنا" کے مترادف ہے۔ اور یہ مشقِ ناز انسانوں کے اس طبقہ سے روا رکھی گئی ہے جو خودداری اور غیرت کا مجسمہ کہا جاتا ہے۔ (اسی ہندوستان میں اور ایسے زمانے میں جبکہ بولنے پر زبان کٹتی تھی میر و مرزا کی خودداری کس ادیب یا شاعر کو معلوم نہیں) اسی بنا پر بعض غیور اور خوددار اہلِ فن نے یا تو ریڈیو کے محکمے سے ایگریمنٹ کرنے سے سرے سے انکار ہی کر دیا ہے یا تھوڑے سے تجربہ کے بعد دستخط شدہ ایگریمنٹ منسوخ کر دیا ہے یا اگر تحریری اجازت دی ہی تھی تو اس کو واپس لے لیا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ خامیاں یا تہذیب تشدد جو ایگریمنٹ میں ہے کھول کر محکمۂ مذکور کے نوٹس میں نہیں لایا گیا۔ ایسا کیا گیا ہے اور بڑے شدومد سے کیا گیا ہے مگر وہاں ترنگ سے اُترنے والے نشے ہوں تو اُتریں۔ محکمہ مذکور کے موجودہ ایگریمنٹ پر جب دھڑا دھڑ دستخط ہو رہے ہوں اور آنکھیں بند کر کے ہو رہے ہوں تو انھیں کیا پڑی ہے کہ اپنے "اسرائیلی حربہ" کو بے ضرر بنا دیں۔ مگر محکمہ کی یہ ہیکڑی کسی معقولیت پر مبنی نہیں کہی جاسکتی۔

اس کی وجہ مجھ سے سُن لیجئے۔ اوّل تو عملاً اس اقرارنامے کی اس شرط کو طرفین معاہدین نے "وعدۂ معشوق" سمجھ رکھا ہے "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا"۔ یا یہ کہ جن شعراء سے یہ ایگریمنٹ لیا گیا ہے ان میں چند ایسے بھی ہیں جن کے ایک آدھ گیت یا ایک

آدھ غزل سال دو سال سے چھوڑ چار پانچ سال سے ہر پندرھواڑے میں نشر ہو رہی ہیں۔ گویا کہ وہ "ادبی پکّے گانے" ہیں جن کو ترک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ورنہ "ادب سنگیت" کے دُنیا سے ناپید ہو جانے کا ڈر ہے۔ آخر یہ کیوں ہو رہا ہے۔ کیا وہ ادبی نغمے ناکارہ ہو چکے ہیں؟ جن کی بھلی یا بُری اوّلین شعاعوں کو "من تو اجاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے ریکارڈنگ سسٹم کے ماتحت ریکارڈ کر کو لافانی بنا لیا گیا ہے۔ اگر ریڈیو والوں کا یہ ادّعا ہو کہ ہمارے سُننے والے انھیں پسند کرتے ہیں۔ تو یاد رہے کہ اس پر تجاہلِ عارفانہ کی چپک جانے والی پھبتی کسی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ گدھے چڑھی ہے۔ ماتشاعر اور سستی شہرت کے بھوکے جن میں سے اکثر بیچارے شاعری کروا تے ہیں۔ اور اکثر استادِ ازل کے کہے ہوئے کورٹ دیتے ہیں ہندوستان جنت نشان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ اہلِ ہند کی غیرت اور خودداری کس جانور کا نام ہے۔ ایسے لوگ جس قسم کا بھی معاہدہ کر لیں مستوجبِ ملامت نہیں کہے جا سکتے۔ البتہ خوش مذاق اور اہلِ الرائے اصحاب ریڈیو کے محکمہ کی "کم نظری" کی داد ایک ظریف دوست کی زبان میں ضرور دیتے ہیں۔ اور دیتے رہیں گے۔ وہ اس طرح ہے کہ ایک اچھے پائے کے مستند ادیب دوست سے ازراہِ ہمدردی ایک ریڈیو کے شائق دوست نے پوچھا کہ کبھی آپ کبھی ریڈیو پر نہیں بلائے جاتے۔ آپ کی قابلیت اور "تبحرِ علمی" تو کُل ہندوستان میں مانا ہوا ہے۔ تو میرے دوست نے جواب دیا کہ میری قابلیت کی یہی بہترین دلیل ہے کہ مجھے ریڈیو کا محکمہ یاد نہیں فرماتا۔

لگے ہاتھوں معاوضہ کے متعلق بھی ایک "امرِ واقعہ" سُن لیجئے۔ پنجاب کے ایک شخص کا ایک گیت ساری چھ ماہی میں ایک ہی بار نشر ہوا۔ وہ چونّی آنجناب کو ذریعہ منی آرڈر، منی آرڈر کی فیس کاٹ کر بھیجی گئی۔ حساب لگا لیجئے کہ کتنے پیسے گئے ہوں گے۔ بیچارہ بڑی شان سے گھر سے منی آرڈر وصول کرنے باہر آیا۔ مگر ریڈیو والوں کی ستم ظریفی دیکھ کر غصّہ کو پی ہی تو گیا۔ منی آرڈر پر دستخط کر کے ڈاکیہ سے کہنے لگا کہ بھائی رقم پہنچ گئی۔ تم اس رقم کی ہماری طرف سے گنڈیریاں چُوس لینا۔

یہ کوئی نہیں جانتا کہ سرکاری ادارے خواہ "تجارتی" ہوں خواہ "خراج" اُن کا قیام گورنمنٹ کے نقطۂ نگاہ کے تحت ہو۔ یہ اور بات ہے کہ جب سرکاری کام نہ ہو تو تجارتی محکموں کو ذریعۂ آمدنی بھی بنا کر برکاتِ برطانیہ کو سچ کر دکھایا جائے۔ ریڈیو کا محکمہ بھی تجارتی ہے۔ مگر اس کا مقصدِ وحید (ہندوستان میں) سرکاری نقطۂ نگاہ اور مفاد کا پرچار کرنا ہے۔ جہاں تک پروپیگنڈہ کا تعلق ہے یہ آپ کون ہیں جو رموزِ سلطنت میں دخل دیں۔ اس لئے گو ہمیں کتنے سرکاری پرچار کیا جائے تو ہمیں اعتراض کرنے کا حق نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ان حدود سے پرے پروگرام مثلاً سنگیت یا ادب کا شعبہ ایسا ہے کہ اس پر ملک کا ہر "نتھو خیرو" بھی اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔ اور اگر میری آپ کی طرح وہ تھوڑا بہت اہلِ قلم بھی واقع ہوا ہے تو ساقی کی ادبی بزم کی ضیافتِ طبع کے لیے کبھی ایسا لطیفہ بھی پیش کر سکتا ہے جیسے غالباً صرف خدایانِ ریڈیو ہی سُننا پسند نہ فرمائیں۔ سنگیت پروگراموں کے متعلق تو علامہ اقبال مرحوم کی پھبتی غالباً سُنی ہوگی۔ کہتے ہیں جب لاہور ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہونے لگا تو ریڈیو والے علامہ مرحوم سے کوئی پیغام تبرکاً حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوئے۔ علامہ مرحوم نے "دروغ برگردنِ راوی" فوراً ہی تبسم آمیز لہجہ میں دریافت فرمایا "او نے ایتھے بھی سرکاری ہیرا منڈی کھُل گئی اے"، (کیا یہاں بھی سرکاری ہیرا منڈی کھُل گئی ہے؟) (لاہور کی ہیرا منڈی یا ٹبّی کی معنویت کسی سے مخفی نہیں) اب ذرا موازنہ بھی سُن لیجئے۔ بیچارے ادیبوں اور شاعروں کو تو دونّی، چونّی کی خیرات دیکر ٹالا جاتا ہے۔ مگر "طوائف نوازی" ملاحظہ ہو۔ ہر چوٹی کی طوائف گائک ہو یا گلوکار۔ اور اگر یہ دونوں عیاں یکجا ہوں تو سبحان اللہ۔ لکھنؤ کے حلقہ سے لیکر پشاور کے حلقہ تک باقاعدہ سرکاری "گرداوری" کرتی ہے۔ مگر اچنبا تو یہ ہے کہ صرف بیچارے کوئی اکاؤنٹنٹ جنرل بھی اعتراض نہیں کرتا کہ جب لندن سے گائکوں کی آواز باقاعدہ سنی جا سکتی ہے تو یہاں یہ مُسرفانہ "حسین شٹل کاکنگ" کس لئے روا رکھا جا رہا ہے؟ عوام کی چہ میگوئیاں! کیا اُن کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔ عاقلاں خود میدانند۔ رہی ادب اور اخلاق کی دُرگت جو ان رنگیلے پروگراموں میں بنتی ہے تو اس کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس زمانہ کے مخصوص لُغت سے خارج ہو چکے ہیں۔

ریڈیائی مشاعرے اچھا خاصا مذاق ہیں مذاق۔ ایک

ایسے ہی مشاعرے میں شرکت کا ایک مجھے بھی شرف حاصل ہوا تھا۔ اور اچھا ہوا کہ ذ... ئے تو کام کو ... نے لیلئے سحر... ہی دیا کیونکہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

بایں ہمہ ریڈیو کا محکمہ اس خود فریبی میں مبتلا ہے کہ یہ ادب کی ایسی خدمت ہو رہی ہے جسے عوام احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خود فریبی کی معراج ایسی ہی ہونا چاہئے۔

بات بہت لمبی ہو گئی۔ اصل میں میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شعرا کی غزلیں گانے والا یا گانے والی پچاس روپئے روزانہ بلکہ بعض خاص حالات میں اس سے بھی زیادہ کی حقدار سمجھی جاتی ہے۔ مگر شاعر جس نے غزل یا گیت اپنے جگر کا خون پی کر لکھا ایک پیالی چائے کی قیمت کا حقدار بھی نہیں سمجھا جا(تا)۔ اور پھر اس پر اتنی پابندیاں کہ اللہ امان! آخر یہ شعرا کی تحقیر نہیں تو اور کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ آخر شعراء صاحبان کی غیرت کب تک جوش میں نہ آئیگی؟ حضرات! اٹھئے اور اپنی بگڑی کی خبر لیجئے۔ یہ زمانہ غفلت یا مجرمانہ انکساری کا نہیں۔ یاد رکھئے کہ جب تک آپ اپنی عزت کرنے کے خوگر نہ ہونگے دوسرے آپکی عزت کر چکے۔

آیئے اور اپنے جائز حقوق کا بیڑا اُٹھائیے۔ خدایان محکمہ خواہ کتنے ہی ادب نواز ہوں۔ پھر بھی ایک تجارتی محکمہ کو چلا رہے ہیں۔ اور وہ جتنی بھی بچت اپنے محکمہ کو خرچ میں کر دکھائیں اتنی ہی ان کی چاندی ہے۔ سیدھی انگلی گھی نہ کبھی نکلا ہے اور نہ کبھی نکلے گا۔ اس لئے اہل فن کی جبلی غیرت کا واسطہ دیکر شعراء کرام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس تحقیر کے خلاف جو محکمہ ریڈیو نے ان کے خلاف روا رکھی ہے ایک پُر زور اور مخلصانہ آواز اٹھائیں اور خدایان ریڈیو کو مجبور کریں کہ وہ ادب اور ادیبوں کی صاحقہ توقیر اور ادب کرنا سیکھیں۔ اگر چند ایک اچھا لکھنے والے جو ابھی کسی وجہ سے مبتلائے فریب ہیں اور ایگریمنٹ کر چکے ہیں اپنے اقرار ناموں کی تنسیخ کا نوٹس دیدیں تو اس کا فوری اثر ضرور ہوگا۔ اور محکمہ ریڈیو کو یا تو اس ڈھونگ کو فوراً ختم کرنا پڑے گا یا اس میں ضروری اصلاح کرنا ہوگی۔

مع ہٰذا سر سلطان احمد بالقابہ سے بھی اُردو ادب کے نام کا واسطہ دیکر التماس ہے کہ محکمہ ریڈیو کی یہ شاخ جو اس مضمون میں زیر بحث لائی گئی ہے آپ کے نکتہ شناس گوشۂ چشم کی اُمیدوار ہے۔ اس باب میں تھوڑی سی توجہ ضرور فرمائیے گا۔ آپ اگر ذرا سی توجہ فرمائینگے تو کارکنانِ محکمہ کے بھی کان ہو جائینگے اور یہ جو اندھے کی شیرینی بیدریغ بنٹ رہی ہے کسی قانون قاعدہ سے بنٹنے لگے گی۔

امین حزیں سیالکوٹی

شفق

بچھی ہوئی ہے وہ پربت پہ شنگرفی چادر
کہ جیسے چھوٹ رہے ہیں لہو کے فوارے
معاً افق پہ دہکنے لگے ہیں انگارے
چڑھا ہوا ہے وہ سونے کا خول قنطر پر
وہ آفتاب کی کرنوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

فضا میں سرخ دُھندلکے ابھرتے جاتے ہیں
فلک کی مانگ میں سیندور بھرتے جاتے ہیں
شکستِ مہر سے مغرب کا حوصلہ ٹوٹا!
یہ کس نے جامِ اُفق میں گلابیاں بھر دیں۔

نشے میں جھوم رہے ہیں تخیلاتِ جمیل
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ہے روحِ قتیل
گھُلے ملے نظر آتے ہیں آسمان و زمیں
وہ گال شامِ حسیں کے ہیں تمتماتے ہوئے
وہ جا رہا ہے کہیں دن نظر جھکاتے ہوئے

قتیل شفائی

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے

(نمبر ۲)

گذشتہ صحبت میں ہم نے برادرانِ وطن کے ان اعتراضات کا جواب دیا تھا جو انھیں آل انڈیا ریڈیو پر زبان و بیان کے سلسلے میں ہیں۔ اور وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار ہم اس محکمہ میں مسلم عنصر کی کارفرمائی کا قاطع جواب اعداد و شمار سے دیں گے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دو سال قبل کی Amalgamated List مل گئی ہے۔ لیکن اس کے شمار کو ہم نے بعض دوسرے ذرائع سے موجودہ صورتِ حال کے مطابق بنا لیا ہے۔ اب آپ اس چھان پھٹک کا نتیجہ ملاحظہ فرمائیے:

مدراس، ترچناپلی، ڈھاکہ اور کلکتہ کے بارے میں تو کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ تاوقتیکہ ہم اہلِ ہنود کو بھی اہلِ اسلام تصور نہ کریں۔ ہاں اس سلسلہ میں تعجب انگیز بات یہ ہے کہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں بھی جو بنگال میں واقع ہیں اور جہاں کی مسلم آبادی وہاں کے اہلِ ہنود سے زائد ہے۔ مسلم عنصر کا صرف نشان ہی نظر آتا ہے۔ اور وہ بھی نام کو۔ مدراس اور ترچناپلی کا تو ذکر ہی چھوڑئیے۔

اب "بکفر از کعبہ برخیزد" کے مصداق ذرا دہلی پر نظر ڈالو جو نہ صرف مرکزی اسٹیشن ہے بلکہ یہاں ریڈیو کے دیگر متعلقہ شعبے بھی قائم ہیں۔ سب سے پہلے ہم ڈائریکٹر جنرل کے دفتر کو لیتے ہیں۔

ڈائریکٹر جنرل مسلمان، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ایک مسلمان دو ہندو۔ اور اب خدا کا نام لیکر شروع ہو جائیے۔ چیف انجنیئر انگریز، اسسٹنٹ چیف انجنیئر ہندو، پبلک ریلیشنز آفیسر (Public Relations Officer) ہندو، ایڈمنسٹریشن آفیسر ہندو ڈائریکٹر پروگرام ہندو، آفس سپرنٹنڈنٹ دو عدد۔ ہندو، اسسٹنٹ آفس سپرنٹنڈنٹ سات ہندو، چھ مسلمان (کل تیرہ) کلرک دوسرا درجہ پانچ ہندو۔ دو مسلمان (کل سات) کلرک تیسرا درجہ بیس ہندو۔ آٹھ مسلمان (کل اٹھائیس) لائبریرین ایک، ہندو، اسٹینو (Steno) پانچ ہندو، ایک مسلمان (کل چھ) پبلسٹی اسسٹنٹ ایک، ہندو، ڈرافس مین ایک۔ ہندو، ڈرافس مین دوسرا درجہ ایک۔ ہندو، دفتری تین ہندو، تین مسلمان، (کل چھ) جمعدار دوسرا درجہ ایک مسلمان۔ دفتدار ایک۔ سکھ، چپراسی درجہ اول دو میں سے ایک مسلمان، چپراسی دوسرا درجہ تین میں سے دو مسلمان چپراسی تیسرا درجہ نو ہندو پانچ مسلمان (کل چودہ)

ان اعداد پر رائے زنی کا حق محفوظ رکھتے ہوئے اب ہم سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کی طرف آتے ہیں۔ یہاں کی بنیادی عہدے ملاحظہ کیجئے:

چیف ڈائریکٹر آف نیوز: انگریز، سینئر ڈپٹی ہندو۔ چیف نیوز ایڈیٹر پانچ میں سے دو مسلمان۔ سب ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر مذکورہ بالا فہرست کے مطابق چار ہندو ایک مسلمان اور دو ہندو تھے۔ اب اس سلسلے میں اس شعبے کی توسیع ہو چکی ہے اور جہانتک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس توسیع میں بھی انھی بنیادی اعداد نے ترقی کی ہے۔ یہاں انصاف کی رُو سے اس کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو کے خبروں کے شعبے میں ایک ڈپٹی ڈائریکٹر مسلمان بھی ہے۔ لیکن ذرا آگے چلئے (یہ اعداد فہرس کے مطابق ہیں اور توسیع کے انداز انتخاب کا اندازہ ہمارے پہلے بیان سے لگا لیجئے) مترجم بائیس میں سے پانچ مسلمان، فارسی مترجم تین میں سے دو مسلمان، اسٹینو پانچ میں سے پانچ ہندو۔ کلرک درجہ اوّل۔ ایک، ہندو۔ درجہ دوم تین میں سے ایک مسلمان۔ اب آئیے ریسرچ آفس کی طرف (لیکن) زیادہ وضاحت سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ یہاں بھی مسلمانوں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہے۔ ہاں انڈین لسنر کا ایڈیٹر ہندو، آواز کا ایڈیٹر مسلمان اور سارنگ کیلئے ایک ہندو۔

اب لگے ہاتھوں ذرا ایکسٹرنل سروس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے چلئے۔ یہاں اے۔ ایس۔ ڈی تو مسلمان ہے لیکن اس کے نیچے آٹھ پروگرام ایگزیکٹیو میں سے صرف دو مسلمان ہیں اور پروگرام اسسٹنٹ چار ہندو اور دو مسلمان۔ اب ذرا آل انڈیا

ریڈیو کے دلی اسٹیشن کے پروگرام سٹاف کو دیکھئے لیکن شاید اس وقت تک برادرانِ اسلام گھبرا گئے ہوں اس لئے اُن کی طبیعت شگفتہ کرنے کے لئے اطلاعاً عرض ہے کہ اگر آپ سیاسی لحاظ سے بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ یعنی ہندوستان کے چار صوبوں میں اپنی اکثریت سمجھتے ہیں تو آل انڈیا ریڈیو میں یہی غنیمت جانئے کہ اس محکمہ کے پشاور اسٹیشن پر جو صوبہ سرحد کیلئے مخصوص ہے مسلمانوں کی اکثریت نظر آتی ہے کیونکہ یہاں پروگرام اسٹاف میں صرف ایک پروگرام اسسٹنٹ ہندو ہے لیکن ٹیکنیکل اسٹاف کا حال یہاں بھی نہ پوچھئے ورنہ یہ ہنگامی شگفتگی بھی جاتی رہے گی۔

اب پشاور سے راس کماری کی طرف چلئے راستے میں آیا لاہور، یہ پنجاب کا دار الخلافہ ہے۔ پنجاب میں سُنا تھا کہ چھپن فیصدی مسلمان بستے ہیں، اور اسٹیشن کے پروگرام اسٹاف کے تجزیے سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا وہ دعویٰ جو انگریزوں کی مردم شماری کی بنا پر تھا تقریباً صحیح ہے۔ کیونکہ یہاں پانچ ہندو اور چھ مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاید اس ڈر سے کہ مسلمانوں کا غلبہ کوئی بُرا نتیجہ نہ پیدا کرے اسٹیشن ڈائریکٹر ہندو رکھا گیا۔ اشک شوئی کے طور پر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر مسلمان ہے۔ اور اس کے بعد ایک پروگرام ایگزیکٹیو بھی مسلمان لیکن گوشمالی کیلئے ساتھ ہی دوسرا پروگرام ایگزیکٹیو ہندو ہے۔ اس کے بعد آتی ہے پروگرام اسسٹنٹ کی باری، تو یہاں چار میں سے تین غیر مسلم ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنا نقدر خود شناس پر عمل کرتے ہیں۔ اہل اسلام کی چھوٹی تسلی کیلئے ٹیکنیکل اسٹاف کو بھی نظرانداز کرتے ہیں۔

لاہور سے آگے دلی۔ یہاں نہ معلوم کس مصلحت کی بنا پر مساوات کا لحاظ رکھا گیا اور دس ہندو اور دس مسلمان موجود نظر آتے ہیں۔ ہاں آل انڈیا ریڈیو کے کل دس اسٹیشن ہیں۔ اور دس میں سے دو اسٹیشن ڈائریکٹر مسلمان ہیں لکھنؤ کا سرسری جائزہ یہ ہے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر ہندو، اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہندو۔ پروگرام ایگزیکٹیو دو۔ مسلمان۔ پروگرام اسسٹنٹ (جو ہمیں معلوم ہیں) دو ہندو ایک مسلمان۔

بمبئی کی طرف توجہ کرنا بھی لاحاصل ہے سٹیشن ڈائریکٹر مسلمان ہے لیکن ان کا نام پرن جیوتی ہے۔ کیونکہ وہ بوہری کی طرف سے مسلمان ہوئے ہیں۔

اس کے بعد اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے لیکر آخری پروگرام اسسٹنٹ تک نظر ڈال جائیے آپ کو صرف بیچارہ ایک مسلمان پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت میں دکھائی دے گا۔

تو یہ ایک سرسری سا جائزہ ہے اعداد و شمار کا۔ اور یہ نکتہ خصوصاً قابلِ غور ہے کہ ٹیکنیکل اسٹاف ہر اسٹیشن پر برادرانِ ہنود سے بھرپور ہے، حالانکہ جس کام کا تقاضہ ان شعبوں میں کیا جاسکتا ہے اس کے پورا کرنے کی اہلیت اب بہت سے مسلمانوں میں موجود ہے۔ لیکن آپ جانئے یہ لیست وکشاد کے عہدوں کی برکت ہے یا محض حسنِ اتفاق کہ مسلمان ان شعبوں میں کھائی نہیں دیتے۔

برادرانِ وطن اگر مذکورہ بالا بیان سے مطمئن نہ ہوسکیں تو ہماری تجویز ہے کہ وہ اسمبلی میں سوال اٹھاسکتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو میں کتنے ہندو اور کتنے مسلمان کس کس حیثیت میں ملازم ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ہم پر بھی عنایت ہوگی کہ ہمارا یہ جائزہ جو ابھی سرسری ہے آئندہ نسلوں کیلئے مکمل ہوجائیگا۔

آخر میں رخصت ہوتے ہوئے عرض ہے کہ کوئی اور اعتراض ہو تو وہ بھی فرما دیجئے کیونکہ ہم تو یار زندہ صحبت باقی کو قائل ہیں۔

ابنِ آدم ؔ

کتب خانہ علم وادب دہلی کی مختصر فہرست کتب ۱۹۴۵ء

تعلیمات اسلامی پر عام کتابیں

- لغات القرآن۔ مولوی عبدالرشید جلد اول ۱۲ر
- تاریخ القرآن محمد اسلم جے راجپوری عہ ر
- تعلیمات قرآن 〃 ے ر
- تاریخ فقہ اسلامی عبدالسلام ندوی ۱۲ر
- اسلامی قانون فوجداری سلامت خاں ۱۲ر
- تعلیم الاسلام چہار حصہ مفتی کفایت اللہ اول ۲ر دوم ۳ر سوم ۶ر چہارم ۸ر
- وحی الٰہی مولوی سعید احمد عا ر
- فہم قرآن 〃 ے ر
- جنت کی کنجی 〃 عا ر
- دوزخ کا کھٹکا 〃 ۱۲ر
- خدا کی باتیں 〃 ۸ر
- نظریۂ توحید۔ برہان احمد فاروقی۔
- معہ سوانح امام ربانی الف ثانی
- شیخ احمد سرہندی رحمۃ ۱۲ر
- تصوف اور اسلام عبدالسلام ندوی ۸ر
- فیہ مافیہ فارسی عبدالماجد عا ر
- تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام مولوی محمد طیب ۸ر
- اخلاق و فلسفۂ اخلاق حفیظ الرحمٰن ۱۲ر
- قصص القرآن 〃 جلد اول عہ ر
- 〃 〃 جلد دوم للعہ ر
- 〃 〃 جلد سوم للعہ ر
- دین کامل سید عبدالقیوم ۸ر
- نسخۂ کیمیا محمد یوسف ے ر
- دین اسلام چودھری افضل حق ۸ر
- پیام امین عبداللہ ۱۲ر
- اسلامی نظام تعلیم ریاست علی ندوی عہ ر
- اسلام کا نظام تعلیم وتربیت سید مناظر احسن للعہ ر
- احکام نسواں راشد الخیری ۱۲ر
- قرآنی قصے 〃 ۸ر

- دیوہ اسلام راشد الخیری ۱۲ر
- دعائیں 〃 ۱۰ر
- جنایات بر جائداد 〃 ۸ر
- فضائل نماز محمد زکریا عہ ر
- برکاۃ ذکر 〃 عا ر
- فضائل قرآن مجید 〃 ۸ر
- فضائل رمضان 〃 ۶ر
- فضائل تبلیغ 〃 ۶ر
- بہشتی زیور مولانا اشرف تھانوی ۹ر
- بہشتی زیور زناں 〃 ے ر
- پردے کی باتیں مولوی احمد سعید ۱۲ر
- رسول کی باتیں 〃 عہ ر
- خطبات ابوالاعلیٰ مودودی ۸ر
- تنقیحات 〃 ۸ر
- تفہیمات 〃 ۸ر
- پردہ 〃 ۸ر
- رسالہ دینیات 〃 ۸ر
- تجدید وحیائے دین 〃 ۸ر
- حقوق الزوجین 〃 ۶ر
- مسئلۂ جبر وقدر 〃 عہ ر
- اسلام اور ضبط ولادت 〃 ۱۲ر
- سلامتی کا راستہ 〃 ۵ر
- راہ عمل ابوالاعلیٰ مودودی ۲ر
- اہم استفتا 〃 ۲ر
- دین حق 〃 ۶ر
- اسلام اور جاہلیت 〃 ۵ر
- افادات شاہ ولی اللہ۔ صدر الدین ۸ر

علمی کتابیں

سائنس۔ فلسفہ۔ منطق

سائنس

- مشاہدات سائنس عا ر
- مکالمات سائنس نصیر احمد ۸ر
- معلومات سائنس 〃 ۱۲ر
- بجلی کے کرشمے محمد معشوق حسن ۸ر
- القمر عہ ر
- طبقات الارض ۸ر
- رسالہ علم نباتات عہ ر
- حیات کیا ہے ۱۲ر
- معدنی دباغت سید امداد علی ۸ر
- اضافیت رضی الدین ۱۲ر
- پودے اور انکی زندگی 〃 عا ر
- ارتقا مشتاق احمد عہ ر

فلسفہ ومنطق

- ضبط نفس اور نفس پرستی گاندھی عہ ر
- ہیگل مارکس اور نظام اسلام محمد مظہر الدین ۸ر
- نفسیات فاسدہ 〃 ے ر
- تاریخ فلسفہ سیاسیات۔ پروفیسر محمد حبیب للعہ ر
- علم کلام شبلی عا ر
- الکلام 〃 عا ر
- برکلے اور اسکا فلسفہ۔ برکلے عہ ر
- مبادی علم انسانی 〃 عہ ر
- مکالمات برکلے 〃 عہ ر
- مبادی فلسفہ عبدالماجد۔ اول عہ ر
- 〃 〃 دوم عہ ر
- نفسیات ترغیب سید تاج الدین ۱۲ر
- افکار عصریہ محمد عثمان ۱۲ر
- خواب کی دنیا۔ عبدالمالک آروی عہ ر
- فلسفۂ آلہیات۔ محمد حسین آزاد عہ ر

- بچوں کی نفسیات شبیر محمد اختر ۱۲ر
- نفسیات زندگی 〃 ۱۲ر
- تعلیمی نفسیات عا ر
- طربیہ خداوندی ے ر
- فلسفۂ جذبات۔ عبدالماجد عا ر
- اقوال زردشت۔ ڈاکٹر منصور احمد ے ر
- تنقید عقل محض۔ ڈاکٹر عابد علی ے ر
- ہماری نفسیات ۱۲ر
- مکالمات افلاطون سید عابد علی للعہ ر
- فلسفۂ خواب۔ عبدالمالک آروی عہ ر
- داستان دانش۔ خلیفہ عبدالحکیم ے ر

سیاسی واجتماعی کتابیں

- اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مولوی سعید احمد للعہ ر
- غلامان اسلام 〃 ۸ر
- مسلمانوں کا عروج وزوال 〃 ۱۲ر
- بین الاقوامی سیاسی معلومات 〃 ۸ر
- شہنشاہیت۔ مظفر شاہ خاں عا ر
- شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک۔ عبید اللہ سندھی ۸ر
- شاہ ولی اللہ اور انکا فلسفہ 〃 ۸ر
- سوشلزم کی بنیادی حقیقت مفتی الدین شمسی للعہ ر
- بساط سیاست مظہر علی اظہر ۸ر
- مشین اور مزدور باری ۸ر
- فاسزم ہیرلڈ لاسکی ۸ر
- آزادی کی راہیں 〃 عا ر
- راجا اور کسان 〃 ۸ر
- صاحب اور مذہب 〃 ۸ر
- بابو اور مزدور 〃 ۸ر
- سوشلزم 〃 ۸ر
- سرمایہ داری عبدالملک ۸ر
- جاگیرداری 〃 ۸ر
- آمریت اکرام قمر ۸ر

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم وادب۔ اردو بازار دہلی

احساس کمتری۔ شبیر محمد اختر ۸ر
عربوں کی قومی تحریک مسعود علی ندوی ۱ر
معیشت زر۔ ابن الحسن ۸ر
مبادی سیاسیات۔ ہارون خاں شیروانی ۱۲ر
قوم کی آواز ڈاکٹر عابد حسین ۱۸ر
وفاق ہند سید نجم الدین عہ ر
یورپ کی حکومتیں // ۱۸ر
اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ محمد عاقل ۱۲ر
ہندوستان کا دیہی قرض // ۴ر
مسئلہ آبادی // ۴ر
دیہی صنعتیں // ۴ر
جدید دستور کا خاکہ زین العابدین ۳ر
ہندوستان میں برطانوی حکومت // ۱۲ر
شہری آزادی رام منوہر ۶ر
انگلستان کا طریقہ حکومت شانتی سروپ ۵ر
بحر الکاہل کی سیاست۔ امین الدین خالدی ۱۸ر
اسلامی ممالک کی سیاست۔ عشرت علی ۱۸ر
مضامین محمد علی مولانا محمد علی مرحوم دوم اللعہ ر
تاریخ مسلم لیگ۔ مظہر انصاری ۷ر
تاریخ مسلم لیگ ماخذ حسین بی اے ۱۸ر
ہندوستان کا نیا دستور حکومت۔
ہندوستانی لیڈر ۴ر
پاکستان اور ہندوستان۔ عبدالقدوس ہاشمی ۱۲ر
پاکستان اور مسلمان۔ ایم آر ٹی ۱۸ر
تقاریر جناح۔ مفتی غلام جعفر ۱۸ر
خطبات جناح // ۱۲ر
دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ۔ ابوالاعلیٰ مودودی ۱۸ر
اسلام اور اشتراکیت // ۴ر
پارلیمانی طرز حکومت منظور حسین ہاشمی ۱۲ر
انقلاب الامم۔ ڈاکٹر لیبان ۴ر
طبقات الامم۔ قاضی احمد میاں عہ ر
روح الاجتماع۔ محمد یونس ۱۲ر

راجا اور پرجا۔ ملا سلطانی عہ ر
غلامی کا انسداد // ۱۴ر
ہمارے زمانے کی غلامی // ۸ر
سوویٹ روس جواہر لال نہرو ۱۸ر
حکومت خود اختیاری اور ہند مسلم مسئلہ کا حل } سید طفیل احمد ۱۴ر
روشن مستقبل // ۵ر
مولد ہی خلیل الرحمٰن ۱۲ر
مسلمانان ہند کی نئی سیاسی۔ محمد مرزا ۱۸ر
دوسری جنگ عظیم // ۱۲ر
زندہ روس // ۱۲ر
سیاست ملیہ محمد امین زبیری ۷ر
تاریخ احرار افضل حق ۱۸ر
سیاست جاپان۔ علی امام بلگرامی ۱۰ر
اشتراکی روس عبدالقادر ۶ر
تنظیم مابعد جنگ۔ انور اقبال ۶ر
مسائل انقلاب ہند۔ ایم این رائے ۸ر
خطبات ابوالکلام آزاد۔ ابوالکلام آزاد ۷ر
مضامین ابوالکلام آزاد۔ ہر دو حصہ ۱۲ر
انسانیت موت کے دروازے پر ۱۲ر
تبرکات۔ ابوالکلام آزاد ۱۲ر
مقالات الہلال // ۱۲ر
مضامین الہلال // عہ ر
مسلمان اور کانگریس // ۱۲ر
ہمارے ہندوستانی مسلمان صادق حسین ۱۲ر
ہندوستان اور آزادی مظفر شاہ خاں ۱۸ر
ہندوستانی ریاستوں کا مستقبل خواجہ معین الدین ۱۸ر
تاریخ جرم و سزا۔ امداد صابری اول ۱۸ر
// // // ۷ر
جرم و سزا باری ۱۴ر
مسلمانان ہند کا مطالبہ ایم آر ٹی ۴ر
پیرل پور رپورٹ عہ ر
ہندوستان کا آئندہ کانسٹی ٹیوشن عہ ر

وارد ہا اسکیم ۴ر
گفتگوئے مصالحت ۶ر
جنگ مکتبہ سیاسیہ ۸ر
سوشلزم اور اسلام // ۱۲ر
وارد ہا اسکیم اور مسلمان // ۶ر
ہندوستان کا تہذیبی مستقبل // ۶ر
عرضداشت بخدمت علمائے کرام // ۴ر
اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم // ۴ر
خدا کی بادشاہت۔ مکتبہ سیاسیہ ۶ر
کفار سے دوستی // ۶ر
خطبہ صدارت علامہ اقبال // ۶ر
ہندوستان اور سوشلزم // ۴ر
متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی ۸ر
پیام مشرق مکتبہ سیاسیہ ۴ر
متحدہ قومیت // ۴ر
مسئلہ ہند اور اس کا حل // ۴ر
سلیم کے نام // ۲ر
زبان کا مسئلہ // ۴ر
شاہ ولی اللہ قرآن اور حدیث // ۶ر
سوراجی اسلام // ۶ر
اسلام اور مذہبی رواداری // ۶ر
متداول دستور ہند // ۴ر
اسلام اور سائنس // ۴ر
جدید مملکت پر اقبال کی تنقید // ۸ر
پاکستان مکتبہ سیاسیہ ۱۳ر
پاکستان قومی تحریک // ۴ر
نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ // ۶ر
کانگریس بے نقاب // ۶ر
جنگ // ۲ر
مسلمانوں کی زندگی ۶ر
علم تفسیر // ۶ر
اسلامی معاشرت // ۶ر
ہندوستان کے مسلمانوں کا جائزہ // ۲ر

تاریخ دستور حکومت ہند۔ ڈاکٹر یوسف حسن ۱۲ر
ریاست ڈاکٹر ذاکر حسین للعہ ر
اسلام کا نظام حکومت // ۱۲ر
اندرون ہند خالدہ ادیب خانم ۷ر
تاریخ احرار۔ چودھری افضل حق ۱۸ر
خطبات بمبئی منظور نعمانی عہ ر
مسئلہ قومیت۔ ابوالاعلیٰ مودودی ۱۸ر
اسلامی حکومت // ۵ر
نظریہ سیاسی // ۵ر
پاکستان اور اچھوت۔ چودھری افضل حق ۱۸ر
ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں۔ محمود خاں ۱۸ر
خطبات عبیداللہ۔ عبیداللہ سندھی ۱۸ر
ہٹلر کا نیا نظام امتیاز حسین ۱۰ر

معاشیات

اسلام کا اقتصادی نظام۔ مولوی حفظ الرحمٰن ۱۲ر
سرمایہ ایم۔ ایم جوہر ۱۸ر
مبادی معاشیات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۲ر
طلبیات عامہ خواجہ محمد حسین ۱۸ر
تاریخ ہند کے ازمنہ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات } عبدالمجید یوسف عہ ر
معاشیات مقصد اور منہاج۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۲ر
دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے اسباب } محمد مجیب ۸ر
ہندوستان کی اقتصادی تاریخ۔ خواجہ عبدالمجید ۶ر
معاشیات اور پاکستان عبدالقدوس ہاشمی ۱۲ر
جنگ اور راتب ہندی۔ سید احمد مینائی ۱۸ر
جنگ اور روپیہ۔ امتیاز حسین ۱۲ر
جنگ اور اغذیہ۔ ڈاکٹر انور اقبال ۱۰ر
جنگ اور مالیہ امتیاز حسین ۱۲ر
ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات } محمد احمد خان ۴ر
جنگ اور غذا کا مسئلہ۔ شفیق الرحمٰن ۱۲ر
جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ } محمد احمد خاں عہ ر

انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے — محمود احمد خاں ۸ر
امریکہ — ؍؍ — عطاء الرحمٰن ۸ر
کینیڈا — ؍؍ — شمس الدین ۸ر
ہندوستان — ؍؍ — ؍؍ ۸ر
اسلام کا معاشی نظام۔ غلام دستگیر ۸؍
اجرتی محنت اور سرمایہ۔ عابد علی ۱۲ر
علم معیشت — محمد الیاس برنی ۸؍
ہمارے مزدور۔ عبدالقادر ۹ر
ہماری ریلیں اور سڑکیں۔ ڈاکٹر جعفر حسین ناصر ۱۲ر
ہمارے بینک — محمود احمد ۱۲ر
اسلام کا معاشی مسئلہ۔ ابوالاعلیٰ مودودی ۵ر

تعلیم

تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۸؍
روح تہذیب۔ غلام السیدین ۶ر
اصول تعلیم — ؍؍ — ۳ر
اسلامی تہذیب کیا ہے۔ غلام دستگیر ۸؍
فن صحافت۔ چودھری رحم علی ۸؍
ہندوستان کے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت — سید مناظر حسن گیلانی للعہ ر
تعلیمی نفسیات — ؍؍ — ۸؍
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق بسراس مسعود ۸؍
فلسفہ تعلیم — غلام السیدین ۱۲ر
نظریہ تعلیم — قاضی عبدالمجید۔ اول ۱۲ر
؍؍ — ؍؍ — دوم ۳ر
طالب العلم کی زندگی ۱۲ر
فن تقریر — محی الدین زور ۱۲ر
فن انشا پردازی — ؍؍ — ۸؍

قواعد اردو۔ عربی۔ فارسی

قواعد عربی۔ مولانا عبداللہ السورتی ۸؍
زبان دانی (اردو) — ؍؍ — ۸؍
آموزگار پارسی — آزاد مرحوم ۱۲ر
قند پارسی — ؍؍ — ۱۰ر

قواعد اردو۔ مولوی عبدالحق ۸؍
صرف و نحو اردو — ؍؍ — عہ ر
اسباق النحو۔ حمید الدین۔ اول و دوم ۱۰ر
آمد نامہ ۲ر۔ مصدر فیوض ۹ر
فصول اکبری ۱۲ر علم الصیغہ ۱۲ر
صرف میر ۶ر نحو میر ۹ر

شاعری و عروض

العروض والقوافی۔ جلال الدین ۱۲ر
بحر العروض — ؍؍ — ۶ر
فن شاعری۔ ارسطو ترجمہ عزیز احمد ۱۲ر
راز عروض — سیماب ۶ر
معلم فہم عروض۔ منظر صدیقی ۸ر
شاعری و عروض ۵ر

لغات

عربی

لغات القرآن مولوی عبدالرشید۔ اول للعہ ر
عربی اردو ڈکشنری ؍ — ۵ر
لغات جدید — ؍؍ — ۸؍

فارسی

فرہنگ عامرہ ۳ر
لغات سعیدی۔ منیر لکھنوی ۵ر
غیاث اللغات ۵ر
نقش بدیع۔ مولوی وجاہت حسین ۸؍
لغات کشوری۔ زیر طبع
کریم اللغات ۸؍ لغات فارسی للعہ ر

اردو

نور اللغات۔ مکمل چہار جلد ۵۰
جامع اللغات — ؍؍ — للعہ ۵
سعیدی ڈکشنری منیر لکھنوی ۵ر
وضع اصطلاحات۔ وحید الدین سلیم ۸؍
دریائے لطافت۔ انشا ۳ر
عزیز اللغات مرزا ہادی عزیز لکھنوی ۳ر
لغت آزاد۔ آزاد ۸؍

جدید اللغات اردو۔ آزاد للعہ ر
محاورات ہندوستان ۸؍
فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں۔
ظفر الرحمٰن دہلوی جلد اول تا پنجم فی حصہ ۱۲ر
؍؍ — ؍؍ — جلد ششم ۸؍
؍؍ — ؍؍ — جلد ہشتم ۸؍
؍؍ — جلد ہفتم ۱۲ر
اصطلاحات عالمگیریہ مکمل تین جلدیں ۳ر
بازاری زبان۔ ارمعین الشعرا ۵ر

انگریزی سے اردو

اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۵ر
ایضاً۔ سٹوڈنٹ ایڈیشن خورد ۳ر

ادبی کتابیں

تاریخ ادب

آب حیات۔ آزاد — زیر طبع
تاریخ ادب اردو۔ رام بابو لعہ ر
تاریخ نظم و نثر اردو۔ آغا باقر ۸؍
داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ۵ر
تاریخ و تنقید — ؍؍ — ۸؍
تاریخ مثنویات اردو۔ جلال الدین ۸؍
تاریخ قصائد اردو۔ نصیر حسین ۸؍
اردو مثنوی کا ارتقا — ؍ — ۱۲ر
داستان ریختہ۔ خواجہ عبدالمجید ۵ر
کیفیہ — کیفی و تاثریہ ۳ر
ادب اور انقلاب۔ اختر رائے پوری ۸؍
جائزہ زبان اردو۔ ؍ — ۸؍
مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔ انجمن ترقی اردو ۵ر
ترکوں کی اسلامی خدمات اور انکی زبان و ادبیات — ؍؍ — ۸؍
تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید — پروفیسر براؤن للعہ ر

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام — عبدالحق ۸ر
روسی ادب۔ پروفیسر مجیب مکمل ۵ر
جگ بیتی۔ دتاتریہ کیفی ۸ر
دنیائے افسانہ۔ ظفر علیخاں ۸؍
تاریخ کیا ہے — باری ۸ر
ہماری قومی زبان۔ سر سپرو ۸ر
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ — ڈاکٹر عبداللہ ۳ر
ماثر محمد — ؍؍ — ۸؍
فردوسی پر چار مقالے۔ محمود شیرانی ۸؍

تذکرہ

شعر الہند — مولانا شبلی حصہ اول ۸؍
؍؍ — ؍؍ — دوم ۸؍
شعر العجم — ؍؍ — حصہ اول ۸؍
؍؍ — ؍؍ — دوم ۸؍
؍؍ — ؍؍ — سوم ۸؍
؍؍ — ؍؍ — چہارم ۸؍
؍؍ — ؍؍ — پنجم ۸؍
گل رعنا — ؍؍ — للعہ ر
یادگار غالب — حالی ۳ر
حیات جاوید — ؍؍ — ۸؍
تذکرہ محسن — امین زبیری ۸؍
تذکرہ وقار — ؍؍ — ۱۲ر
نصرتی — ڈاکٹر عبدالحق ۸؍
نکات الشعرا — میر تقی میر ۸؍
تذکرہ ریختہ گویاں۔ فتح علی حسینی ۱۲ر
مخزن الشعرا۔ قاضی نور الدین ۸؍
چمنستان الشعرا۔ لچھمی نرائن ۸؍
تذکرہ ہندی — مصحفی ۸؍
ریاض الفصحا — ؍؍ — ۸؍
عقد ثریا — ؍؍ — ۱۲ر
تذکرہ گلزار ابراہیم۔ نواب علی ۸؍

مخزن نکات قیام الدین ۸/عہ
ذکر میر میر تقی میر عا/
گل عجائب اسد علی خاں ۸/عہ
رہنمایان ہند بالمزرائن پرشاد عا/
امرائے ہنود محمد سعید ۸/ے
تذکرہ شعرائے اردو۔ اختر علی تلہری ۱۲/عہ
تذکرہ علما آزاد ۵/
دبدبۂ امیری عبدالحکیم ۸/عا
دکن کا پہلا شاعر ادیس احمد ۱۲/
〃 ناول نگار 〃 ۸/عہ
حسرت موہانی عبدالشکور عا/
تذکرہ یورپین شعرا اردو۔ محمد سردار ۱۲/
دور جدید کے ہندو شعرا 〃 ۸/عا
ارباب نثر اردو سید محمد ۸/عا
تذکرہ حالی محمد اسمٰعیل عا/
دستور الفصاحت۔ حکیم سید احمد علی خاں ۸/عا
مراۃ الشعر مولوی عبدالرحمٰن ے/
سیر المصنفین۔ محمد یحییٰ تنہا حصہ دوم ۸/ے
اردو جدید کے چند ہندو منتخب شعرا عبدالشکور ۸/عا
اکبر الہ آبادی۔ طالب الہ آبادی صہ/
غالب مہر زیر طبع
غالب نامہ اکرام 〃
روح غالب۔ محی الدین قادری ۸/عا

تنقید

تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور ۸/عہ
تنقیدی جائزے۔ سید احتشام حسین ۱۲/ے
نقد و نظر۔ حامد حسین قادری ے/
مداوا فرقت کاکوروی للعہ/
روح تنقید محی الدین زور ۸/عا
اردو شہ پارے 〃 ۱۲/ے
تنقیدات عبدالحق۔ ڈاکٹر عبدالحق ۸/عہ
چند تنقیدات عبدالحق 〃 ۸/

محاسن کلام غالب۔ عبدالرحمٰن بجنوری عہ/
نئے ادبی رجحانات 〃 ۸/ے
سودا انجمن ترقی اردو ہند ۸/عا
ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری عا/
اردو شاعری پر ایک نظر۔ حکیم الدین ے/
اردو تنقید پر ایک نظر 〃 ۸/ے
افسانہ نگاری۔ ذوالعظیم ۸/عہ
ہمارے افسانے 〃 ۸/عہ
افکار نو عمل احمد ۸/عہ
مقدمہ رقعات عالمگیر شبلی ے/
موازنہ انیس و دبیر 〃 ۸/عا
اقبال انجمن ترقی اردو ۸/عا
روح اقبال ڈاکٹر یوسف حسین صہ/
اقبال کا مطالعہ نذیر نیازی ۸/عا
اقبال اور اس کا پیغام رفیق نادر ۸/
اقبال کی شاعری۔ عبدالمالک آروی ۱۲/
اقبال کا تصور فن مکار۔ ڈاکٹر رضی الدین ۱۲/
شاد و اقبال محی الدین زور ۸/عا
موت و حیات اقبال کے کلام میں، ڈاکٹر رضی الدین ۸/
اقبال کے چند جواہر ریزے۔ خواجہ عبدالمجید ۱۰/
آثار اقبال غلام دستگیر رشید ۱۲/ے
ذکر اقبال 〃 للعہ/
اقبال پر ایک نظر سید محمد شاہ ۱۲/عا
شرح اسرار خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں ۸/عہ
اقبال اور آرٹ لطیف فاروقی ۸/عہ
فلسفۂ عجم ڈاکٹر اقبال ۱۲/ے
تعلیمات اقبال۔ یوسف خاں تسلیم ۸/عہ
ٹیگور اور انکی شاعری۔ محی الدین زور ۸/عہ
تنقید شعر العجم محمود شیرانی صہ/
افادی ادب اختر انصاری ۸/
ایک ادبی ڈائری 〃 ۸/للعہ زیر طبع
نذر دلی مختلف ادیب ے/
نقد الادب حامد اللہ عا/

مقالات و انشار

دعوت نامے۔ حفیظ الرحمٰن سرداری ے/
یہ دلی ہے یوسف بخاری دہلوی عا/
بازگشت 〃 ۸/عہ
موتی 〃 عہ/
خمارستان آغا شاعر قزلباش ۸/عا
لیلیٰ کے خطوط قاضی عبدالغفار ۸/عا
مجنوں کی ڈائری 〃 عا/
ناکام خواجہ محمد شفیع عہ/
باقیات بجنوری عبدالرحمٰن بجنوری للعہ/
مقالات ہاشمی نصیر الدین ۸/عا
مضامین الہلال ابوالکلام آزاد عا/
مضامین ابوالکلام آزاد 〃 مکمل دو حصے ے/
مضامین البلاغ 〃 ے/
مضامین آزاد۔ مرتبہ عبدالعزیز بٹ ے/
مقالات آزاد ابوالکلام آزاد ے/
انسانیت موت کے دروازے پر 〃 عا/
گفت و شنید بشیر ہاشمی ۸/عا
دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۸/عا
خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد ۸/للعہ
مکاتیب غالب عرشی للعہ/
انتخاب غالب 〃 ۱۲/عہ
اردوئے معلیٰ غالب ۸/عا
عود ہندی 〃 عہ/
مضامین محمد علی مولانا محمد علی مرحوم دو جلد للعہ/
مقالات محمد علی 〃 جلد اول
〃 〃 دوم ۸/للعہ
خطوط محمد علی 〃 ے/
محمد علی کی ذاتی ڈائری۔ عبدالماجد دریابادی ۱۲/عا
مضامین عبدالماجد 〃 ۱۲/للعہ
یقین و عمل 〃 ۸/عا
قصص و مسائل 〃 ۱۲/عہ
مکاتیب شبلی شبلی اول و دوم ۸/ے

افادات مہدی۔ مہدی حسن ے/
افادات سلیم سلیم ۸/عا
مضامین عالمگیر شبلی ۸/عا
رقعات عالمگیر 〃 ۵/
خیال آفریں دماغ۔ عرش تیموری ۶/
مضامین چغتائی عظیم بیگ چغتائی عہ/
ادبستان خلیقی دہلوی ۸/عا
مضامین فلک پیما۔ فلک پیما ۱۲/ے
نیرنگ خیال آزاد مکمل ۸/عہ
مکتوبات آزاد 〃 عہ/
طلسم عمل 〃 ۸/عا
مشام محمود۔ عبدالمالک آروی ۸/عا
مضامین مالک 〃 ے/
محشر خیال سجاد مرحوم للعہ/
گہتاں جلی نیاز فتحپوری عہ/
حسن کی عیاریاں 〃 عا/
مکتوبات نیاز 〃 اول زیر طبع
〃 〃 دوم ے/
اشارات جوش ملیح آبادی عا/
ادبی مقالات بشیر علی صدیقی ۸/عا
شاہراہ زندگی رام سروپ کوشل ۸/عہ
ادب اور ادیب پروفیسر مجیب ۶/
رضیہ کے خطوط رضیہ سلطانہ ۸/عہ
لعل و گوہر 〃 عہ/
مقالات شبلی شبلی اول ۸/عہ
〃 〃 دوم ۱۲/
〃 〃 سوم ۸/عہ
〃 〃 چہارم ۸/عہ
〃 〃 پنجم عہ/
〃 〃 ششم ۸/عہ
〃 〃 ہفتم ۱۲/
〃 〃 ہشتم ۸/عہ

مضامین شرر شرر لکھنوی حصہ اول ۱۲ ر
〃 〃 حصہ دوم ۱۲ ر
〃 〃 حصہ سوم عہ ر
〃 〃 جلد دوم حصہ اول ۱۲ ر
〃 〃 〃 دوم عہ ر
〃 〃 〃 سوم عہ ر
〃 جلد سوم حصہ اول ۱۲ ر
〃 دوم عہ ر
〃 〃 سوم عہ ر
〃 جلد چہارم عہ ر
〃 جلد پنجم عہ ر
〃 جلد ششم عہ ر
جلد ہفتم عہ ر
[illegible]
مقالات حالی حالی مکمل ے ر
خطبات عبدالحق ڈاکٹر عبدالحق حصہ اول عہ ر
〃 〃 دوم عہ ر
انتخاب داغ احسن مارہروی ۱۲ ر
مضامین فراق ناصر نذیر فراق دہلوی عہ ر
پھول والوں کی سیر مرزا فرحت اللہ بیگ ۶ ر
دلی کا آخری مشاعرہ 〃 عہ ر
قلب حزیں راشد الخیری سوم ۱۲ ر
لڑکیوں کی انشا 〃 ۱۰ ر
مسلی ہوئی پتیاں 〃 ۸ ر
یادگار شمدان 〃 ۷ ر
عالم نسواں 〃 ۱۰ ر
عروس مشرق 〃 ۱۲ ر
گدڑی کا لعل 〃 عہ ر
مسلمان عورت کے حقوق 〃 عہ ر
نالۂ زار 〃 ۱۴ ر
بلبل سیمار 〃 ۱۲ ر
ساجن موہنی 〃 ۵ ر
فریب ہستی 〃 ۷ ر

بیگمات کے آخری دن - راشد الخیری ۵ ر
چمنستان مغرب 〃 عہ ر
بکھری ہوئی پتیاں 〃 عہ ر
خیابان نسواں نصیر الدین ہاشمی عہ ر
پردہ و تعلیم 〃 عہ ر
جمال ہمنشیں خاتون اکرم عہ ر
تحریر النساء صغرا ہمایوں عہ ر
ادب نازنیں جناب امتیاز علی ۱۲ ر
نغمات موت 〃 ۱۰ ر
دولت بر قربانیاں آمنہ نازلی ۱۲ ر
عقل کی باتیں 〃 ۱۲ ر
انشاء سلمیٰ ولی احمد خاں ۱۰ ر
فن صحافت 〃 عہ ر
مقالات جمال الدین افغانی
خطبات گارساں دتاسی - گارساں دتاسی ۱۲ ر
مقالات گارساں دتاسی - جلد اول للعہ ر
〃 دوم زیر طبع للعہ ر

ناول

حسن بن صباح شرر لکھنوی ۶ ر
منصور موہنا 〃 عہ ر
دلچسپ 〃 کامل عہ ر
دلکش 〃 کامل عہ ر
ایام عرب شرر لکھنوی للعہ ر حسن انجلینا شرر لکھنوی عہ ر بدر النسا کی مصیبت 〃 عہ ر
ملک العزیز ورجنا 〃 عہ ر فردوس بریں 〃 عہ ر
رومتہ الکبریٰ 〃 عہ ر لعبت چین 〃 عہ ر
ماہ ملک 〃 ے ر شوقین ملکہ 〃 عہ ر
مینا بازار 〃 عہ ر بابک خرمی 〃 عہ ر
عزیز مصر 〃 عہ ر مفتوح فاتح 〃 عہ ر
فتح اندلس 〃 ے ر یوسف نجمہ 〃 عہ ر
حسن کا ڈاکو شرر لکھنوی عہ ر
آغا صادق کی شادی 〃 عہ ر
اسرار دربار حرام پور 〃 ۱۰ ر
طاہرہ عہ ر غیب دان دلہن 〃 عہ ر

قیس و لبنیٰ عہ ر زینت کا سپس شرر لکھنوی عہ ر
حیات صالحہ راشد الخیری ۱۲ ر
منازل السائرہ ۱۲ ر صبح زندگی 〃 عہ ر
شام زندگی عہ ر شب زندگی مکمل عہ ر
نوحہ زندگی ۱۴ ر طوفان حیات عہ ر
جوہر قدامت عہ ر سنا کا چاند عہ ر
ماہ عجم عہ ر عروس کربلا عہ ر یاسمین شام عہ ر
محبوبۂ خداوند عہ ر تیغ کمال عہ ر
منتظر طرابلس ۶ ر آفتاب دمشق ۱۲ ر
شاہین اور دراج ۱۲ ر در شہوار ۱۲ ر
ابن الوقت ڈپٹی نذیر احمد عہ ر
مراۃ العروس 〃 عہ ر
بنات النعش 〃 عہ ر
توبتہ النصوح 〃 عہ ر
اقبال دلہن ڈپٹی بشیر الدین ۱۲ ر
حسن معاشرت 〃 عہ ر
اصلاح معیشت 〃 ۱۲ ر
سلامبو عنایت اللہ مکمل للعہ ر
نجم السحر 〃 ے ر
تائیس 〃 عہ ر
فاطمہ کی آپ بیتی ایم اسلم ے ر
نرگس ایم اسلم عہ ر
〃 〃 وصلیب عہ ر
کوہ سلیمان عہ ر آشرم 〃 عہ ر
〃 عہ ر شام و سحر 〃 عہ ر
بیتی ماں عہ ر شب غم 〃 عہ ر
نگہت قیسی رامپوری عہ ر
دھوپ عہ ر چوراہا 〃 ۱۲ ر
تسنیم للعہ ر سزا 〃 عہ ر
دل کی آواز عہ ر آخری فیصلہ 〃 عہ ر
اپاہج قیسی رامپوری عہ ر
الجھن ٹیگور عہ ر چوکھیر والی ٹیگور ے ر
بڑی دیدی 〃 عہ ر قربانی 〃 عہ ر

طوفان زندگی عہ ر ساحرہ ٹیگور عہ ر
زندگی اور موت ٹیگور عہ ر دلہن ٹیگور عہ ر
بچارن 〃 عہ ر منزل عشق 〃 عہ ر
کمودنی 〃 عہ ر کون کسی کا 〃 عہ ر
ڈاک گھر 〃 ۱۲ ر شمع الفت 〃 ے ر
رانہ سانہ چٹرجی عہ ر
خانماں برباد 〃 عہ ر
دیہانی سماج 〃 ۱۲ ر
پنڈت جی عہ ر سوال 〃 للعہ ر
اس نے کہا قاضی عبدالغفار عہ ر
سیب کا درخت 〃 عہ ر
شاعر کا انجام نیاز فتحپوری ۱۲ ر
شباب کی سرگذشت 〃 عہ ر
سلمیٰ (بغداد کا جوہری) اشرف صبوحی عہ ر
بن باسی دیوی 〃 ے ر
شمع فروزاں صادق الخیری عہ ر
دوشیزۂ صحرا 〃 عہ ر
محبت و نفرت - احتشام حسین رائپوری عہ ر
پیاری زمین 〃 ۱۲ ر
بھابی جان فضل حق قریشی عہ ر
فرعون عہ ر سگ لیلیٰ 〃 عہ ر
چندرا موہنی انصار ناصری عہ ر
وحشی 〃 عہ ر
پیلی چھتری ظفر عمر عہ ر
لال کنٹھور 〃 عہ ر
بھوروں کا کلب 〃 ۹ ر
سودائی رشید اختر ندوی عہ ر
سوز دروں 〃 عہ ر
ساز شکستہ 〃 عہ ر
ہرجائی ے ر تلخیاں 〃 ے ر
قدرت کے کھیل سدرشن عہ ر
زہر یلا آبحیات 〃 عہ ر
تصویر اے آغا تون دہلوی للعہ ر

نشیب و فراز راشد الخیری ۶ر
شہید مغرب ،، ۸عہ
دامن باغباں ،، ۸عہ
افسانۂ حرم ،، ۱۲ار
گلستان خاتون ،، عہ
پیکر وفا ،، ۸ر
بچھڑی بیٹی ،، ۸ر
دل کی چند عجیب ہستیاں۔ اشرف صبوحی عہ
جھروکے ،، ۸عہ
دانہ و دام راجندر سنگھ بیدی ۸عہ
گرہن ،، ۸عہ
بگولے احمد ندیم قاسمی سے
طلوع و غروب ،، ۱۲عہ
آنچل ،، ۱۲عہ
انگڑائیاں ،، سے
سیلاب ،، ۸سے
گرداب ،، ۱۲سے
ان داتا مرزا ادیب ۸عہ
دنیائے آرزو ،، عہ
موت کا راگ ،، عہ
صحرانورد کے رومان ،، سے
ستارۂ صبح راجہ مہدی علیخاں عہ
شمع حرم ،، سے
چاند کا گناہ ،، سے
چندن سدرشن سے
سولہ سنگار ،، ۸سے
طائر خیال ،، عہ
سدا بہار پھول ،، ۸عہ
خوش و خرم ،، ۴عہ
خوشش انجام ،، ۶ر
چٹکیاں ،، ۸ر
ضربیں قیسی رامپوری سے
کیفستاں ،، ۸عہ

سماج کے ستون قیسی رامپوری ۱۰ر
دل کی باتیں کاظم دہلوی عہ
اپنے خواب ،، عہ
گرمیں شفیق الرحمٰن عہ
مدوجزر ،، ۸عہ
لہریں ،، ۱۲سے
زلزلے قدوس صہبائی ۱۲عہ
کروٹیں ،، ۱۲عہ
نگارستان نیاز فتحپوری سے
جمالستان ،، للعہ
نقاب اٹھ جانے کے بعد ،، ۸ر
رنگین چھینٹے کوثر چاندپوری ۱۲عہ
عورتوں کے افسانے ،، ۸عہ
نزک جھونک ،، ۱۲عہ
دنیا کی حور ،، ۱۲عہ
اشک و شرر ،، ۱۲عہ
شیخ جی ،، ۱۲عہ
گھما گھمی ممتاز مفتی ۱۲عہ
ان کہی ،، ۸عہ
ہماری گلی احمد علی ۱۲عہ
قید خانہ ،، ۸عہ
خواب خیال مجنوں گورکھپوری ۸عہ
سمن پوش ،، ۸عہ
مجنوں کے افسانے ،، عہ
گردش ،، عہ
نظروںمیں منظر اختر اورینوی ۸عہ
کلیاں اور کانٹے ،، ۱۲عہ
لاشوں کا شہر مسٹر عبدالقادر عہ
صدائے جرس ،، عہ
خیالستان سجاد حیدر یلدرم سے
زندگی چودھری افضل حق سے
جواہرات ،، عہ
آزادی ہند ،، سے

میرا افسانہ چودھری افضل حق عہ
خاموش حسن شکور ۸عہ
پھول اور کلیاں ،، عہ
بہارن ،، ۱۲عہ
مشاہیر کے رومان شبلی بی کام ۸عہ
تاریخی رومان ،، عہ
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ ناصر نذیر فراق ۴ر
سات طلاقوں کی کہانیاں ،، ۴ر
شیخ و برہمن اعظم کریوی ۸عہ
پریم کی چوڑیاں ،، ۴عہ
انقلاب ،، ۱۲عہ
کنول ،، ۱۲عہ
یاران میکدہ عبدالشکور ۸عہ
دھوپ چھاؤں ،، ۸عہ
سرگزشت ہاجرہ صغریٰ ہمایوں عہ
موہنی ،، ۱۴ر
نئے پرانے سہیل عظیم آبادی ۱۲عہ
الاؤ ،، ۸عہ
بھنور شبیر محمد اختر ۴عہ
سائے ،، ۸عہ
جھلکیاں سید یوسف بخاری عہ
کلیاں عصمت چغتائی سے
کہکشاں رفیع اجمیری سے
جالے شمشیر سنگھ نرولا ۱۲عہ
پردہ سیمیں ڈاکٹر نصیرالدین سے
حسن کی قیمت احمد شجاع عہ
سرکش روحیں خلیل جبران ۴عہ
رفیق تنہائی علی عباس سے
شبستان الم زبیدہ سلطان ۸عہ
ایک لڑکی احمد عباس ۸عہ
الہامی افسانے مرتضیٰ احمد خاں ۸عہ
مشرق و مغرب کے افسانے۔ عاشق حسین بٹالوی، شہید وفا ۴عہ

زندگی کی ٹھوکریں۔ رئیس احمد جعفری سے
ارباب شکستہ۔ جمیل احمد عہ
سفید چمگادڑ ،، عہ
ٹالسٹائی کے افسانے۔ ٹالسٹائی عہ
پنگھٹ رفعت ہاشمی عہ
روشنی اور سائے۔ انور کمال عہ
جوار بھاٹا۔ راماننداں گر سے
آئینے ،، سے
عروس ادب عباس حسین ۸عہ
عشق کی گولیاں۔ فرحت اللہ بیگ ۴ر
خواب پریشاں۔ عنایت اللہ ۴ر
سچی کہانیاں۔ پریم پجاری سے
سات تارے۔ مختلف ادیب سے
ایک کہانی ،، ۸ر
پرچھائیں حامد اللہ افسر ۸عہ
دنیا کے روائتی افسانے احمد حسین ۸عہ
چند افسانے خواجہ محمد شفیع عہ
آئینۂ حیرت رفیق حسین عہ
باغی لڑکی ۴عہ
پنکھڑیاں رحیم چمن ۴عہ
رات کا بھولا اور دوسرے افسانے ۴عہ
ان پڑھ میاں۔ خواجہ عبدالمجید ۶ر
منٹو کے افسانے منٹو ۱۲عہ
تقدیریں منظور بخاری عہ
ناخواندہ مہمان۔ سید بادشاہ حسین ۴عہ
ٹھوکر پریم چند ۴عہ
آہیں طفیل ملک ۱۲عہ
گرد و پیش مختلف ادیب عہ
۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے ،، عہ
حلیمہ عبدالغفار ۶ر
غیرت کی پتلی فاطمہ بیگم ۸ر
زندگی کے نئے زاوئے۔ رئیس احمد جعفری سے، چار رخ انیس فاطمہ ۶ر

فیروزہ جمیلہ بیگم ۱۲ر
تقیصیں امیں شرچودری عہ
جام ومینا مرتبہ حکیم یوسف حسن عہ
دیچے پرویز عہ
ساغرومینا اسلم کاشمیری عہ
کارزار مختلف ادیب عہ
سوزحیات سلیمان ارشد عہ
ٹوٹے ہوئے دل محمد جمیل احمد عہ
تاثرات " عہ
جلوہ نگس ڈاکٹر نصیرالدین ے
نگینے مظفر حسین عہ

طنزیات ومضحکات

روح ظرافت عظیم بیگ چغتائی عہ
روح لطافت " عہ
چمکی " عہ زیر طبع
کولتار " عہ
آدم خور " عہ
شریر بیوی " زیر طبع
شہزوری " " ۱۰ر
ویمپائر " " عہ
دیکھا جائیگا " زیر طبع
فل بوٹ " "
جنت کا بھوت " "
مرزا جنگی " ۸ر
خلوطا کی ستم ظریفی " ۸ر
سوانہ کی روحیں " ۸ر
انٹلمنٹ " زیر طبع
تفویض " "
خانم " "
چینی کی انگوٹھی " "
ملفوظات شامی " ۱۲ر
مقراض محبت " ۶ر
قدردان " ۶ر

فرزند سرحد عظیم بیگ چغتائی ۶
کھرپری " عہ
مسٹر کرٹا علے " عہ
کنزوری " عہ
چغتائی کے افسانے۔ " مکمل عہ
کھرپا بہار " عہ
بکواس شوکت تھانوی عہ
بیوی " عہ
طوفان تبسم " عہ
بحر تبسم " عہ
شیش محل " عہ
سونیا چاہ " عہ
دل پھینک " عہ
شیطان کی ڈائری " عہ
خانم خاں " عہ
معمہ خاتون " عہ
سنی سنائی " عہ
نانی عشو راشد الخیری ۱۰ر
ولایتی نمی " ۸ر
تمعہ شیطانی " ۱۴ر
دادا لال بجھکڑ " ۱۰ر
لاٹھی اور بھینس ملا رموزی عہ
شفاخانہ " عہ
خلوط رموزی " عہ
مضامین رموزی " عہ
گلابی اردو " عہ
تماشے پہ تماشا۔ ناکارہ حیدرآبادی عہ
صمدانی " " عہ
چٹکیاں اور گدگدیاں۔ خواجہ حسن نظامی عہ
سی پارۂ دل عہ
کانا باتی عہ
حاجی لق لق کے افسانے۔ حاجی لق لق عہ
پرواز لق لق " عہ

مضامین لق لق۔ حاجی لق لق عہ
ادب کثیف " عہ
کیلے کا چھلکا سندباد جہازی عہ
جدید جغرافیہ پنجاب " عہ
دو ڈاکٹر " ۱۰ر
گدھوں میں بیداری ابوخشیم فرید آبادی عہ
رنگین لفافہ " عہ
ہنسانے فسانے " عہ
آب حیات کے لطیفے۔ آغا محمد اشرف عہ
بے پر کی آوارہ عہ
بزم لطائف عبدالعزیز بٹ عہ
سنگ وخشت کنہیا لال کپور عہ
ہنسی کی باتیں " ۱۰ر
تاریخی لطیفے آمنہ نازلی ۱۰ر
گہوارہ تبسم ظریف دہلوی عہ
طنزیات ومضحکات رشید صدیقی عہ
پطرس کے مضامین۔ پطرس بخاری عہ
عشق کی گولیاں فرحت اللہ بیگ عہ
سات طلاقنوں کی کہانیاں۔ فراق دہلوی عہ

داستان

داستان رانی کیتکی۔ انشاء اللہ خاں انشاء عہ
سب رس ملا وجہی عہ
باغ وبہار میرامن عہ
دختر فرعون۔ ترجمہ لطافت حسین مکمل عہ
اخوان الصفا ۱۲ر
حکایات رومی۔ نظام شاہ لبیب اول عہ
" " دوم ۱۲ر
الف لیلیٰ ولیلیٰ۔ ترجمہ ڈاکٹر منصور احمد اول عہ
" " دوم عہ
" " سوم عہ
" " چہارم عہ
فسانہ آزاد رتن ناتھ سرشار مکمل چار جلد عہ
جام سرشار " عہ

سیر کوہسار رتن ناتھ سرشار عہ
داستان مجاہد " عہ
فسانہ عجائب۔ رجب علی سرور عہ
جوامع الحکایات " مکمل عہ
حکایات آغانی۔ انجمن ترقی اردو عہ

ڈرامے

گناہ کی دیوار۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی عہ
ہمزاد " ۶ر
نقش آخر " ۱۲ر
نفرت کا بیج " ۸ر
بت تراش " ۴ر
کٹ پتلیاں " ۸ر
مٹھائی کی ٹوکری " ۴ر
بند لفافہ " ۴ر
کارخانہ خلیل الرحمن ۱۲ر
نئی روشنی " عہ
ظاہر باطن " عہ
حشرات الارض عہ
ارنسٹ عہ
پروین وثریا فضل حق قریشی عہ
تعلیم زدہ بیوی ۸ر
ریڈیو ڈرامے عہ
لیڈر ۶ر
منٹو کے ڈرامے منٹو ے
آؤ " عہ
تین عورتیں " عہ
کربلا منشی پریم چند عہ
روحانی شادی " ۱۰ر
انطونی قلوپطرہ عنایت اللہ عہ
پاپی اوپندر ناتھ اشک عہ
جمہوریت وآمریت نصیرالدین عہ
انجام پروفیسر مجیب ۸ر
ایک ایکٹ کے ڈرامے۔ علی عباس حسینی عہ

دروازہ کرشن چندر عگار
بھوت 〃 عہ ر
ناتق محمد نعیم الرحمٰن عگ ر
فریب عمل جگت موہن لعل عگار
فاؤسٹ ڈاکٹر عابد حسین ہے ر
معمار اعظم عزیز احمد عہ ر
شعور افضل حق ۶ ر
ڈرامہ اکبر آزاد مرحوم عہ ر
جلال الدین خوارزم شاہ سجاد حیدر یلدرم عگار
گناہ خواجہ محمد شفیع ۸ ر
نئی روشنی کے لڑکا لڑکی خواجہ عبدالمجید ۸ ر
ماسٹر صاحب ٹیگور ۱۰ ر
شہید وفا شرر ۱۰ ر
روح سیاست محمد عاقل ۸ ر
ٹیگور کے ڈرامے۔ ٹیگور عگ ر
ریحانہ الطاف مشہدی عہ ر
سنی سائی شوکت تھانوی عگ ر
باپ کا گناہ حکیم احمد شجاع ہے ر
انطونی کلاپطرہ مولوی عنایت اللہ عہ ر
ہر دو یاس 〃 عہ ر
سماج کے ستون قیسی رامپوری ۱۰ ر
انسان کی زندگی انڈریف عہ ر
روح کلام غالب مرزا ظفر بیگ عگار

نظم

متقدمین متوسطین متاخرین جدید

کلیات میر میر تقی میر عہ ر
دیوان درد درد ۱۲ ر
شرح درد خواجہ محمد شفیع عہ ر
کلیات سودا سودا مکمل ے ر
رنگین انشا انشا عگار
کلیات آتش آتش عہ ر
کلیات مومن مومن عہ ر
کلیات نظیر نظیر اکبرآبادی عہ ر

دیوان نظیر۔ مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ عگار
مراثی انیس۔ انیس مکمل ۲ حصے للعہ
مراثی دبیر دبیر 〃 ۲ 〃 ہے ر
دیوان ناسخ ناسخ ۱۲ ر
دیوان ذوق ذوق عگار
قصائد ذوق 〃 عگار
دیوان غالب اردو۔ غالب دہلوی للعہ ر
〃 تاج ایڈیشن قسم اول ے ر
〃 〃 دوم عگ ر
〃 〃 سوم عہ ر
〃 طلائی ایڈیشن پاکٹ سائز مجلد عگار
〃 بلا جلد عہ ر
انتخاب غالب عرشی رامپوری عہ ر
مرقع چغتائی چغتائی عہ
نقش چغتائی 〃 عہ
شرح دیوان غالب اردو حسرت موہانی عہ ر
〃 بیخود دہلوی ہے ر
بیان غالب آغا باقر ے ر
کلیات غالب فارسی غالب عہ ر
کلیات ظفر ظفر دہلوی ے ر
دیوان مجروح مجروح عہ ر
نظم آزاد آزاد عہ ر
بیاض آزاد 〃 عہ ر
خمکدہ آزاد 〃 ۱۲ ر
دیوان اثر اثر عہ ر
مثنوی خواب و خیال 〃 عہ ر
〃 یقین یقین عہ ر
〃 تاباں تاباں عگ ر
کلیات اکبر الہ آبادی اکبر الہ آبادی زیر طبع
مراۃ الغیب امیر مینائی عہ ر
دیوان حالی حالی عہ ر
مسدس حالی 〃 عہ ر
مناجات بیوہ 〃 ۴ ر

شکوۂ ہند حالی ۴ ر
مجموعہ نظم حالی 〃 ۱۰ ر
تحفۃ الاخوان 〃 ۴ ر
چپ کی داد 〃 ۳ ر
حب وطن 〃 ۳ ر
منتخب داغ۔ مرتبہ احسن مارہروی ے ر
بہار داغ۔ مرتبہ نذیر نیازی عگار
کلیات شبلی اردو شبلی عہ ر
〃 فارسی 〃 عہ ر
الہامات شاد مرتبہ عبدالمالک آروی ۸ ر
دیوان شیدا حکیم اجمل خاں دہلوی قسم اول عگ ر
〃 〃 دوم عگار
دیوان جان صاحب۔ جان صاحب عہ ر
انتخاب زریں سر راس مسعود ہے ر
انقلاب دہلی نظامی بدایونی عہ ر
مثنوی میر حسن حسن دہلوی ۱۰ ر
مثنوی گلزار نسیم دیا شنکر نسیم ۱۰ ر
افکار سلیم سلیم پانی پتی ہے ر
رباعیات خیام مترجمہ قوی امروہوی عگ ر
رباعیات خیام خیام ۶ ر
رباعیات ابوسعید ابوالخیر۔ ابوسعید ۱۲ ر
رباعیات سرمد سرمد عہ ر
بزم مشاعرہ کیفی ۸ ر
انتخاب وحید وحید عہ ر
مثنوی قطب مشتری۔ ملا وجہی ۱۲ ر
جنگ نامہ عالم علی خاں ۶ ر
دیوان جوشش۔ قاضی عبدالودود عگ ر
دیوان حافظ مترجم ے ر
〃 بلا ترجمہ عگار
مثنوی حسن فطرت ۱۲ ر
بانگ درا ڈاکٹر اقبال للعہ ر
بال جبریل 〃 للعہ ر
ضرب کلیم 〃 ے ر

اسرار و رموز ڈاکٹر اقبال للعہ ر
ارمغان حجاز 〃 للعہ ر
زبور عجم 〃 بلا جلد ہے ر
پیام مشرق 〃 زیر طبع
شکوہ جواب شکوہ 〃 ۶ ر
نقش و نگار جوش ملیح آبادی للعہ ر
شعلہ و شبنم 〃 ے ر
فکر و نشاط 〃 عگ ر
حرف و حکایت 〃 للعہ ر
روح ادب 〃 ہے ر
آیات و نغمات 〃 ے ر
عرش و فرش 〃 للعہ ر
شعلۂ طور۔ جگر مراد آبادی قسم اول عہ ر
نشاط روح اصغر گونڈوی عگار
سرور زندگی 〃 عہ ر
عرفانیات فانی 〃 عہ ر
کلیات فانی 〃 زیر طبع
کلیات حسرت۔ حسرت موہانی ے ر
آبگینے اختر انصاری عہ
خوناب 〃 عہ ر
خندۂ سحر 〃 عہ ر
نغمۂ روح 〃 عہ ر
نغمۂ حرم اختر شیرانی عگار
شعرستان 〃 عہ ر
صبح بہار 〃 ہے ر
کار امروز سیماب اکبرآبادی ے ر
کلیم عجم 〃 ے ر
ساز و آہنگ 〃 للعہ ر
سرور غم 〃 ۱۲ ر
جذبات ماہر۔ ماہر القادری عگار
نغمات ماہر 〃 ے ر
محسوسات ماہر 〃 ے ر
ذکر جمیل 〃 عہ ر

رنگ محل ساغر نظامی ےر
گفتار بیخود بیخود دہلوی ےر
دُرِّ شہوار بیخود " عہ
آہنگ مجاز عہ
آبشار فیض جھنجھانوی عہ
شباب انقلاب۔ نہال سیوہاروی ےر
گلبانگ آزادی " ۱۲ر
اسرار علی اختر ےر
سلاسل جانثار اختر عہ
گرداب اختر الایمان عہ
گلکدہ عزیز لکھنوی عہ
دیہاتی گیت اعظم کریوی ۱۲ر
روداد قفس راشد الخیری ۱۲ر
گرفتار قفس " ۴ر
رنگ و بست اثر لکھنوی عہ ۱۲ر
سر نظم ہاشمی ہاشمی فرید آبادی ۴ر
دیوان ثاقب ثاقب لکھنوی عہ
راز و نیاز حبیب الشعراء دہلوی ۶ر
خیابان ترنم۔ سلام مچھلی شہری عہ
میرے نغمے " عہ
مناظر قدرت الیاس برنی عہ
علم مجلس۔ منشی عزیز الرحمٰن دہلوی مکمل عہ
پھولوں کی ڈالی۔ خواجہ عزیز حسن عہ
سہلات ترید ترید ۴ر
انتخاب عصر جدید۔ آل احمد سرور عہ
فروزاں جذبی عہ
نغمۂ نور بہزاد لکھنوی عہ
کیف و سرور " عہ
چراغ طور " عہ
موج طہور " عہ
موج نور " عہ
بیان حضور " عہ
کفر و ایمان " عہ

نعت حضور بہزاد لکھنوی ۱۲ر
میراجی کی نظمیں میراجی عہ
گیت ہی گیت " عہ
میراجی کے گیت " ۱۲ر
ماورا ن۔م۔ راشد عہ
نقش فریادی فیض عہ
طرح نو نذیر مرزا ۸ر
جلوہ گاہ مخمور جالندھری عہ
نوائے حرم رح۔س صاحبہ عہ ۱۲ر
لہو ترنگ علی وجد ےر
خیابان محمود اسرائیلی عہ
نصیب فطرت احسان بن دانش عہ
آتش خاموش " عہ
جادۂ نو " ۱۲ر
نغمہ فردوس۔ چودھری جوشی محمد مکمل للعہ
معرکۂ شکست و شرر للعہ
زنداں یوسف ظفر ےر
زہر خند " عہ
نگارستان ظفر علی خاں للعہ
مثنوی عائشہ صدیقہ ۴ر
اسرار حیات حسرت ۱۲ر
حسن کے دو نور رخ آزاد انصاری ۴ر
مثنوی حسن فطرت ۱۲ر
پریت کے گیت۔ الطاف مشہدی عہ
الطاف کے گیت " عہ
پریت کے گیت مختلف شعرا ۶ر
سنہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں ۱۲ر
سنہ ۱۹۴۲ء " عہ
سنہ ۱۹۴۳ء منتخب غزلیں عہ
سنہ ۱۹۴۳ء معیاری غزلیں و نظمیں عہ
میری بہترین نظم حسن عسکری عہ
گلبانگ حیات امین حزیں ےر
درد دل میکش ورانی عہ

ذکر و فکر مختلف شعرا عہ
راحت کدہ اثر صہبائی عہ
دیوان بہرام انجمن ترقی اردو عہ

تاریخ
مختلف ممالک

تاریخ انقلاب روس۔ ایم ایم جوہر عہ
انقلاب فرانس باری ۸ر
جگ بیتی جواہر لعل نہرو عہ
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش خالدہ ادیب خانم عہ
صحیفۂ چین اسد علی انوری عہ
انقلاب فرانس عبد القادر عہ
انقلاب افغانستان عہ
زوال غازی ےر
انقلاب روس عہ
جمہوریہ چین میر عابد علی خاں عہ ۱۲ر
مشرق بعید شاہد حسین عہ
چینی مسلمان عہ
تاریخ یونان قدیم عہ
حقیقت جاپان بدر الاسلام ےر
تاریخ تمدن " مکمل دو حصے للعہ
مشاہیر یونان و روما اول للعہ
" " دوم للعہ
تاریخ ملل قدیم عہ ۱۲ر
ریاست ڈاکٹر ذاکر حسین عہ
علم الاقوام ڈاکٹر عابد حسین اول عہ
" " دوم عہ
نگارستان فارس آزاد ےر
سیر ایران " عہ
کائنات عرب " ۶ر
تمدن عرب سید علی بلگرامی ۲۵ر
گہوارہ تمدن نیاز فتحپوری عہ
تمدن عتیق ےر

بخارا کا جمہوری انقلاب۔ قدوس صہبائی ۹ر
ترکستان خاتون شاہراہ انقلاب پر " ۹ر
واقعات قوم قائم خانی ےر
نسل اور سلطنت عزیز احمد عہ
ایران بعہد ساسانیاں۔ انجمن ترقی اردو عہ
کتاب الہند البیرونی مکمل ےر

تاریخ ہند

یہ دلی ہے سید یوسف بخاری عہ
دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی عہ
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ ناصر نذیر فراق ۴ر
چار چاند " ۸ر
لال قلعہ کی ایک جھلک " عہ
دلی کا آخری دیدار وزیر حسن دہلوی ۱۲ر
بزم آخر۔ منشی فیاض الدین عہ
دلی کا سنبھالا خواجہ محمد شفیع عہ
ہم اور وہ " عہ
معلوں کا مد و جزر " ۶ر
دلی کی آویزیں " ۸ر
دلی کی دو سو برس کی تاریخ۔ سید حسن برنی عہ
واقعات دار الحکومت دہلی بشیر الدین مکمل ۳ حصے عہ
قلعہ معلی کی جھلکیاں۔ عرش بیخودی ۸ر
نوبت پنج روزہ راشد الخیری عہ ۱۲ر
دلی کی آخری بہار " عہ
بزم رفتگاں " ۱۲ر
داستان پارینہ " ۱۴ر
غدر کی ماری شہزادیاں " ۱۴ر
داستان غدر۔ ظہیر دہلوی عہ
بیگمات کے آنسو حسن نظامی عہ
انگریزوں کی بپتا " ۱۲ر
محاصرہ دہلی کے خطوط " ۴ر
بہادر شاہ کا مقدمہ " عہ
گرفتار شدہ خطوط " عہ
غدر دہلی کے اخبار " ۴ر

غالب کا روزنامچہ حسن نظامی ۱۲ار
دہلی کی جانکنی 〃 عہ
دہلی کا آخری سانس 〃 عہ
غدر کی صبح و شام 〃 ۸ر
دہلی کی آخری شمع 〃 عہ
غدر کا نتیجہ 〃 ۸ر
انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ — حسام الدین عہ
گفت و شنید ۸ر
بازگشت یوسف بخاری عہ
بھول والوں کی سیر — مرزا فرحت اللہ بیگ ۶ر
خارستان آغا شاعر ۸ر
مرحوم دہلی کالج — انجمن ترقی اردو زیر طبع ۱۲ر
تاریخ ہند ہاشمی فرید آبادی ۱عہ
مختصر تاریخ ہند اعظم گڈھ ۷ر
اندرون ہند خالدہ ادیب خانم ۱ے
تاریخ جنوبی ہند محمود خاں ے
تاریخ سلطنت خداداد 〃 ے
تاریخ ہند قدیم عہ
واقعات مملکت بیجاپور بشیر الدین دہلوی عہ
تاریخ راجگان ہند ے
تاریخ ہند کی تمہید پروفیسر مجیب ۶ر
کمپنی کی حکومت باری للعہ
ہندوستان کی کہانی عبدالسلام ۱۲ار
البیرونی حسن برنی ۸ر
مقدمہ تاریخ ہند — اکبر شاہ نجیب آبادی ۱عہ
نظام سلطنت 〃 ۸ر
افسانہ پدمنی — مولوی احتشام الدین عہ
شہر میسور قیصر مصطفیٰ عہ
انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ — ہندوستانی اکیڈمی ے
قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب — پریم چند للعہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں — مولوی ابوالحسنات ۱۲ار
بہارستان کشمیر — عبدالصمد سیوہاروی
تمدن ہند میں دکن کا حصہ — عبداللہ چغتائی ۱۲ار
حیدرآباد کی نسوانی دنیا — نصیر الدین ۸ر
مانڈو غلام یزدانی ۸ر
بدھ اور اسلامیات حفیظ احمد عہ

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام امیر علی للعہ
ہماری بادشاہی عہ
عرب و ہند کے تعلقات — سلیمان ندوی للعہ
تاریخ الامت — اسلم جے راجپوری مکمل سٹ للعہ
نبی عربی زین العابدین عہ
خلافت راشدہ 〃 ۱ے
خلافت بنی امیہ 〃 ے
المدینۃ والاسلام — محمد فریدوں ۸ر
عربوں کا تمدن نذیر نیازی ۸ر
آب کوثر محمد اکرام ۸ر
موج کوثر 〃 ؟
غزوات نبوی ۸ر
خلافت اور ہندوستان ۸ر
خلافت اور ہندوستان عہ
دنیائے اسلام اور خلافت ۶ر
تاریخ متعلیہ مکمل دو جلدیں سے
تاریخ اخلاق اسلامی ۱۲ار
عرب کی موجودہ حکومتیں عہ
خواتین اندلس ۱۲ر
اخبار مجموعہ انجمن ترقی اردو ۱۲ار
تاریخ اسلام — حاجی معین الدین ندوی اول ے
〃 دوم ے
〃 سوم ے
〃 چہارم ؟
دربار رسول کے فیصلے حکیم عبدالرشید ۱ے

اسلامی تہذیب ۸ر

سیر و سوانح

سیرۃ امام ابن تیمیہ غلام جیلانی ۸ر
آثار جمال الدین افغانی — قاضی عبدالغفار
جمال الدین افغانی 〃 ۶ر
عہد حاضر کے بڑے لوگ — محمود مرزا دہلوی للعہ
حیات حافظ — اسلم جے راجپوری ۸ر
〃 جامی 〃 عہ
حیات اقبال 〃 عہ
سیرت اقبال ۱ے
ترکان احرار عہ
عبدالعزیز ابن سعود — سردار محمد ۸ر
رضا شاہ پہلوی محمد اشرف عطا ۸ر
کارنامہ پہلوی محمد حسن بلگرامی للعہ
سیرت عمرو بن عاص — اسلم جے راجپوری عہ
سلطان الہند محمد بن تغلق — آغا مہدی حسن ۸ر
خلفائے راشدین — مطبوعہ دارالمصنفین للعہ

کتب سلسلہ سیر الصحابہ

مہاجرین اول عہ
〃 دوم ے
سیر الانصار اول ے
〃 دوم ۸ر
سیر الصحابہ اول ۸ر
〃 دوم ۸ر
سیر الصحابیات عہ
اسوۂ صحابہ اول ۸ر
〃 دوم ۱ے
مکمل سٹ اسوۂ صحابہ مع ۱۲سے
تابعین — مطبوعہ دارالمصنفین للعہ
الفاروق شبلی للعہ
المامون 〃 عہ
الہارون 〃 ۸ر
الغزالی 〃 عہ

سیرت نعمان شبلی عہ
سوانح مولانا روم 〃 عہ
حیات امام مالک — سلیمان ندوی عہ
سیرت عمر بن العزیز — عبدالسلام ندوی ۸ر
سیرت عائشہ — سلیمان ندوی ۸ر
اسوۂ صحابیات 〃 ۱۰ر
خیام 〃 ۱ے
حیات شبلی 〃 سے
حیات سعدی عہ
اسمٰعیل شہید عہ
ٹیپو سلطان — عبداللہ بٹ ۸ر
ابوالکلام آزاد 〃 ۸ر
سلاطین و قائدین اسلام — یوسف بغدادی عہ
عبیداللہ سندھی محمد سرور للعہ
البرامکہ عبدالرزاق عہ
سیدہ کی بیٹی رازق الخیری ۱۲ار
امت کی مائیں راشد الخیری ۸ر
سیرۃ عائشہ شرر لکھنوی ۱۰ر
الزہرا راشد الخیری عہ
سیدہ کا لال ۸ر
سیرت معاویہ 〃 ۸ر
عابد حسین 〃 عہ
سیرت خالد بن ولید 〃 ۸ر
ابوذر غفاری 〃 ۱۰ر
حکایات صحابہ محمد زکریا ۸ر
کارل مارکس باری ۸ر
اسٹالین 〃 ۸ر
اسٹالین — محمد آصف علی بیرسٹر للعہ
عصمت انونو — ثریا اندریان ۸ر
ٹراٹسکی نریندرناتھ ۸ر
ہمارا لینن مائل ملیح آبادی ۸ر
لینن ۸ر
کولمبس مبلا رام ۸ر

ہندوستان کے لیڈر۔ یوسف میر علی ۸ر
سبھاش بوس گوپال متل ۸ر
گاندھی 〃 ۸ر
جواہر لال نہرو 〃 ۸ر
ابوالکلام آزاد عبداللہ بٹ ۸ر
تلاش حق گاندھی زیر طبع
میری کہانی جواہر لال نہرو 〃
جواہر لال کی کہانی نذر رحیم حسن ۸ر
گورکی کی ڈائری حسن عباس ۸ر
کاشانۂ نادر عبدالرحمٰن ۱۲ر
مشاہیر کی بیویاں ۱۲ر
اتاترک محمد مرزا عہ
ہٹلر اعظم۔ چندر شیکر شاستری عہ
اعمال نامہ سر سید رضا علی ھ
مشاہیر عالم کی داستان مصیبت ۸ر
مہاراجہ موتی سنگھ خواجہ حسن نظامی ۸ر
نپولین ۱۲ر
مسولینی کی آپ بیتی عہ
ٹیگور احسان عہ
میرا بچپن ٹیگور عہ
میرا لڑکپن 〃 عہ
یادگار حسرت جمیل احمد عہ
سرگذشت ٹالسٹائی عہ
حیات جاوید حالی عہ
گورکی کی آپ بیتی۔ اختر رائے پوری مکمل عہ
بزم اکبر قمر الدین ۱۲ر
ملک محمد جائسی عہ
گلبدن بیگم ابن الحسن عہ
سرگذشت غالب عہ
گوتم بدھ عہ

سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت النبی شبلی جلد اول للعہ
〃 دوم ھ
سیرت النبی شبلی جلد سوم ھ
〃 〃 چہارم ھ
〃 〃 پنجم ۸ر
〃 〃 ششم ھ
مکمل ۲۷ر
رحمۃ العالمین۔ قاضی محمد سلیمان جلد اول ھ
〃 دوم و سوم زیر طبع
سیرت نبوی اور مستشرقین 〃 عہ
محبوب خدا افضل حق عہ
سیرت رسول عربی نور بخش ھ
سرور کائنات۔ سید امیر علی عہ
مُردوں کا مسیحائی عبدالماجد للعہ
خطبات مدراس سلیمان ندوی عہ
〃 انگریزی عہ
محمد عربی باری ۸ر
پاک زندگی سعید احمد ۶ر
محمد رسول اللہ۔ مقبول سیوہاروی عہ
شان خدا عبدالرحمٰن عہ
فضائل نبوی محمد ذکریا ھ
رسول عربی گوردت سنگھ ۸ر

مواعظ

آمنہ کا لال راشد الخیری عہ
محسن حقیقی 〃 ۸ر
میلاد حبیب ۸ر
ذکر میلاد ۸ر
میلاد شریف خواجہ محمد شفیع ۴ر
نیا میلاد مجیبی ۸ر

شہادت

سیدہ کا لال راشد الخیری عہ
عروس کربلا 〃 عہ
سچا شہادت نامہ عہ
ذکر الشہادتین عہ

سفرنامے

محمد علی کے یورپ کے سفر محمد سرور عہ
سفرنامہ روم و مصر و شام۔ شبلی عہ
سفر حجاز عبدالماجد عہ
راہ وفا عہ
سیاحت ہند راشد الخیری عہ
اچھوتا سفر ولی احمد خاں ۶ر
سفرنامہ ناصر خسرو عبدالرزاق ھ

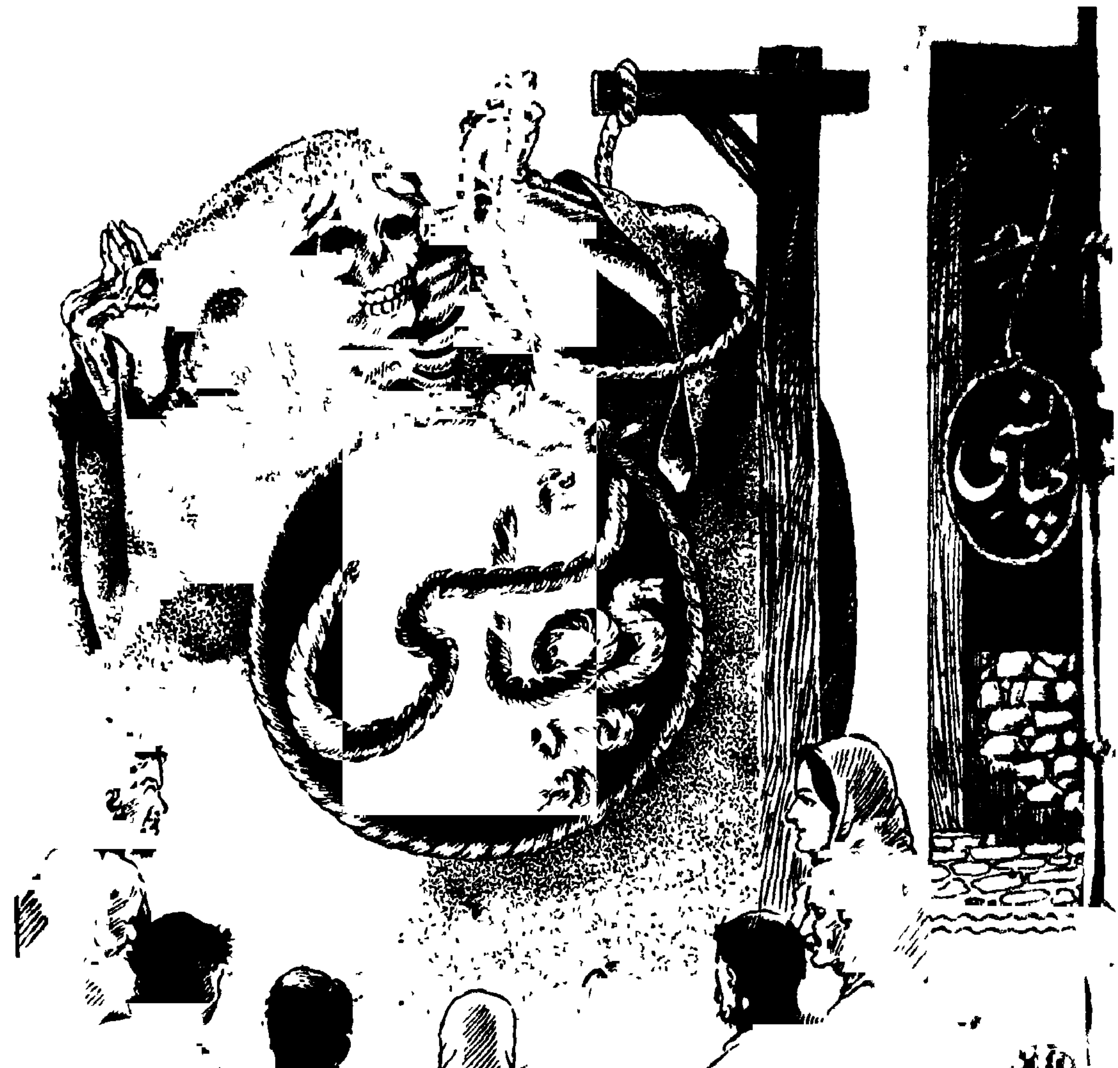
عام معلومات

ہوائی حملے آغا محمد اشرف ۱۲ر
علم باغبانی ہندوستانی اکیڈمی ھ
ترقی زراعت عبدالقیوم للعہ
عالم حیوانی برجیس بہادر ھ
حیوانی دنیا کے عجائبات۔ عبدالبصیر عہ
ہماری غذا عہ
ترغیبات جنسی نیاز فتحپوری ھ
سیاروں پر زندگی کے امکانات } عبدالرحمٰن ۱۰ر
کاروان علم قیس محمد۔ بادشاہ حسین ھ
مسلمانوں کی صنعت و حرفت اور تجارت } جمیل الرحمٰن عہ
عجائبات ہندوستان۔ خان احمد حسین عہ
مرقع عالم شرف الدین عہ
مختصر دنیا ولی احمد خاں ۸ر
کلید موٹر ھ
آئینہ موٹر مغنی الدین ۱۲ر
شادی اور محبت۔ مقصود فرحت ۱۲ر
انتخاب شادی راشد الخیری ۱۰ر

خانہ داری

عصمتی دسترخوان آمنہ نازلی عہ
مشرقی مغربی کھانے 〃 عہ
عصمتی ہنڈ کلیا 〃 ۱۰ر
ناشتہ 〃 ۱۲ر
صنعت وحرفت امۃ الحفیظ عہ
بچوں کے کھانے آمنہ نازلی ۱۰ر
بیماروں کے کھانے 〃 ۱۲ر
مذاقیہ کھانے 〃 ۶ر
شاہی دسترخوان۔ سہیلہ سلطانہ چمن عہ
عصمتی کشیدہ آمنہ نازلی عہ
گلدستہ کشیدہ عزیز فاطمہ عہ
گلزار درخشاں درخشاں عہ
گلشن زہرہ زہرہ برنی عہ
عصمتی کروشیا فاطمہ انور علی عہ
چمنستان خیاطی فاطمہ بیگم عہ
گلستان خیاطی عزیز فاطمہ عہ
موتیوں کا کام آمنہ نازلی ھ
سلمہ ستارے کا کام خدیجہ بائی عہ
کراس سٹیچ ورک عہ
شمیم سوزن کاری عہ
تارکشی کا کام عہ
گلدستہ تارکشی سیدہ اشرف عہ
گوٹا کناری کا کام عہ
جالی کا کام عہ
مجموعہ کشیدہ کاری عہ
روح کشیدہ عہ کڑھت کی قسمیں عہ
خواتین کی دستکاریاں ۱۰ر
مشرقی مغربی کشیدہ کاری عہ
خانہ داری کے تجربات بلقیس بیگم عہ
مفید نسواں 〃 ۱۲ر
پھول پھلواری۔ سرور جہاں عنا ۱۲ر
بچوں کی تربیت عبدالغفار ۱۲ر
وصلی کی دستکاریاں۔ سید رضا احمد ۱۰ر
لکڑی کا باریک کام ۱۰ر
زنانہ لبستہ مولانا سیماب عہ
حاملہ ڈاکٹر نصیر الدین عہ
زچہ 〃 عہ
سنگھار خانہ عہ کپڑے کی چھپائی ۱۲ر
تندرستی ہزار نعمت ہے

ملنے کا پتہ: مکتبہ علم و ادب اردو بازار دہلی



ترجمہ شاہد احمد دہلوی

عکرمۂ بن ابی جہل یا حضرت سیف اللہ خالد بن ولید وحضرت عمرو بن عاص جنگی مردانہ شجاعت اور
دانشمندانہ تدبیرون نے اسلام کی دھاک باندہ دی تمام دنیا کے سرکشون کو نیچا دکھایا اور
یہ وعدہ اگرچہ فتح مکہ مین پورا ہوا مگر پوری تکمیل اسکی حضرت عمرؓ کے زمانے مین ہوئی اور
ہمیشہ کے لیے مومنین اس قضیہ کے امیدوار کیے گئے ہین **اشارۃً** معلوم ہوا کہ اگر
چاہتے ہو کفار ذلیل وخوار ہون اور تم غالب وکامیاب ہو تو سرفروشی اور سخت کوشی
اختیار کرو ورنہ اللہ تعالے اپنا عوض قیامت مین لیگا دنیا جاے مکافات نہین یہ تمام
دارو گیر تمہارے خوش کرنے کو ہے **نکتہ** - یہ ارشاد کہ دل ٹھنڈے اور غصے فرو
کرے مشیر ہے کہ کفار پر غیظ وغضب شان اسلام سے ہے **ف** وعدے مین مضارع کے
صیغے درصورت شرط وامر واستمرار یر مشیر ہین

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا
کیا جان رکھے تم کہ چھوڑ دیے جاؤگے اور نہین جانچا اللہ نے انکو جنہون کہ جہاد کیا تم مین سے اور نہین بنایا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
سوا اللہ کے اور نہ اسکے رسول کے اور نہ مومنین کے دلی دوست اور اللہ جانتا ہے جو کروگے تم

کیا تم جانتے ہو کہ یون ہی چھوڑ دیئے جاؤگے اور کوئی باز پرس نہ ہوگی حالانکہ اللہ نے
ابھی امتحان نہین لیا اور ظاہر نہین ہوا کہ کسنے جہاد کیا اور اللہ ورسول ومومنین کے سوا اور کسی کو ہمراز
اور دلی دوست نہین بنایا اور اللہ تمھارے ہر کام سے خبردار ہے **سوال** بظاہر تین شبہے ہین
۱- عقائد کے خلاف اللہ کو علم آیندہ نہین جیسا کہ (لما یعلم) سے مفہوم ہے **۲**- اختلاف اسلیے
کہ (خبیر بما تعملون) سے احاطۂ جزو کل ثابت ہے اور (لما یعلم) سے لاعلمی **۳**- یہ کہ فعل موجود
نہوتے تو قبل وجود معلوم علم کسطرح ہوجاتا **جواب** اسکا کئی مقدمون پر موقوف ہے **مقدمۂ
اولی** جو امور بدلائل محکمہ وطریق مسلمہ مان لیے گئے ہین اُنکے خلاف دلائل سے بتاویل مجاز
اختلاف اُٹھایا جاتا ہے تاکہ ابطال قول صحیح ومعارضۂ محکم لازم نہ آئے جیسے توحید وتنزیہ وعلم
وقدرت حضرت باری تعالے وفرضیت صوم وصلوۃ وایمان وغیرہ جو بدلائل مسلمہ ثابت ہین
اب اگر کوئی امر اُنکے معارض ہو تو اسلیے کہ یہ مسلم ومحکم ہوچکے ہین اُسمین تاویل کردینگے
مقدمۂ ثانیہ علم کی دو قسمین ہین **تحقیقی** یعنے وہ انکشاف تام وحضور دائم جسکے لیے کوئی مانع وحاجب
نہوسکے اور حقیقت اشیا ہر آن حاضر ومشاہد رہے اور یہ مخصوص ذات عالم الغیب ہے کسی مخلوق کو